دوشیزہ

June
2017

Monthly DOSHEEZA Reg.No Sc-92 June 2017 SR.12 Rs.60/=

بانی
سہام مرزا

ماہنامہ **دوشیزہ** کراچی

مدیراعلیٰ .... منزہ سہام
گروپ ایڈیٹر .... ناصر رضا
ایڈورٹائزنگ منیجر .... زین شمسی
انکم ٹیکس ایڈوائزر ...... مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

خط وکتابت کا پتا
88-C II۔ فرسٹ فلور، خیابان
جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7 کراچی
فون نمبر: 021-35893121 - 35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

جون 2017
جلد:45 ☆ شمارہ:06
قیمت:60روپے

منیجر سرکولیشن: آفتاب عالم ...... رابطہ: 03343193174

باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

منی ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِسالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890روپے

ایشیا' افریقہ' یورپ......5000روپے

امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا......6000روپے

افسانے

بازگشت

دوشیزہ میگزین

ماہنامہ دوشیزہ

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرایئے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

ڈوبتی کشتی

ہمارے ایک سیاست دان فرماتے ہیں کہ نواز شریف کو اپنے اقتدار کی کشتی ڈوبتی نظر آ رہی ہے۔ مجھے اب ان لوگوں کی باتوں پر ہنسی بھی نہیں آتی سب کو اپنے اپنے اقتدار کی پڑی ہے ملک کس دوراہے پر کھڑا ہے۔ دنیا میں کیا مقام ہے کسی کو پرواہ نہیں...... آنے والے سالوں میں دنیا کی جغرافیہ میں کیا تبدیلی آنے والی ہے۔ عالمی طاقت کیا کھیل کھیلنے جا رہی ہیں۔ سب بے خبر' شوق ہے جستجو ہے تو بس اقتدار کی...... یہ تو ہوئی بات خواص کی ہم عوام بھی کچھ کم نہیں ماہ صیام کے پہلے عشرے کو عبادت کے بجائے پکوڑوں اور دہی بڑوں سے جانچتے ہیں دوسرے عشرے کو کپڑے' جوتے اور آرٹیفیشل جیولری سے اور آخری عشرے میں میں درزیوں کے چکر' نئی کراکری' کٹلری اور میز پوش اور یوں ہمارا رمضان بھی تمام...... جس دن ہم لوگوں نے زندگی کی حقیقتوں کو جان لیا' اپنے آپ کو صحیح معنوں میں پرکھ لیا اور اپنے دینی معاملات درست کر لیے۔ یقین کریں ہمارے دنیاوی معاملات بالکل ٹھیک ہو جائیں گے اور ہم سب کی ڈوبتی کشتی پار لگے گی۔

منزہ سہام

رمضان کے حوالے سے ایک پُر تاثر تحریر

ہر روزے دار کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں حاصل کرے۔ اس کا رمضان کا کوئی لمحہ غفلت میں نہ گزر جائے۔ دل کے اندر پیدا ہونے والا یہ احساس ہی تقویٰ ہے۔ یہ احساس جس قدر قوی ہوگا۔ تقویٰ کی کیفیت بھی اسی قدر بہتر ہوگی۔

نیکیوں کی دو اقسام ہوتی ہیں۔ ایک قسم خالق سے متعلق ہوتی ہے اور دوسری مخلوق سے متعلق......

خالق کی عبادت قرآن کی تلاوت' قیام الیل' ذکر کرنا وغیرہ ہے۔ مخلوق سے متعلق نیکی وہ ہوتی جس میں مخلوق کو نفع پہنچانے کے لیے سعی کی جائے۔

مثلاً غریبوں کی مالی مدد کرنا' بیماروں کی تیمارداری کرنا' لوگوں کو درس و نصیحت کرنا' محض تذکیر سے راہ ہدایت دکھانا' نیکی اور بھلائی کے کاموں میں شرکت کرنا' گھر کے ملازموں کے کاموں میں کمی کرنا یا کام کرنے میں اُن کی مدد کرنا ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا وغیرہ.....

گھروں میں مالی' چوکیدار' ماسیاں اور خانساماں کتنی ہی طرح کے ملازم ہوتے ہیں جو گھر کے مختلف کام انجام دیتے ہیں۔

گھر والوں کو آسانیاں فراہم کرتے ہیں شہروں میں تو تقریباً ہر متوسط گھر میں بھی ایک نہ ایک ملازم ہوتا ہی ہے۔

آج کے مہنگائی کے دور میں جبکہ گھر کا ہر فرد نوکری کے لیے باہر نکلنے کے لیے پر تول رہا ہوتا ہے۔ ایسے میں کتنے ہی گھر ایسے ہوتے ہیں جہاں ملازم گھر سنبھالتے ہیں۔

بعض دفعہ ملازموں کی تعداد فخر کا باعث بھی سمجھی جاتی ہے۔ کچھ گھرانوں میں ملازم نسل در نسل چلتے ہیں۔ لوگ فخریہ اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ یہ ہمارے دادا کے زمانے سے گھر میں ہے۔

نوکر کیوں رکھے جاتے ہیں؟

اس کا جواب ظاہر ہے بڑا سادہ ہے کہ ہم اپنے کام خود نہیں کر سکتے ایسی صورت اپنی مدد کے لیے انہیں رکھا جاتا ہے۔

کچھ گھروں میں کچھ مخصوص کاموں مثلاً برتن دھونے' کپڑے دھونے یا صفائی کرنے کے لیے رکھے جاتے ہیں اور کچھ میں پورے دن کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ ہمارے گھروں میں کافی وقت گزارتے ہیں۔

لہٰذا ان کو گھر کی ایک ایک بات کا پتہ ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی چیز کے نہ ملنے کی صورت میں ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کہاں رکھی ہے۔

گھر کی اندرونی باتیں بھی ان کو معلوم ہوتی ہے۔

ایسی صورت میں ضروری ہے کہ وہ دیانت دار ہونے کے ساتھ سمجھدار بھی ہوں تاکہ گھر کی باتیں دوسرے لوگوں کو بتاتے نہ پھریں۔

بعض گھرانوں میں ملازموں کی کوتاہیوں پر اُن کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔ مارنا پیٹنا یا گالی گلوچ دینا تو ایک عام سی بات ہے۔ حالانکہ یہ بات یقینی ہے کہ اگر ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے تو وہ زیادہ بہتر طریقے اور دل جمعی سے کام کرتے ہیں۔

کچھ خواتین و حضرات اس سلسلے میں اپنے برے سلوک کا دفاع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''آپ کو نہیں معلوم یہ لوگ کتنا تنگ کرتے ہیں..... ان سے کام لینا کتنا مشکل ہے کیونکہ یہ لوگ بہت ہڈحرام ہوتے ہیں۔''

یہ بات اگر کسی حد تک صحیح بھی ہو تو اس کا یہ حل نہیں ہے کہ آپ اُن کے ساتھ برا سلوک کریں اُن کی غلطیوں پر انہیں نرمی کے ساتھ سمجھایا جا سکتا ہے۔

یاد رکھیں ہر انسان عزتِ نفس رکھتا ہے۔

آپ اُس کی عزت کریں گے تو وہ بہت خوشی کے ساتھ آپ کے کام آپ کی مرضی کے مطابق کرے گا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

''یہ (غلام اور زیر دست) تمہارے بھائی ہیں اللہ نے ان کو تمہارا زیر دست (محکوم) بنا دیا ہے تو اللہ جس کے زیر دست اُس کے کسی بھائی کو کر دے تو اُس کو چاہیے کہ اس کو وہ کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہ پہنائے جو خود پہنتا ہے اور اس کو ایسے کام کا مکلّف نہ کرے جو اس کے لیے بہت بھاری ہو اور اگر ایسے کسی کام کا مکلّف کرے تو پھر اس کام میں خود اس کی مدد کرے (صحیح بخاری' مسلم)

بعض گھرانوں میں ایسا ہوتا ہے کہ خود تازہ کھانا کھایا جاتا ہے اور ملازم کو باسی کھانا دیتے ہیں یا پھر اُن کے لیے دال یا سبزی کی ایک علیحدہ ڈش بنائی جاتی ہے۔

اس سلسلے میں دل کو کشادہ رکھیں۔ جو خود کھائیں اُس میں سے کچھ نہ کچھ ملازم کو ضرور دیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کا خادم اس کے لیے کھانا تیار کرے پھر وہ اس کے پاس لے کر آئے اور اس نے اُس کے پکانے اور بنانے میں گرمی اور دھوئیں کی تکلیف اٹھائی ہے۔ تو آقا کو چاہیے کہ کھانا تیار کرنے والے خادم کو بھی کھانے میں اپنے ساتھ بٹھالے اور وہ بھی کھائے..... پس اگر کبھی وہ کھانا تھوڑا ہو (جو

دونوں کے لیے کافی نہ ہو سکے) تو آقا کو چاہیے کہ اُس کھانے میں سے دو ایک لقمے ہی اُس خادم کو دے دے۔

بعض دفعہ ملازموں کی تنخواہ کی ادائیگی میں زیادتی کی جاتی ہے اور کرنے والے کو اِس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

تنخواہ کم دینا یا وقت پر نہ دینا' مقررہ وقت سے زیادہ کام لینا۔ چھٹی کرنے پر پیسے کاٹ لینا گویا ایک عام سی بات سمجھی جاتی ہے ایسا کرتے ہوئے لوگ اپنے آپ کو قصور وار بھی نہیں سمجھتے بلکہ ملازموں کو ایسے ہی سلوک کا حق دار سمجھتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے عفوودرگزر کی تلقین کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ اپنے غلام اور خادم کی غلطیاں کس حد تک ہمیں معاف کر دینا چاہئیں۔''

''آپ ﷺ نے سکوت فرمایا (اور کوئی جواب نہ دیا) اس شخص نے دوبارہ آپ ﷺ کی خدمت میں یہ ہی عرض کیا آپ ﷺ پھر خاموش رہے اور جواب میں کچھ نہیں فرمایا۔

پھر جب تیسری دفعہ اُس نے عرض کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہر روز ستر دفعہ (سنن ابی داؤد)

خصوصیت سے رمضان کے مہینے میں اپنے ملازموں کے ساتھ شفقت کا اظہار کرنا چاہیے انہیں کام میں ہلکا رکھنا اور روزے کے دوران آسانیاں دینا لازم ہونا چاہیے تاکہ وہ بھی اس عبادت کو بہترین طریقہ سے ادا کریں۔

بعض دفعہ بہنیں ملازم رکھنے اور اُن سے کام لینے میں دشواری محسوس کرتی ہیں۔ اس کے لیے وہ چند احتیاطی تدابیر اختیار کر کے پریشانی سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔

ملازم رکھنے سے پہلے اُس کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ اُس کا شناختی کارڈ دیکھیں اور اُس کی کاپی اپنے پاس محفوظ کر لیں۔

گھر کا جو کام آپ اُس سے لینا چاہتی ہیں وہ پہلے دن اچھی طرح اُسے سمجھا دیں۔

تنخواہ صاف الفاظ میں طے کریں اور ساتھ آنے جانے کا وقت بھی متعین کر لیں۔

اگر آپ اس کے کم عمر بچے سے کام لینا نہیں چاہتیں تو یہ بات پہلے ہی اُس کو بتا دیں۔

گھر میں ملازم کی ضرورت کا سامان آپ خود دیں۔

مثلاً صابن' وم' فنائل یا پینے کا پانی فریج سے بوتل خود نکال کر دیں۔ یوں ملازم زیادہ بے تکلف نہیں ہونے پاتے۔

ملازم سے گھریلو معاملات پر گفتگو نہ کریں۔ نہ ہی ہمسائیوں کے بارے میں اُس سے کھوج کرید لگانے کا کہیں......

نہ مہمانوں کے آنے پر انہیں اپنی گفتگو میں شامل کریں۔

اگر گھر میں نوجوان بچے یا بچیاں ہیں تو ملازم یا ملازمہ رکھتے ہوئے خاص احتیاط کریں اور کام کے دوران اُن پر نظر رکھیں۔

خواتین ملازماؤں کو بڑے گلے' چھوٹی آستین اور دوپٹے کے بغیر کام کی اجازت نہ دیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے زیر دستوں پر ظلم کرنے سے محفوظ رکھے۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت
رابطوں کی دلفریب محفل

مدیراعلیٰ

میں اپنے تمام پڑھنے والوں کو ماہ صیام کی مبارکباد پیش کرتی ہوں اللہ کرے ہم تمام مسلمان اس بابرکت ماہ کے فضائل سے خوب فائدہ اٹھاسکیں (آمین) میں آپ سب کو عید کی بھی پیشگی مبارکباد دیتی ہوں میرا رب ہم پر مہربان رہے اور ہم اپنے پیاروں کے ساتھ اپنے مذہبی تہوار اور خوشیاں مناتے رہیں اللہ ہمارے پاکستان کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ انہی دعاؤں کے ساتھ اپنے پہلے خط کی طرف بڑھتے ہیں۔ کراچی سے زبردست سی گرمی کے تڑکے کے ساتھ تشریف لائی ہیں ردحیلہ خان لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ باجی! السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ موسم کی گرمی بڑھتی جارہی ہے اور اس گرمی میں کام کرنا یقیناً خاصا مشکل ہے دعا ہے کہ موسم گرما میں لوگ بخیر وخوبی اپنے اپنے کام انجام دیں' آمین۔ اب آتے ہیں آپ لوگوں کی جانب' ارے میری آپی! یہ کیا اتنی ناراضی...... وہ بھی ہم سے...... مارچ کا شمارہ نہیں ملا۔ اپریل کا شمارہ نہیں ملا' ایک بارفون بھی کیا پر کیا خوبی فون کی کہ جواب ندارد...... پہلے بھی خاصا لیٹ شمارہ ملا تھا اور ہم نے اسی مناسبت سے خط لکھ ڈالا اور دوسرے ہی دن شمارہ مل گیا تو اسے پڑھ کر خط لکھا اور مزے کی بات یہ کہ غلطی سے دونوں خطوط لفافے میں ڈال کر روانہ کردیے پر اس بار نہ دیر نہ سویر...... بہرحال ہم نے تو کہانی لکھ کر رکھی تھی کہ خالی صفحات دیکھ کرانہیں بھرنے کا دل چاہتا ہے اور قلم دیکھ کراُس کی سیاہی ختم کرنے کا من کرتا ہے اور یہ کام ہمارے کالم سے پورا نہیں ہوتا لیکن آپ نے ایسی بے رخی دکھائی کہ نہ پوچھیے۔ فروری میں کہانی چھپی اور اس کے بعد سناٹا سا چھا گیا۔ خیر جی ہم دعا گو ہیں کہ آپ کے کام میں برکت پیدا ہو آمین۔ دوشیزہ کے تمام مصنفین' ادارے اور پڑھنے والوں کو بہت دعائیں اور سلام' خدا ہم سب کی پریشانیاں دور کرے اور صحت وتندرستی کے ساتھ نیک ہدایت دے آمین۔ 'لوز' ارسال کررہی ہوں انتظار کرنے کے بعد سوچا کہ جب آپ کے شمارے کے لیے لکھا ہے تو پھر مزید انتظار کیسا...... امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

ہے: میری پیاری ردحیلہ! یہ تو الزام ہے مجھ پر بے رخی اور تم سے' اب ایسے تو حالات نہیں......

افسانہ مل گیا پڑھ لیا اور شائع بھی کر دیا بالکل ایسے ہی جیسے وہ آیا' اس نے دیکھا اور فتح کر لیا' اب تو شکایت دور' جلدی جلدی ناولٹ لکھ ڈالو اور بھیج دو' میں انتظار کر رہی ہوں۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں خولہ عرفان لکھتی ہیں۔ مبارک ساعتوں میں نیک خواہشات اور دعاؤں کے ساتھ حاضرِ محفل ہوں۔ سب سے پہلے ساری امت مسلمہ کو عموماً اور اہل وطن کو خصوصاً رمضان کے بابرکت مہینے کی بہت بہت...... مبارک باد قبول ہو...... جس وقت یہ خط دوشیزہ کے ساتھ ہمسفری کا آغاز کرے گا اس وقت روزے عروج پر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مبارک مہینے کی تمام فیوض و برکات سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ نصف مئی گزار کر دوشیزہ نے آخر اپنا رخ روشن دکھا ہی دیا۔ اعزاز یہ ارسال کرنے کا بہت بہت...... شکریہ منزہ...... اپنا افسانہ دیکھ کر ڈھیروں خون بڑھ گیا لیکن محفل میں آپ کا جواب پڑھ کر اس سے کہیں زیادہ خون خشک ہو گیا کہ آپ کے پاس میرا صرف یہی ایک افسانہ تھا۔ کیونکہ اپریل میں پچھلے خط کی اشاعت سے سے قبل ہم نے ایک صحت مندی تحریر بذریعہ رجسٹری آپ کو روانہ کی تھی جس کی سلپ ابھی بھی ہمارے پرس میں ڈاکخانے کے نظام پر ہمارا منہ چڑا رہی ہے کاش آپ فون کر کے مجھے یہ خوش خبری سنوا دیں کہ وہ رجسٹری آپ کو مل گئی ہے کا...... ش...... یقین جانیں منزہ نکمے پن کی ساری صلاحیتیں بروئے کار لا کر وہ تحریر اتنی قسطوں میں لکھی تھی کہ اسٹار پلس کے ڈرامے اپنی قسطوں پر شرمندہ ہو جاتے لیکن اس بات کا بھی خدا گواہ ہے کہ اس کو فیئر کر کے لکھتے وقت اتنی ہی برق رفتاری کا ثبوت دیا تھا کہ خواب میں خود کو لکھتا ہوا ہی دیکھتی تھی تاکہ آپ تک نئی تحریر پہنچ جائے۔ بہرحال آپ سے مودبانہ گزارش ہے کہ اگر وہ رجسٹری وصول پا گئی ہو یا نہ وصول ہوئی ہو تو کنفرمیشن کے لیے ایک کال کروا دیجیے گا۔ تاکہ دوبارہ تحریر کر کے ارسال کر دوں کیونکہ رمضانوں میں تو بالکل وقت نہیں مل سکے گا۔ پلیز...... زندگی میں کوئی نہ کوئی آٹھ آٹھ آنسو رلانے کے لیے موجود ہوتا ہے مجھے لگتا ہے ڈاکخانے کا نظام ہماری زندگی میں وہی کردار ادا کر رہا ہے۔ خیر غصہ برطرف دوشیزہ کے تبصرہ کی طرف آتی ہوں۔ اس ماہ کا دوشیزہ سابقہ مہینے کا تصویر بولتا ٹائٹل پیج ثابت ہوا۔ اس ٹائٹل پیج کے دھوکے میں میاں جی خوشی خوشی پچھلے مہینے کا دوشیزہ لے آئے لیکن ہمارے خوشی سے دمکتے متوقع چہرے کو دیکھنے والی ان کی خوبصورت آنکھوں کو ہم نے محروم نہیں کیا اور محبت سے مہینے پر انگلی رکھ لی۔ شکر ہے اگلے دن ہی آپ کی طرف سے یہ تحفہ بھی مل گیا اور ہماری عزت اور میاں جی کی محبت کا مان رہ گیا۔ اداکارہ انجمن اور شہروز سبزواری سے ملاقات قدیم و جدید اداکاری کی ہم آہنگی اور تضاد کا حسین امتزاج لگا۔ اسماء اعوان لائف یوں لائف بوائے کہانی میں ہمیشہ کی طرح نمایاں رہیں۔ دامِ دل میں ربیعہ کی انٹری نے کہانی میں دلچسپی پیدا کر دی ہے اب کہانی کا انجام واضح نظر آ رہا ہے۔ زمر نعیم بھی عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اصم کی واپسی نے کہانی میں نئے سرے سے جان ڈال دی ہے۔ نگہت غفار کا ایسا بھی...... عورت کی دھوپ چھاؤں سی زندگی کی عکاسی کرتا تحریر کی خوبصورتی سے مزین بہت پیارا ناولٹ تھا۔ راحت وفا راجپوت کا انا کی...... میں محبتوں کے منفرد رنگ نظر آئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم اپنی انا اور دل کو ایک ساتھ خوش بمشکل ہی کر سکتے

ہیں کہیں ظرف چاہیے ہوتا ہے کہیں قربانی...... آداب ہیں رسم...... دیا آفرین کا فرح انیس کا پیکیج، میزان زندگی زہرا کا اور شیما عبدالقیوم کا چھبن متنوع گھریلو مسائل پر مبنی متنوع موضوعات اور خوبصورت اندازِ تحریر کے ساتھ بہت پیاری تحریریں لگیں۔ البتہ نبیلہ نازش راؤ کا پاگل دل افسانوی اعتبار سے نسوانی احساسات کی ترجمانی کرتا بہت عمدہ تحریر ثابت ہوا۔ جائز رشتوں سے جب احساسات و جذبات کی تشفی نہ ہو اور پھر دین کا علم بھی نہ ہو تو معاشرہ اس طرح کے ناجائز رشتوں کے عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا ذمہ دار جہاں مرد اپنے ازدواجی حقوق کی عدم ادائیگی کے سبب بنتا ہے وہیں عورت کے لیے بھی اپنی اور اپنے شوہر کی عزت وقتی جذبات کے ہاتھوں فروخت کر دینے کی سزا مقرر ہے اگر نبیلہ اس سے ہونے والے معاشرتی و مذہبی بگاڑ کا ذرا سا اثر دکھا دیتیں تو افسانے میں مزید چار چاند لگ جاتے۔ مگر پھر کہوں گی جذبات نگاری اور اندازِ بیاں کمال ہے۔ دوشیزہ گلستان ہمیشہ کی طرح مہکتا ملا۔ جس میں سب حد سے خوشگوار اور مہکتا آپ کا فکاہیہ اقتباس تھا جو وزیراعظم کے چور ہونے کی قلم بند دلیل تھا۔ سنئے لیجئے نئی آوازیں میں فرح کی نظم لاجواب تھی باقی کلام بھی بہت عمدہ تھے۔ اپنی کیا تعریف کروں، ہم تو ہیں ہی وکھری ٹائپ...... ہاہاہاہا...... منزہ جی ابھی حنا اصغر کا شہ مات اور ریحانہ آفتاب کا آنکھ سے نکلا تو...... زیرِ مطالعہ نہیں آسکا ہے۔ مصنفین نے یقیناً اچھا تحریر کیا ہوگا۔ خط پوسٹ ہو جائے پھر پڑھوں گی آپ کے اداریے میں ادا کیے گئے شکریہ پر میں تہہ دل سے ممنون ہوں کہ درحقیقت یہ آپ کا دیا ہوا محبت اور مان ہے جو ہماری تحریروں اور خطوط سے جھلکتا ہے۔ ایک غزل کے ساتھ اجازت چاہوں گی منزہ اور وابستگان دوشیزہ کی طویل العمری اور صحت و کامرانی کے لیے دعا گو۔

☆: سوئٹ خولہ! میں اپنی غلطی قبول کرتی ہوں تمہارا افسانہ میرے پاس موجود تھا اور میں نے لکھ دیا کہ اب کوئی نہیں چلو خوش ہو جاؤ اور اس خوشی میں ایک اور زبردست سا افسانہ لکھ ڈالو تمہاری تعریف اور توصیف قلم کاروں تک پہنچا دی ہے۔

✕: لاہور سے تشریف لائی ہیں نسرین اختر نینا، لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ! کیسی ہیں اُس دن فون پر آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ آپ اتنے خلوص اور اپنائیت سے بات کرتی ہیں کہ دل چاہتا ہے روز روز آپ سے بات کی جائے جو کہ ظاہر ہے اس مصروف دور میں ناممکن ہے۔ اور سب کیسے ہیں؟ آپ کو آنٹی جی اور سب اسٹاف اور دوشیزہ کے ساتھیوں کو میری طرف سے پیشگی رمضان المبارک اور عید الفطر کی مبارکباد دیجیے گا۔ اللہ کرے کہ یہ عید اور ماہ رمضان ہمارے ملک تمام مسلم امہ اور ہم سب کے لیے رحمت و برکتوں کا باعث ہو اور ہمارے تمام مسائل اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے حل فرما دیں۔ آمین ثم آمین۔ آپ کے کہنے کے مطابق میں عید کی مناسبت سے افسانہ بھیج رہی ہوں۔ یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ مئی کا دوشیزہ ابھی کل ہی ملا ہے۔ اصل میں ہمارا پوسٹ مین ایک دو مرتبہ بیل کرتا ہے اور اگر کوئی گیٹ نہ کھولے تو واپس چلا جاتا ہے اس لیے شاید بروقت رسالہ نہیں ملا۔ رسالہ ابھی پڑھ نہیں سکی اس لیے تبصرے سے معذرت، منزہ کوشش کیجیے کہ میرا ناول جلدی پڑھ کر کسی قریبی اشاعت میں

سانحہ ارتحال

پاکستان ٹیلی ویژن کا نمایاں نام، علی رضوی رضائے الٰہی سے گزشتہ ماہ زمین کا رزق ہوئے۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے اہلِ خانہ کے ساتھ ہے۔ مرحوم کے درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے اور اہلِ خانہ کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

اسے لگانا شروع کر دیں۔ شکریہ۔

✍ : اچھی نسرین! آپ کی محبتوں کا بہت بہت شکریہ' آپ کی تحریر میرے پاس موجود ہے کوشش کروں گی کہ جلد از جلد پڑھ کر اس کو شائع کروں مجھے ذاتی طور پر قلم کاروں کو بہت انتظار کروانا اچھا نہیں لگتا اگلے ماہ میں آپ کا تبصرہ کے ساتھ انتظار کروں گی۔

✂ : کراچی سے تشریف لائی ہیں فرحی نعیم' لکھتی ہیں۔ محترمہ مدیرہ صاحبہ' السلام علیکم! امید ہے بخیریت ہوں گی۔ اپریل کا شمارہ مجھے ملا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے افسانے کو اپنے پرچے میں جگہ دی۔ افسانوں کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ عید نمبر کے لیے بھیجے گئے افسانے کی آپ نے جس طرح حوصلہ افزائی کی۔ اس نے مجھے مزید آگے بڑھنے کے لیے مہمیز دی۔ ایک اور کہانی آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ پڑھ کر ضرور بتائیے گا۔ بہت سی دعائیں آپ' آپ کے اسٹاف اور ہمارے دوشیزہ کے لیے۔

✍ : پیاری سی فرحی! اسی طرح محنت سے لکھتی رہو تمہاری تحریر اور چمک جائے گی مگر میں ایک بات ضرور کہوں گی کہ افسانے کو تھوڑی طوالت دو بہت مختصر تحریر شائع کرنا بعض اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کردار اور واقعات کو اگر واضح کیا جائے تو پڑھنے والوں کو ایسی تحریر اپنے حصار میں لے لیتی ہے تو ذرا اپنے قلم کو کھل کر لکھنے کا موقع دو اگلے ماہ تبصرے کے ساتھ محفل میں شرکت کرنا۔

✂ : یہ خط آیا ہے شیخوپورہ سے' رانا زاہد حسین لکھتے ہیں۔ دوشیزہ کا مئی کا شمارہ آدھا مئی گزر جانے کے بعد ملا۔ نبیلہ نازش راؤ کا افسانہ پاگل دل کافی بولڈ تھا۔ اس میں مجھے عصمت چغتائی اور منٹو کا اندازِ تحریر نظر آیا چبھن دل میں ایک چبھن چھوڑ گیا ابھی مختصر ہی دو کہانیاں پڑھی ہیں کیونکہ شمارہ ہی دیر سے ملا۔ دوشیزہ کے لیے دو افسانے ڈسٹ بن اور عید شاپنگ بھیج رہا ہوں عید شاپنگ ایک ہلکی پھلکی تحریر ہے جو امید ہے قارئین دوشیزہ کی عید کی خوشیاں دوبالا کرے گی ایک مزاحیہ ناول بھی لکھ رہا ہوں اگر آپ کہیں آپ کو بھیج دوں؟ عید شاپنگ عید کے شمارے میں ہی لگ جائے تو بہتر ہوگا۔

✍ : بھائی رانا زاہد! دوشیزہ کی محفل میں خوش آمدید آپ کی تحریر مجھے مل گئی ہے پڑھ کر بتاؤں گی کہ کیسی لگی بالکل اگر ناول لکھ لیا ہے تو ارسال کر دیجیے۔ دوشیزہ آپ کو اتنی تاخیر سے کیوں ملا اپنے ہاکر سے ضرور معلوم کیجیے گا امید کرتی ہوں کہ اگلے ماہ آپ بھرپور تبصرے کے ساتھ محفل میں شامل ہوں گے۔

✂ : یہ خط ہے کرن نعمان کا لکھتی ہیں۔ میرا نام کرن نعمان ہے آپ کی بزم میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں اپنی ایک کہانی کے ساتھ...... میں بالکل تو آموز تو نہیں ہوں پر لکھنے کے میدان میں اپنی

حیثیت طفلِ مکتب سمجھتی ہوں۔ دعا گو ہوں کہ آپ کو میری یہ کوشش پسند آئے تو پھر انشاء اللہ مزید تحاریر بھیجنے کی ہمت کروں گی۔ آپ کے تعاون کے لیے پُر امید ہوں خدا آپ کو اور آپ کے ادارے کو ترقی عطا فرمائے آمین۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔ خدا حافظ۔

ڈیئر کرن! میں آپ کو دوشیزہ کی محفل میں خوش آمدید کہتی ہوں آپ کی تحریر میرے پاس موجود ہے جلد ہی پڑھ کر آگاہ کروں گی۔ میرا تعاون ہمیشہ آپ کے ساتھ ہے۔

ڈسکہ سے یہ برقی خط بھیجا ہے نسیم سکینہ صدف لکھتی ہیں۔ سلام منزہ جی! خدا کرے آپ ٹھیک ہوں مئی کا دوشیزہ تو کمال ہے اس میں میری دو سہیلیوں راحت وفا اور نبیلہ نازش کے خوبصورت افسانے موجود تھے۔ منزہ جی نے آم کا ذکر کر کے دہکتی آگ کو چھیڑ دیا مجھے بھی یہ اتنے پسند ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ پورا سال آم رہے۔

ڈیئر سکینہ! دوشیزہ کی پسندیدگی کا بہت شکریہ مگر یہ تو ناانصافی ہے صرف اپنی دوستوں کے افسانے پڑھے اور باقی افسانے؟ چلیں اگلے ماہ سہی میں انتظار کروں گی بھرپور تبصرے کا......

یہ خط آیا ہے ملتان سے اور لکھتی ہیں مریم شیراز...... دوشیزہ کا شمارہ خاصا لیٹ ملا۔ اس کے مستقل سلسلے ہر بار لاجواب ہوتے ہیں۔ منی ناول اچھا جا رہا ہے۔ حتمی رائے مکمل ناول پڑھنے کے بعد دی جا سکتی ہے۔ بہرحال تحسین انجم انصاری کی اچھی کاوش ہے۔ رفعت سراج اور زمر نعیم کے ناول بھی اچھے ہیں۔ افسانوں میں 'پاگل دل' پسند آیا میڈم مجھے مئی کے شمارے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ کیونکہ میں اپنے ناول کے متعلق قارئین کی رائے پسند و ناپسند جاننا چاہتی تھی۔ دوشیزہ کی محفل بلاشبہ محبتوں کا طلسم کدہ اور خوبصورت رابطوں کی دلفریب محفل ہے مگر اس محفل میں میرے متعلق کسی نے بھی کوئی رائے نہیں دی۔ میڈم نئے رائٹر کے لیے تنقید و تعریف آکسیجن کا کام کرتی ہے چلیں کسی نے تعریف نہیں کی تو کوئی تنقید ہی کر دیتا۔ تاکہ میں اپنی خامیوں کی نشاندہی کر کے مزید بہتر لکھتی۔ تمام خطوط میں افسانوں پر رائے دی گئی تھی۔ دام دل کے لیے تو الفاظ ہی نہیں ہیں میرے پاس.... رفعت سراج جیسا بڑا رائٹر تعریف کا محتاج نہیں ہے۔ میڈم مجھے آگاہ ضرور کیجیے گا کہ میں کیسی رائٹر ہوں۔ کیا مجھ میں مزید تحاریر لکھنے کی صلاحیت ہے میں آپ کی حوصلہ افزائی پر شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اور آپ کی بتائی تاریخ سے پہلے 'عید نمبر' کے لیے مختصر افسانہ ارسال کر رہی ہوں۔ میڈم آپ سے بات کرنا ہو تو کس نمبر پر فون کیا جائے۔ میں نے آفس دو بارہ فون کیا مگر دونوں بار آپ سے بات نہ ہو سکی تھی۔ آخر میں تمام اسٹاف اور خصوصاً آپ کو پیشگی عید مبارک۔

اچھی سی مریم! شمارہ پسند کرنے کا شکریہ تم مجھ سے آفس کے نمبر پر ہی بات کر سکتی ہو۔ تمہاری تحریر مجھے مل گئی ہے ابھی پڑھی نہیں...... تمہاری تحریر کیسی تھی یہ تو تمہیں محفل پڑھ کر اندازہ ہو جائے گا۔ اگر میری رائے چاہتی ہو تو تم دوشیزہ میں موجود ہو یعنی مجھے تحریر اچھی لگی اب پڑھنے والے کیا رائے رکھتے ہیں وہ تمہیں خطوط سے اندازہ ہو گا۔ اور میری جانب سے بھی عید کی پیشگی مبارک باد...... امید ہے اگلے ماہ مکمل تبصرے کے ساتھ شرکت کرو گی۔

✉: ژوب سے تشریف لائے ہیں عمران مظہر لکھتے ہیں۔سب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ عرض ہے کہ رسالہ ابھی تک نہیں ملا ہے۔آج 15 تاریخ ہے۔ مجھے کچھ دن کے لیے آؤٹ آف سٹی جانا ہے۔ایک تحریر لکھ رکھی تھی۔سوچا بھجوادوں ہزار بار سوچا...... وجہ یہ کہ تحریر شاید ضرورت سے زیادہ لمبی ہوگئی ہے۔نہیں معلوم کہ میل لکھاری اتنے صفحات کے قابل ہیں یا نہیں؟ نہ ہی معلوم ہے کہ آپ کے رسالے کے معیار کے مطابق ہے یا نہیں؟ پر ایک بار وقت نکال کر پڑھ لیجیے گا۔معیار کے قابل ہوئی تو میری خوش قسمتی ہوگی۔نہ ہوئی تو آپی تحریر مجھے واپس بھجوا دیجیے گا۔ڈاک خرچ میں ادا کردوں گا۔لکھنے والا جیسا بھی لکھے اُسے اپنی تحریر عزیز ہوتی ہے۔ میں نے اس کی فوٹو کاپی نہیں کروائی۔بس امید ہے......اور امید پر دنیا ٹکی ہے۔یہ تحریر میری بے بی ہے کیونکہ پہلی بار کچھ زیادہ سا لکھا ہے۔آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔رسالے ملا ہوتا تو کچھ نہ کچھ تبصرہ ضرور کردیتا۔بہرحال اب یہ خط رسالے کے لیے رہا نہیں۔ کچھ غلط لکھ گیا ہوں تو معذرت چاہتا ہوں کہ بڑے چھوٹوں کو معاف کردیا کرتے ہیں۔سب کے لیے سلام دعائیں' آپی' کچھ واقعات سوالوں کے جواب میں نے تحریر میں دانستہ ادھورے چھوڑے ہیں۔

✍: عمران بھائی آپ کی تحریر مل گئی ہے۔جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی۔مگر یہ کیا آپ نے شمارے پر تو کوئی تبصرہ ہی نہیں کیا۔

✉: محفل اپنے اختتام کو پہنچ ہی گئی تھی کہ اچانک سے ہماری پیاری اقبال بانو کی خوبصورت تحریر سے مزین برقی نامہ موصول ہوا بھلا یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ اقبال بانو محفل میں شریک ہوں اور ہم انہیں انتظار کروائیں۔ وہاڑی سے بانو لکھتی ہیں۔ بہت ہی پیاری منزہ! السلام علیکم! جیتی رہیں خوش رہیں۔ماہِ مئی کا شمارہ میرے سامنے ہے۔دوشیزہ جب بھی میرے ہاتھ میں آتی ہے میں اپنے کالج کے دور میں پہنچ جاتی ہوں۔ جب میں نے دوشیزہ میں لکھنا شروع کیا تھا اور اُس وقت دوشیزہ میں لکھنا بہت 'بہادری' ہوتی تھی۔ بڑے بڑے ناموں میں اپنا نام دیکھ کر دنوں مسرور رہا کرتی تھی۔اور اب بھی ایسا ہی ہے۔دوشیزہ سامنے آجائے تو فوراً پڑھے بغیر نہیں رہ پاتی۔منزہ پیاری 'آپ کے اداریے سے ابتداء ہوتی ہے میں نے شاید پہلے بھی لکھا تھا کہ آپ کا انداز محترم سہام مرزا سے ملتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی مجھے مرزا صاحب جیسا ہی لگتا ہے۔ویسی ہی نفاست اور وہی ٹھاٹھ جو دل میں اتر جائے اور اگلا جملہ 'مرہم' بن جاتا ہے۔

آپ نے دوشیزہ پڑھنے والوں کا شکریہ ادا کیا ہے اور جانم ہم لکھنے والے بھی تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ ہمارے ٹوٹے پھوٹے جملوں کو'لفظوں کو دوشیزہ کے اوراق پر سجاتی ہیں۔ ہم بھی آپ سے جڑے ہوئے ہیں اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آپ کا 'رخسانہ جی کی محبت کا انتہائی خلوص سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔لکھاری بھی آپ کے مقروض ہیں اور برسوں بلکہ صدیوں مقروض رہیں گے۔دوشیزہ کی محفل پڑھی، محفل پڑھ کر ہمیشہ ہی مزہ آتا ہے اور ہمیشہ خود کو ڈانٹتی ہوں 'ارے اقبال بانو افسانہ نہیں لکھتیں کم از کم محفل میں ہی شریک ہو جایا کرو۔منزہ پیاری بھی خوش ہو جایا کریں

گی' خطوط پڑھتے ہوئے صفحہ پلٹا تو اپریل 2017ء کے ایوارڈ کا اعلان جگمگا رہا ہے۔ یقین کریں خوشی سے چیخ ہی نکل گئی۔ بہت عرصے بعد اس قدر خوش ہوئی کہ جیسے جوانی میں گول گول گھومتی تھی۔ (ناچ تو سکتی نہیں ہوں نا، نہ جوانی میں نہ اب) اُسی طرح ہاتھ پھیلا کر گول گول گھومی اور پھر بیٹھ کر رو دی۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ بہت شکریہ دوشیزہ اور بے حد شکریہ میرے قارئین...... دوشیزہ میں جب لکھنا شروع کیا تھا تب بھی 4 ایوارڈز لیے تھے اور کافی عرصہ نہ لکھا پھر لکھنے لگی ہوں تو ہیٹرک مکمل کر لی۔

I Am Proud Of You Dosheeza۔ زمر نعیم کا ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔

بہت خوبصورت کہانی ہے اور مزے کے جملے ہیں۔ رفعت کا ناول بھی پسند آ رہا ہے۔ تحسین انجم انصاری کا منی ناول میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ نگہت غفار اور ریحانہ آفتاب کے ناولٹ پسند آئے۔ گل کی تحریر پڑھ کر گل بہت یاد آئیں۔ اور میں نے اپنے ڈرامے کے ایک کردار کا نام 'گل' رکھ دیا۔ افسانے سب ہی پسند آئے۔

راحت وفا' خولہ عرفان اور زینب اصغر کے افسانے پڑھے ہیں۔ شیما کی چبھن دل کو جا لگی۔ انجمن کا انٹرویو جو گڑھا گیا ہے شاید...... مجھے اچھا لگا کہ انجمن میری پسندیدہ فنکارہ ہے۔ شیروز سبزواری کا انٹرویو پسند آیا۔ یہ لڑکا بھی باپ کی طرح کبھی بوڑھا نہیں ہوگا۔ ایورگرین...... ہے نا؟ ماشاء اللہ کچن کارنر بھی چٹ پٹا ہے۔ کاش کوئی یہ ڈیشز پکا کر کھلائے۔ منزہ بیٹا! آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگتا ہے۔ اللہ خوش رکھے دوشیزہ کے اسٹاف کو' رائٹرز اور قارئین کو میرا دلی سلام ...... ہمیشہ خوش رہیں آباد رہیں۔ محبتوں کے ساتھ......

ہمیں: پیاری اقبال بانو جی! آپ کو اپنے درمیان پا کر بہت اچھا لگا۔ آپ ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کے ساتھ ماضی کی خوشگوار یادیں جڑی ہوئی ہیں۔ وہ بچپن کے دن جب کوئی فکر کوئی پریشانی نہیں ہوتی...... دھوپ کی شدت ہاتھ باندھے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ آس پاس محبت والے رشتے ہوتے ہیں...... پھر ہم اچانک بڑے ہو جاتے ہیں اور تنہا رہ جاتے ہیں۔ خیر یہ سب زندگی کا حصہ ہے دوشیزہ آپ کا اپنا ہے۔ لہٰذا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بس اپنی شرکت یقینی بنایا کریں۔

محفل کے اختتام سے پہلے میں ان تمام خواتین و حضرات سے جو بذریعہ ای میل اپنی تحریر یا خط بھیجتے ہیں درخواست کروں گی کہ ان پیج کا استعمال کیا کریں۔ ٹائپ کی گئی تحریر پڑھنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے اور اس لیے بہت سے خطوط اور تحاریر چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔

اب مجھے اجازت دیجیے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر اس رنگا رنگ محفل میں آپ سے ملاقات ہوگی۔ خوش رہیے اور خوش رکھیے۔ اللہ حافظ۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

ایک شام

خواتین کی ادبی تنظیم حریم ادب کے تحت مدیرہ 'دوشیزہ' منزہ سہام مرزا کے ساتھ ایک شام

فرح نعیم

یہ ذکر ہے اس گرم مہینے کی سنہری شام کا جس کی مہمان کا انتخاب بڑی خاص شخصیت کو کیا گیا تھا۔ اور جس کے حاضرین بھی بڑے چیدہ چیدہ ادبی شخصیات تھیں۔ محترمہ حمیرا سلمان کے کشادہ ڈرائنگ روم میں اس مذاکرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

ملک کے معروف اور کثیر الاشاعت ڈائجسٹ تو اس وقت کئی ہیں لیکن دوشیزہ ڈائجسٹ ان میں اپنا الگ اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ معاشرتی' اصلاحی اور بامقصد کہانیاں اس کی ایک علیحدہ شناخت رکھتی ہیں۔

اور اس مذاکرے میں دوشیزہ ڈائجسٹ کی مدیرہ محترمہ منزہ سہام کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں صدر حریم ادب اور معروف قلم کار محترمہ عقیلہ اظہر صاحبہ' جنرل سیکریٹری اور کالم نگار محترمہ غزالہ عزیز' قلمکار حمیرا خالد' کراچی نشر و اشاعت کی نگراں ثمرین اور سوشل میڈیا کی نگراں شبانہ نعیم آل یوتھ کی پریذیڈنٹ محترمہ کوثر مسعود شاعرہ اور قلمکار ڈاکٹر عزیزہ انجم' قلمکار ہاجرہ ریحان' طوبیٰ احسن' عافیہ رحمت اور شاعرہ طاہرہ سلیم کے علاوہ راقمہ کو بھی اس خوبصورت محفل میں شرکت کا موقع ملا۔

تلاوت کے بعد حاضرین محفل کا مختصر تعارف ہوا اور اس کے بعد گفتگو کا آغاز ہوا۔ آج کی نسل اردو اور اردو ادب سے دور ہوتی جارہی ہے۔ اس عنوان سے ابتداء کرتے ہوئے محترمہ منزہ نے اپنے دھیمے اور نرم لہجے میں کہا کہ ہمیں اس کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے' رسائل و اخبارات پڑھنے کا رجحان کم ہوتا جارہا ہے۔

نئی نسل نے پڑھنا تو چھوڑا ہی ہے سوچنا بھی چھوڑ دیا ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی اقدار سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ انٹرنیٹ ہی ہمارا بزرگ اور ڈاکٹر بن گیا ہے۔

لیکن اس وقت بھی لاہور' ملتان اور

بورے والا میں لکھنے پڑھنے کا رجحان نظر آرہا ہے۔ جس پر ڈاکٹر عزیزہ نے اس توجیح پیش کرتے ہوئے کہا کہ ابھی دیہی معاشرہ ہماری روایت سے قریب ہے۔

جبکہ ہم کو سنجیدگی سے اس کے متعلق سوچنا چاہیے۔ تاکہ اردو زبان ختم نہ ہو۔ یہاں محترمہ حمیرا خالد نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ چونکہ والدین بھی اب انگریزی میں بات کرتے ہیں لہٰذا بچے اردو سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ اب تو اردو کے لیے شعوری کوشش کرنی پڑتی ہے۔

ہم نے ہی اپنی زبان کی حفاظت کرنی ہے اگر ہم اردو سے کٹ گئے تو اپنی اقدار سے کٹ جائیں گے آج کا بچہ خود کہانی بھی پڑھنا نہیں چاہتا۔

ہمیں اس نقصان کا ازالہ کرنا ہے۔ انہوں نے محترمہ منزہ صاحبہ سے تحریر کو موثر اور خوبصورت بنانے کا گر جاننا چاہا تاکہ تحریریں اشاعت کے مرحلے سے گزر سکیں۔ منزہ صاحبہ نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر تحریر میں پیغام ہوگا اور مرکزی خیال اچھا ہو تو الفاظ اور جملوں کی کمی بیشی کو ہم ٹھیک کردیتے ہیں۔

میری ذاتی کوشش یہ ہوتی ہے کہ میں کوئی نامناسب بات نہ شائع کروں کیونکہ پھر ہم اپنا چہرہ کیسے آئینے میں دیکھیں گے۔ آج کل رشتوں کے تقدس کو بہت پامال کیا جارہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جن قلمکاروں کا پس منظر مضبوط ہوتا ہے وہ ہی اچھا لکھتے ہیں انہیں اپنی اقدار پر فخر ہوتا ہے۔ یہاں انہوں نے اپنے بچپن کی قیمتی یادوں کو دہرایا جب وہ اپنے والدین کے ساتھ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر سے ملی تھیں۔

جنرل سیکریٹری حریم ادب محترمہ غزالہ عزیز نے منزہ صاحبہ کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ایسا لگتا ہے کہ منزہ ہم میں سے ہی ہیں۔

پچھلے 20 سے 25 سالوں میں بہت تغیر آیا ہے ہمیں اردو کو اس کا درست مقام دینا ہے۔ اگر اردو ہمارے دفاتر، تعلیمی اور عدلیہ کی زبان بن جائے تو اس کی اہمیت بڑھے گی۔ اس سلسلے میں انہوں نے شرکاء سے تجاویز بھی مانگیں۔

محترمہ کوثر مسعود نے اس سلسلے میں سب سے پہلے اظہار خیال کیا کہ طبقاتی فرق نے اردو کو پیچھے کیا۔

ہمارے بچے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اردو بولیں گے تو ہمارا مذاق اڑایا جائے گا۔ انہیں پسماندہ سمجھا جائے گا۔ ایک وجہ مادیت پرستی بھی ہے چہار طرف سے اردو اور اسلامیات پر وار ہو رہے ہیں۔

اگر آج کی عورت یہ سمجھ لے کہ ہماری زبان ہی آگے بڑھنے کا ذریعہ ہے تو وہ اردو سے پیار کرے گی۔ کوئی قوم اپنی زبان کا مسکچر نہیں بناتی لیکن ہم نے اردو کا مکسچر بنادیا ہے۔ ہر جملے میں انگریزی الفاظ ٹانک دیتے ہیں۔

اب تو ہمارے علماء بھی تقریر کرتے ہوئے انگریزی بولتے ہیں تاکہ انہیں پڑھا لکھا سمجھا جائے۔ رومن اردو نے ہماری زبان پر بڑی ضرب لگائی ہے۔ ہماری زبان پر ہم اپنے اخلاقی اثرات مرتب کرتی ہے۔

عقیلہ اظہر نے کہا کہ ہمیں اپنی زبان کو

لکھنے اور بولنے میں استعمال کرنا چاہیے ہم تو خود انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ ہم لان کو باغ' کچن کو باورچی خانہ اور ڈرائنگ روم کو بیٹھک کیوں نہیں کہتے۔

حمیرا خالد ان کی تائید کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔ اگر ہم اسی طرح انگریزی کے الفاظ کا سہارا لیتے رہیں گے تو کہیں ہمارے اپنے الفاظ ہی متروک نہ ہو جائیں۔

منزہ سہام نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ مغربی طاقتیں لمبی منصوبہ بندی کرتی ہیں۔ انہوں نے ہمیں زبان سے ہی دور نہیں کیا بلکہ مذہب سے بھی دور کر دیا۔

وہ ہمیں مذہب سے براہ راست دور نہیں کر سکتے تھے لہٰذا پہلے انہوں نے ہمیں ہماری ثقافت سے دور کیا پھر مذہب کو ہدف بنایا۔ دوپٹہ اوڑھے' سر ڈھکی خاتون کو مڈل کلاس اور غیر تعلیم یافتہ سمجھا جاتا ہے۔

حمیرا خالد نے اُن کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ الفاظ کے اثرات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ ترکی میں سب سے پہلے زبان کو ہدف بنا کر اُسے تبدیل کیا گیا۔ انگریز کا ایجنڈا یہ ہی تھا آزاد ہونے کا باوجود ہم آج تک ان کے ذہنی غلام ہیں۔

عزیزہ انجم نے تجویز پیش کی کہ لکھنے والوں کی طرح ہیں پڑھنے والوں کا بھی فورم بنانا چاہیے۔ اس موقع پر عافیہ رحمت جن کی کہانیاں دوشیزہ کی زینت بنتی رہیں نے اپنے بچپن کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے گھر میں ہفتہ اردو منایا جاتا تھا۔

بیت بازی' محاورات' کہانیاں سناتے یہیں سے ہماری اردو میں بہتری آئی۔

منزہ سہام نے ایک بہت اہم نکتے کی طرف نشاندہی کی کہ آج آپ اسکولوں میں اردو کی درسی کتاب اُٹھا کر دیکھیں تو ان کا معیار بہت کم ہے۔

اس کا کاغذ سستا ہے۔ جبکہ بچے کی فطرت ہے کہ وہ خوبصورت چیزوں کی طرف لپکتا ہے۔ انگریزی کی کتاب بہت قیمتی ہوتی ہے اس کا کاغذ' چھپائی سب بہت اعلیٰ ہوتی ہے اگر کاغذ اچھا ہوگا کتاب معیاری چھپی ہوگی تو پڑھنے کا بھی دل چاہے گا۔

یہاں غزالہ عزیز نے ایک تجویز دی کہ ہمارے ہاں جو دروس ہوتے ہی اُن کے آخر میں اگر ایک معیاری افسانہ یا کہانی بھی سنائی جائے تو آنے والوں کی دلچسپی ادب سے بڑھے۔ حمیرا خالد نے کہا کہ حریم ادب کے لیے بھی ہفتہ اردو منایا جائے۔ یہاں عزیزہ انجم نے بڑا خوبصورت شعر پڑھا۔

روشنی کی رکھی تھیں قندیلیں
گھر کر ہر طاق میں کتابیں تھیں

عقیلہ اظہر نے لکھنے والوں پر بھی زور دیا کہ انہیں بھی اپنی اردو درست رکھنی چاہیے۔ جس پر غزالہ عزیز نے لغت رکھنے پر زور دیا۔

باتیں تو ابھی بہت سی تھیں لیکن گھڑی کی بڑھتی سوئیوں نے تیزی سے گزرتے وقت کا احساس دلایا اور یوں دعا کے ساتھ محفل برخاست ہوئی آخر میں محترمہ غزالہ صاحبہ نے مدیرہ منزہ سہام صاحبہ کی آمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے حریم ادب کی جانب سے تحائف دیے اور یوں ایک پُر تکلف چائے کے ساتھ ہماری محفل اختتام کو پہنچی۔

☆☆......☆☆

ثناء عسکری

ماڈل اور اداکارہ

مونی خان

ڈرامے دیکھنے والوں کے لیے ثناء عسکری کا نام نیا نہیں..... ثناء نے اپنے فنی کیریئر کی ابتداء بطور ماڈل کی پہلا تھیٹر پلے آدھے ادھورے ناپا کے تحت پیش کیا گیا۔ جس میں ثناء کی اداکاری کو بہت پزیرائی

ملی...... دیکھنے والے سمجھ گئے تھے کہ ثناء کی شکل میں ڈرامہ انڈسٹری کو ایک با صلاحیت اور خوبصورت اداکارہ مل گئی ہے۔ ثناء عسکری نے کئی ڈرامے کیے جن میں اے آر وائی ڈیجیٹل سے 'ڈولی کی آئے گی بارات' اور پھر اس کے سارے سیزن جو لوگوں میں بہت مقبول ہوئے۔ ثناء سیریس اداکاری سے بہت اچھی مزاحیہ اداکاری کرتی ہیں ایسا ڈرامے دیکھنے والوں کا ماننا ہے۔

ثناء کے چند مشہور ڈرامے 'خوشبو کا گھر' میں ہوں عبدالقادر' لیڈیز پارک ہیں۔ فیکٹر پاکستان میں بھی ثناء نے حصہ لیا۔ یہ ایسا گیم شو تھا جس میں حصہ لینے والوں کو کافی مشکل کھیل کھیلنے ہوتے تھے بعض اوقات خطرناک بھی......

ثناء نے مشہور آر جے منہاس علی عسکری سے شادی کی۔ کپل خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہا ہے اور ایک پیارے سے بیٹے کے والدین بھی ہیں۔ ثناء بہت فرینڈلی اور فن اونگ آرٹسٹ ہے مگر ساتھ ساتھ مزاج کے خلاف بات بالکل برداشت نہیں کرتی طبیعت میں ضد بھی بہت ہے۔ ثناء نے ابتدائی تعلیم بیکن ہاؤس لاہور سے حاصل کی پیدائش بھی لاہور کی ہے مگر اب ثناء اپنی فیملی کے ساتھ کراچی میں ہی رہتی ہیں۔ NCA سے انٹر اور NAPA سے گریجویشن کیا...... شاپنگ کا بہت شوق ہے اور میوزک سننا بہت پسند کرتی ہیں۔ فی الحال ثناء نے اپنی ساری توجہ اپنے گھر اور بیٹے پر مرکوز رکھی ہوئی ہے مگر ہم امید کرتے ہیں جلد اس اچھی اداکارہ کو ٹی وی اسکرین پر دیکھیں گے۔

☆☆......☆☆

سرمد سلطان کھوسٹ

ذیشان فراز

فنکار گھرانے کا وہ سپوت جس نے اپنے فن سے اک جہان کو حیران کردیا

بین الاقوامی طور پر مقبولیت پانے والا فنکار گھرانے کا چشم و چراغ جسے ہم اپنا روشن فنی مستقبل کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ عرفان کھوسٹ کے صاحبزادے جنھیں لوگ 'منٹو' کے نام سے جانتے ہیں۔ اپنی بے پایاں فنی صلاحیتوں کے اظہار کے طور پر ہم اگر سرمد کی فلم 'منٹو' ہی کا حوالہ دیں تو بھی سرمد کا سارا فن اس ایک معتبر حوالے میں سمٹ آئے گا ہے۔ سرمد سے ہوئی ان کے ابتدائی زمانے کی ایک ملاقات نذر قارئین۔

پی ٹی وی کے جن فنکاروں نے کم عرصے میں زیادہ شناخت بنائی ان میں سرمد سلطان بھی ہیں۔ سرمد کا ہر ڈراما اس کے لیے چیلنج ہوتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس چیلنج کو لگن اور شوق کے ساتھ پورا کرے۔ سرمد بنیادی طور پر مصنف اور ہدایت کار ہیں۔ ان کا اپنا پروڈکشن ہاؤس ہے اور وہ اداکاری سے زیادہ سیریلز اور انفرادی ڈرامے بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک سال تک پیپسی کی (کمپنی میں کام کیا) ماڈلنگ کی۔ سرمد، عرفان کھوسٹ کے صاحبزادے ہیں۔ ان کے دادا سلطان کھوسٹ بھی اس فیلڈ سے منسلک رہے۔ ان کی والدہ زاہدہ عرفان بھی کافی عرصہ ریڈیو پر کام کرتی رہیں یوں وہ اپنے خاندان کی تیسری نسل میں سے ہیں جو اس فیلڈ میں آئے انہیں شوبز کی فیلڈ سے قطعی دلچسپی نہیں تھی وہ تو ڈاکٹر بننا چاہتے تھے، ڈاکٹر نہ بن سکے تو لکھنا شروع کردیا، انہیں کتابوں سے گہرا لگاؤ ہے وہ ہر موضوع پر گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔

ایچی سن سے او لیول کرنے کے بعد سرمد نے گورنمنٹ کالج سے ایف ایس سی اور پھر سائیکالوجی اور انگلش لٹریچر میں ایم اے کیا۔ تعلیمی لحاظ سے انہوں نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور انہیں تین گولڈ میڈلز اور اپنے کالج کا بہترین اعزاز رول آف آنرز بھی ملا۔ سرمد نہایت کم گو اور سنجیدہ انسان ہیں۔

سرمد کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے ثمینہ احمد کی ڈائریکشن میں کام کیا اور بعد ازاں ثمینہ احمد نے سرمد کی ڈائریکشن میں ایک کھیل کیا۔

سرمد میں بڑا اداکار بننے کی پوری صلاحیت ہے۔ انہیں اردو ڈراموں کی امید سمجھا جاتا ہے اور خاص طور پر اس لیے بھی کہ انہوں نے لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی لیکن وہ اداکاری سے زیادہ سیریلز بنانے اور کہانیاں لکھنے پر توجہ دے رہے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے کام سے پرستاروں کو چونکا دیں۔ سرمد سے ایک ملاقات آپ کے روبرو ہے۔ یاد رہے یہ ملاقات سرمد کے شوبز میں قدم رکھنے کے ابتدائی دنوں میں ہوئی تھی۔ آج ماشاء اللہ سرمد شادی شدہ اور مانے

ہوئے بین الاقوامی شہرت کے اداکار ہیں۔ فلم ''منٹو'' میں اپنے کام سے پوری دنیا کو ہلا چکے ہیں۔

☆''اپنے خاندانی اور تعلیمی پس منظر کے بارے میں بتایئے۔ بچپن کیسا گزرا؟''

''میں 9 مئی 1979ء میں لاہور میں پیدا ہوا۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ تین بھائی تین بہنیں۔ ایک بہن شادی شدہ ہیں لیکن تعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ میرے والد عرفان کھوسٹ نے لاتعداد ڈراموں اور فلموں میں کام کیا۔ دو فلمیں بھی بنائیں۔ ''ڈائریکٹ حوالدار'' اور ''چن ماہی''۔ انہوں نے کئی ڈراموں

ملتان میں داخلہ ملا۔ میری والدہ نو دس سال سے علیل تھیں۔ ان کی بیماری کی وجہ سے میں لاہور نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر بننے کا ارادہ ترک کردیا اور پھر بی اے اور ایم اے کیا۔ میرا شمار اچھے طالب علموں میں ہوتا تھا اس لیے مجھے گولڈ میڈل اور جی سی کا سب سے بڑا اعزاز رول آف آنرز ملا جو مجھے بہت عزیز ہے۔ دادا کے حوالے سے میری کچھ یادیں خاص نہیں۔ وہ رائٹر تھے، ایکٹر اور پینٹر بھی تھے۔ انہوں نے فلم اور ٹی وی کے سینکڑوں ڈرامے لکھے ہیں اور ایک فلم ''ناجی'' بھی لکھی۔ ان کا ایک

سرمد سلطان کھوسٹ، اپنے والد عرفان کھوسٹ کے ساتھ

کے اسکرپٹ بھی لکھے۔ دادا نے بھی اداکاری کی کافی اسکرپٹ لکھے ان کا انتقال 64ء میں ہوگیا تھا۔ والدہ، زاہدہ عرفان کا تعلق ریڈیو سے تھا میں بچپن میں اکثر ان کے ساتھ ریڈیو جایا کرتا تھا۔ ایک کمرے میں بند ہوکر کام کرنا بہت غیر دلچسپ لگتا تھا۔ اس طرح ابا کو بھی میں نے دن رات کام کرتے اور گھر کو کم وقت دیتے دیکھا تو کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا میں اس فیلڈ میں قطعاً نہیں آنا چاہتا تھا۔ اے لیول سے اولیول کرنے کے بعد میں نے گورنمنٹ کالج سے ایف ایس سی کیا میرے نمبر میرٹ سے تین یا چار کم تھے اس لیے مجھے لاہور کے بجائے نشتر میڈیکل کالج

اسکرپٹ یادگار کے طور پر میں نے فریم کروایا ہوا ہے۔ ابا کی زندگی کام کے لحاظ سے بہت مصروف گزری اور میں چاہتا تھا کہ خاندان کا تصور ایسا ہو کہ بچے کو والدین وقت دے سکیں۔ اس لیے میں بھی اداکار بننے کا خیال دل میں نہیں لایا تھا۔ نہ والدین نے مجھے کسی خاص شعبے میں جانے کے لیے مجبور کیا۔

کچھ خوبیاں بچپن سے ہی میری شخصیت میں ہیں جو مجھے اپنے والدین سے ملی ہیں۔ مجھ میں صبر اور برداشت بہت ہے۔ کھرا آدمی ہوں۔ سچی بات لوگوں کے منہ پر کہنے سے گھبراتا نہیں ہوں۔ میں نے ہمیشہ بزرگوں کی عزت کی اور مقابل کو انسان سمجھتا ہوں۔ میری

حتمی کوشش ہوتی ہے کہ اگر میرے بس میں ہو تو لوگوں کے کام آسکوں۔ غلطی کا اعتراف کر لینے میں عار نہیں سمجھتا میں اللہ کے سوا کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔''

☆ ''فنی کیریئر کب شروع کیا؟''

''ایف اے میں نے اٹھارہ سال کی عمر میں کر لیا تھا۔ والد کا ایڈورٹائزنگ کا بزنس ہے۔ دوران تعلیم آفس جانے لگا وہاں ہر شعبے میں کام کیا اور اسکرپٹ بھی لکھے اس زمانے میں ہر ملک کا ادب پڑھا اور وہاں بنائی جانے والی فلمیں دیکھیں جہاں بھی گیا وہاں کے لٹریچر کی ٹرانسلیشن انگلش اردو وغیرہ میں تلاش کر کے لاتا تھا اور اس سے بھی میری نالج میں خاصا اضافہ ہوا۔ یہ شوق ابھی تک جاری ہے۔ میں نے ریڈیو سے ہی اسٹارٹ کیا۔ یاسمین طاہر کا ایک پروگرام کیا تھا پھر فلمی گانوں کا پروگرام ٹاپ ٹین 101 سے کچھ عرصہ تک کیا۔ یہ بی اے کی بات ہے۔ ایم اے کے بعد ایک دن منیزہ آنٹی کے بیٹے عدیل ہاشمی سے ملاقات ہوئی تو اس نے آفر کی اور کہا کہ میں ڈراموں میں کام کیوں نہیں کرتا۔

جواد بشیر نے آڈیشن لیا اور میرا پہلا ٹی وی ڈراما ''رانگ نمبر'' تھا۔ یہ سیریل یونس بٹ نے لکھا تھا پھر جواد سے دوستی ہوگئی اور میں اسے اسسٹ کرنے لگا۔

99ء کی بات ہے میں نے جواد سے اسکرپٹ لکھنے کی بات کی اس نے ہامی بھرلی اور کہا کہ ٹھیک ہے تم لکھو۔ میں نے پہلا اسکرپٹ ''شاشلک'' لکھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ پہلے اسکرپٹ کی وجہ سے ہی شاباش ملی جس سے بہت حوصلہ بڑھا۔ پھر ہم نے مل کر ٹیم بنائی اور کئی ڈرامے کیے۔ ''دو اور دو چار'' کیا۔ ''اوور کوٹ'' عید پر ایک کھیل تیار کیا۔ سعادت حسن منٹو اور شیکسپیئر کے کئی ڈراموں پر کام کیا۔ پی ٹی وی کے فیسٹیول میں منٹو کے ایک ڈرامے پر مجھے بیسٹ ڈائریکٹر کا ایوارڈ بھی ملا۔ پھر کچھ عرصہ گیپ دیا یعنی صرف اپنے آفس میں ہی کام کیا۔''

☆ ''آپ کا پہلے اسکرپٹ ''شاشلک'' کی کتنی قسطیں تھیں سنا ہے یہ طویل سیریز پر مبنی تھا؟''

''یہ کامیڈی سیریز تھی ہر دفعہ مختلف کہانی ہوتی تھی اس کی 101 قسطیں چلیں اور ناظرین نے عمدہ رسپانس دیا۔''

☆ ''اس کے بعد جب کام شروع کیا تو کیا کام کیا؟''

''پیپسی کی اشتہاری مہم میں معاونت کا موقع ملا پورا ایک سال کمپین، نائٹ ٹرانسمیشن کی کمپیئرنگ کی۔ ''سیٹ کا، بیوٹی پارلر، ایک کہانی بڑی پرانی'' اور بے شمار سیریلز اور انفرادی ڈرامے کیے کچھ میں کام کیا کچھ ڈائریکٹ کیے کسی کی کہانی لکھی۔ بس اتفاقیہ طور پر ہی میں نے اس فیلڈ میں کام کرنا شروع کیا۔ میری والدہ دس گیارہ سال سے بیمار تھیں ان ہی کی وجہ سے میں نے ملتان نشتر کالج میں داخلے کے باوجود ڈاکٹری پڑھنے کا ارادہ ترک کیا اور جب شوبز کی فیلڈ میں آیا تو کام کے ساتھ محبت ہوگئی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ڈائریکشن کا عمل اس قدر تخلیقی ہوتا ہے۔ بہرحال میں خوش ہوں کہ اس میں روزمرہ کے معمولات سے ہٹ کر تبدیلی پیدا کرنے کی گنجائش ہے۔ اپنی معلومات اور مشاہدات لوگوں تک منتقل کرنا ایک دلچسپ کام ہے مجھے یہ سب کرنا اب بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

☆ ''آپ نے اب تک جس قدر کام کیا اس سے کس حد تک مطمئن ہیں؟''

''مطمئن تو خیر میں نہیں ہوں میں نے اب تک جو کچھ بھی کیا وہ سمندر کے قطرے کے مترادف تھا لیکن دیکھا جائے تو بنی نوع انسان کے لیے۔ یہ ایک قطرہ بھی بہت اہم ہوتا ہے ہم اگر (مسکرا کر) قطرہ قطرہ بھی جمع کریں تو سمندر بن سکتا ہے۔ دنیا میں انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اپنے کام میں مہارت پیدا کرنے کے لیے بہت محنت کی ہے اور یہ کام شوق اور لگن کے بغیر ممکن بھی نہیں تھا۔ اب مجھے ڈرامہ کافی حد تک سمجھ آگیا ہے۔ ''دو اور دو چار'' اچھا ڈرامہ تھا۔ ''ماٹی نی میں کینوں آکھاں'' پی ٹی وی فیسٹیول میں شامل ہوا تھا، یہ پورے ملک کے 26 منتخب ڈراموں میں سے ایک تھا۔ پچاس منٹ کے دورانیے کے کھیل میں دو کردار تھے۔ ثمینہ احمد اور میں، دو کمروں میں ہم نے ڈرامہ مکمل کر لیا تھا۔ جسے فیسٹیول میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ہمیں اس ڈرامے کے پیسے بھی ملے، نام بھی ملا اور اچھا رسپانس بھی۔ اس کا فیسٹیول میں شامل ہونا ہی میرے لیے اعزاز کی بات ہے یہ کم خوشی کی بات نہیں کہ 26 ڈراموں میں سے ایک میرا ڈراما

سلیکٹ کیا گیا۔"

☆"آپ نے یہ ڈراما خود ڈائریکٹ کیا تو ثمینہ جیسی سینئر فنکارہ نے آپ کی ڈائریکشن میں کام کرنا کیسا محسوس کیا میرا مطلب ہے آپ کے ساتھ تعاون کیا یا پھر.....؟"

"ثمینہ آنٹی، قوی خان اور ایک آدھ دوسرے ٹی وی فنکار ہمارے فیملی ممبرز کی طرح ہیں۔ جب میں نے کام شروع کیا تھا اور مجھے اداکاری کی الف ب نہیں آتی تھی تب بھی ثمینہ آنٹی نے میرا ساتھ دیا اور اسی طرح میری بات مانتی تھیں اور جب میں نے انہیں لے کر ڈراما تیار کیا تب بھی انہوں نے میرا مان رکھا اور مجھے میرے چھوٹے ہونے کا احساس نہیں دلایا۔ دراصل یہ ہمارے سینئرز کا بڑا پن ہے جو اپنے جونیئرز کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں اور ان کی سرپرستی کی وجہ سے میں آج اس مقام پر ہوں میں جو کچھ بھی ہوں ان ہی سے سیکھا ہے۔ اس بات کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں۔"

"میں ایک وقت میں اتنا ہی کام کرنا چاہتا ہوں جو میرے ناظرین شوق سے دیکھیں اور جسے میں آسانی کے ساتھ مکمل کرسکوں۔ پرائیویٹ سیکٹر میں ویسے بھی مقابلے کا رجحان ہے۔ ہمیں چیلنج کا سامنا ہے اسی لیے

میری کوشش ہے کہ جو مواقع ملیں ان کو پوری طرح استعمال کروں تاکہ ناظرین کو ہر مرتبہ نئی چیز دکھا سکوں۔"

☆"کسی کھیل کی تیاری میں ہدایت کار کو کن چیزوں پر توجہ دینی چاہیے؟"

"سب سے اہم بات رسک لینا ہے کیونکہ اگر ہم

نئے تجربے کرنے کا رسک لیں گے تو کامیابی ہوگی کیونکہ عوام نیا پن پیدا کرنے سے متاثر ہوتے ہیں لیکن ہمارے ہاں رسک لینے کی روایت نہیں ہے۔ رسک تب لیا جاتا ہے جب آپ مضبوط اعصاب کے مالک ہوں مگر ہمارے ہاں لوگوں کی اکثریت رسک لینے سے ڈرتی ہے۔ نئے نئے تجربے کوئی نہیں کرتا کیونکہ ان کے خیال میں اگر نئے تجربے کرنے کا رسک لیا جائے تو پیسہ ڈوب جائے گا۔ پوری دنیا میں میکنگ، پروڈکشن، لوکیشن، موسیقی میں سب سے زیادہ جس چیز پر توجہ ضروری سمجھی جاتی ہے وہ کاسٹ ہے کیونکہ میرے خیال میں نیا پن کاسٹ سے ہی پیدا کیا جاسکتا ہے اور کاسٹ میں رسک لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور جو یہ رسک لینے میں جھجک محسوس نہیں کرے گا وہی ترقی کرے گا۔ انگلش اور بھارتی فلم میکر یہ رسک بڑھ چڑھ کر لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں کاسٹ کے لیے نئے چہروں پر اعتماد کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا بیک گراؤنڈ کی وجہ سے تو چانس مل جاتا ہے خالصتاً ٹیلنٹ کی بنا پر بھی نئے چہروں کو آزمانے کا رسک نہیں لیا جاتا۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں نئی نسل کی صلاحیتوں سے انکار حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ نئی نسل میں بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں لیکن انہیں اظہار کے مواقع میسر نہیں۔ اچھا کام کرنے والوں کو لفٹ ہی نہیں کروائی

جاتی۔ سینئرز ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں۔ دوسرے ملکوں میں ان کے قیمتی تجربات سے مرتے دم تک استفادہ کیا جاتا ہے مگر ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے اگر ہم سینئرز اور نئے چہروں کو لے کر ایسے ڈرامے تیار کریں، ایسی کہانیوں پر کام کریں جن کے بارے میں لوگوں کو جستجو اور تجسس ہو تو وہ بھلا کیونکر کامیاب نہیں ہوں گے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ یہاں کے لوگ ایسے مسائل میں گھرے ہیں جن پر سوچنا بھی فضول ہے۔ خواتین چار کمروں میں رہتی ہیں تو وہ ان چار کمروں کے آگے سوچتی ہی نہیں، چھوٹے چھوٹے مسائل کے تانے بانے بنتی رہتی ہیں۔ مرد کی دفتر اور گھر سے آگے سوچ جاتی ہی نہیں۔ دنیا چاند پر جا پہنچی ہے اور ہم پھوپی، ماموں کے جھگڑوں سے باہر ہی نہیں نکلتے تو پھر کام میں بہتری کیسے آئے گی۔ دراصل ہمیں آگے بڑھنے کا شوق ہی نہیں، ہماری سوچ ہے بچے کو صرف ڈاکٹر، انجینئر بنانا ہے اور کچھ نہیں حالانکہ ان میں سے بہت سے کم عمری میں معاشرے کے نبض شناس ہوتے ہیں، وہ سماجی ناہمواریوں، طبقہ بندیوں، محرومیوں اور ناانصافیوں پر بہتر سوچ رکھتے ہیں۔ اہم بات کام سے محبت اور کام سے لگن رکھنے کی ہے۔ شعبہ خواہ کوئی بھی ہو انسان عزم اور حوصلے کے ساتھ آگے بڑھ سکتا ہے، انجینئر ڈاکٹر بنے بغیر بھی۔

اب میں اس فیلڈ میں آیا ہوں تو میرے اندر فلمیں دیکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے۔ میں نے کچھ پاکستانی اور انڈین پرانی فلموں کے علاوہ ایران، جاپان، چائنا، اٹلی کی فلمیں دیکھی ہیں۔ مختلف ممالک کی موویز اور کتابیں پڑھتا رہتا ہوں۔ مجھے وہاں کے کلچر کا پتا چلتا ہے۔ اس سے میرے اندر آگاہی پیدا ہورہی ہے اور میں ان تجربات سے فائدہ بھی اٹھاتا ہوں۔ پوری دنیا میں اتنا اچھا کام ہورہا ہے، وہاں سینما کو عروج حاصل ہے۔ ہمارے ہاں ٹی وی اہم ہے اگر ہم اپنی سوچ میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے تو کام میں بہتری پیدا ہو گی چھوٹے چھوٹے مسائل کم ہوں گے۔ ٹی وی سے آگے بھی ایک دنیا ہے۔ آسکر ایوارڈ کے خواب دیکھنا بری بات نہیں ہے لیکن اپنی سوچ کو آسکر ایوارڈ تک محدود کردینا صحیح نہیں ہے۔''

☆''اس فیلڈ میں اپنے والد کی وجہ سے بھی آپ کو اہمیت ملی ہوگی؟''

''اس میں شک نہیں کہ ایسا ہوا، ابا کے ملنے والوں نے مجھے خوش آمدید کہا لیکن پروڈیوسر، رائٹر یا اداکار صرف کام کے بل بوتے پر ہی چلتا ہے، سفارش یا تعلقات آپ کو کسی چینل تک لے جاسکتے ہیں۔ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے میں مدد ہرگز نہیں کرسکتے۔ مجھے خوشی ہے کہ مجھے ابا کی سپورٹ حاصل ہے لیکن میری اپنی محنت اور صلاحیتیں، میری کامیابی میں شامل ہیں۔ کیونکہ سفارش کی بناء پر آپ کو ایک یا دو مرتبہ کام مل جائے گا مگر تیسری مرتبہ پروڈیوسر آپ کو خود آؤٹ کردے گا۔''

☆''اگر آپ کی کارکردگی کا آپ کے والد کے کام سے موازنہ کیا جائے تو؟''

''ابا تو خیر ابا ہیں، ان کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے میں اور وہ بھی ایک لیول پر نہیں آسکتے۔ ان کا کام مجھ سے زیادہ ہے اور بہتر بھی۔''

☆''وہ آپ کے کام پر تنقید کرتے ہوں گے؟''

''کبھی نہیں، وہ ہمیشہ کہتے ہیں کہ جو بھی کرنا ہے اپنے طور پر کرو۔ انہوں نے میرے کام کے حوالے سے کبھی زیادہ بات نہیں کی۔ نہ اپنے تجربات سے مجھے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی ان کا بڑا پن ہے کہ وہ بچوں کو اتنی اہمیت دیتے ہیں۔''

☆''آپ کو ان کا کون سا کردار بہت اچھا لگا؟''

''اندھیرا اجالا'' کا کردار مجھے ہی نہیں اکثریت کو اچھا لگا تھا۔ خاصا پاور فل کردار تھا اور اس میں انہوں نے حقیقت کا رنگ بھرا، پھر اس ڈرامے کے بعد لوگوں نے اس قدر واہ واہ کی، اس طرح ان کے کافی ڈرامے داد طلب تھے اور ان کا رسپانس بھی اچھا ملا۔''

☆''آپ فراغت میں کیا کرتے ہیں کوئی خاص مشغلہ؟''

''مجھے تھوڑی فرصت ملتی ہے تو میں کتابیں پڑھتا ہوں، فلمیں دیکھتا ہوں، یعنی اپنے کام کے حوالے سے ہی جستجو مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ میرے پاس کتابوں کا ذخیرہ ہے ہر موضوع پر میرے کمرے میں میرا سامان کم، کتابیں زیادہ ہیں ہر طرف کتابیں ہی

سرمد سلطان کھوسٹ اپنی ساتھی اداکارہ ماہرہ خان کے ساتھ

کتابیں ہیں اگرچہ میرا کمرا کوئی بہت بڑا نہیں ہے لیکن میرے اردگرد آپ کو ہر طرف کتابیں ملیں گی۔''

☆''کس قسم کا لٹریچر شوق سے پڑھتے ہیں؟''

''میں نے مختلف ادوار میں مزاج کے مطابق کتابیں منتخب کیں۔ اسکول سے لے کر بی اے تک انگریزی کلاسک، فلسفہ، سائیکالوجی، پھر اس فیلڈ میں آیا تو سوچا کچھ اور بھی ہونا چاہیے۔ بانو قدسیہ، منٹو، خواجہ غلام عباس اور اپنی لوکل علاقائی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ پھر ایرانی ادب، چائنا، جاپان، اٹلی کا ادب جہاں جاتا ہوں وہاں کے لٹریچر کی ٹرانسلیشن لے کر آتا ہوں۔ فلم کی تکنیک کے حوالے سے ان کی موویز دیکھتا ہوں۔ مجھے ٹیگور پسند ہے، بنگالی ادب من کو بھاتا ہے۔''

☆''کسی کام کو کرنے سے پہلے مشاہدہ ضروری سمجھتے ہیں؟''

''جی ہاں سو فیصد۔ اب میں پرسنل ڈرائیور رکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں کیونکہ ڈرائیونگ کے دوران میں ہر چیز کا بغور مشاہدہ کر رہا ہوتا ہوں۔ ادھر سے شارٹ لوں تو کیسا رہے گا، ہر چیز دیکھتا ہوں کہ لائٹ کیسی پڑ رہی ہے، اپنے کام کے حوالے سے اٹھتے بیٹھتے سوچنے کا عادی ہوں۔ کردار کا تاثر دینے کے لیے کیمرہ مین کو بتا سکوں کہ کس زاویے پر کیمرہ رکھیں گے تو کردار کا صحیح تاثر ملے گا کیونکہ اچھا بویا جائے تو اچھا پھل ملے گا۔ ہر شخص کے اپنے تخلیقی جوہر ہوتے ہیں اور اس کام میں کوئی بڑی عمر تو نہیں ہے لیکن شوق اور جستجو ضروری ہے کیونکہ یہ کام محنت طلب ہے اور جدوجہد کے بغیر ہم اچھا کام نہیں دے سکتے۔ پھر سیریل تیار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اس کے لیے مطالعہ اور مشاہدہ دونوں چیزیں مجھے ہر دم متحرک رکھتی ہیں۔ میں ہر قسم کے لوگوں سے ملتا ہوں تو یہ سب تجربے، کام کے دوران میرے مددگار ہوتے ہیں۔ پھر میں مختلف ممالک سے کتابیں اور فلمیں لے کر آتا ہوں ان سے بھی استفادہ کرتا ہوں۔ اتنا کام کرنے کے باوجود مجھ میں سیکھنے کی لگن بڑھ رہی ہے۔ میرے اندر ہر وقت خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہے ابھی مجھے فن اداکاری میں بہت آگے جانا ہے۔ بہت کچھ سیکھنا ہے۔''

☆''آپ پروڈکشن کی فیلڈ میں کام کر رہے ہیں تو لوگوں کو کیسا پایا؟''

''مجھے یہاں کے ماحول اور کام کے طریقہ کار سے بہت دھچکا لگا ہے۔ یہاں ہر کوئی کام پر دیر سے آتا ہے کوئی نظم وضبط نہیں لیکن جب میں کوئی سیریل سائن کرتا ہوں تو اس کا مکمل ذمہ دار بن جاتا ہوں۔ میرا کام لینے کا اپنا طریقہ ہے۔ نئے لوگ اس معاملے میں کافی تعاون کرتے ہیں۔ جدوجہد اور محنت سے کام کو اپنا فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔ وہ تاریخیں دینے کے معاملے میں بھی نخرے نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس میدان میں آگے بڑھتے جا رہے ہیں شاید اسی لیے اپنے سیریل ''تماشا گھر'' کے لیے نئے لڑکے کو مصنف کے طور پر چانس دیا ہے۔''

☆''اب جب کہ آپ ڈائریکشن میں آگئے ہیں تو اپنے ساتھیوں کو سکھانا کیسا لگ رہا ہے؟''

''زندگی میں کسی کی مدد کرنا، اس کی شخصیت میں علمیت پیدا کر کے اس کے فن کو نکھارنا سب سے ولولہ

انگیز کام ہے۔ کسی انسان کے لیے اس سے زیادہ حیرت کی بات کیا ہوگی کہ اس کی نئی نسل سے استفادہ کرنے والے اس پر سبقت لے جائیں۔ یہ حقیقت تو بہت ہی خوشی دیتا ہے کہ ایک فرد اپنی معلومات، اپنا تجربہ، علم اور مشاہدہ دوسروں تک منتقل کرتا ہے۔ میں نے جو کچھ اپنے بزرگوں اور سینئرز سے سیکھا ہے اسے سکھانے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔ مجھے زندگی میں جب بھی موقع ملا بحیثیت استاد کے کام کروں گا کیونکہ ڈائریکشن بھی اس سے ملتا جلتا کام ہے۔ مجھے تدریس کے شعبے میں کام کرنا بھی اچھا لگتا ہے۔''

☆ ''کیسا رسپانس مل رہا ہے؟''

''اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ اگر میری بات کوئی سمجھتا ہے تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ آج زندگی کے اس مقام پر ہوں جہاں مجھے تمام خوشیاں حاصل ہیں جس کی ہر کوئی تمنا کرسکتا ہے۔''

☆ ''پروڈکشن میں آنے کے بعد آپ نے اداکاری ترک کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

''میں یکسوئی سے کام کرنا چاہتا ہوں، اس لیے اپنی پروڈکشن کے کسی بھی پیے میں کام نہیں کرنا چاہتا۔ میں اداکاری برائے اداکاری کا قائل نہیں ہوں۔ ایسا پروجیکٹ ہونا چاہیے جو حقیقت میں مجھے اداکاری پر اکسائے تو ضرور کام کروں گا۔''

☆ ''معاوضوں کے بارے میں بتائیں؟''

''ماڈلنگ میں پیسہ زیادہ ہے، ہمیں عادت ہے ڈھیر سارا کام کرکے پیسہ کمانے کی، جب تھوڑا کام کرکے زیادہ پیسہ ملتا ہے تو شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔ میں محنت کرکے کمانے پر ایمان رکھتا ہوں۔ پیپسی کولا کی ایک [illegible] تک کمپئن کی۔ پرکشش معاوضہ ملا ماڈلنگ میں پیسہ زیادہ ملتا ہے۔''

☆ ''کس کے ساتھ کام کرنا اچھا لگتا ہے؟''

''کئی لوگ ہیں جن کے ساتھ کام کرکے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ تا[illegible] شروع سے ٹیم میں ہیں اچھے ٹیم ورکر ہیں دوسروں کے لیے مسائل بھی پیدا نہیں کرتے۔ ان کے ساتھ کام کرکے خوشی ہوتی ہے۔''

☆ ''اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟''

''کوئی خاص نہیں، مصروفیات اتنی ہوتی ہیں کہ صحت، کھانے، پینے کے باوجود سیٹ رہتی ہے۔ مثلاً میں کھانے کا شوقین ہوں بڑی شوق سے کھاتا ہوں، چائنیز تین ٹائم کھانے کو ملیں گے تو کھالوں گا۔''

☆ ''پی ٹی وی سے ابتدائی طور پر جو سیریلز پیش کیے گئے وہ معیاری تھے موجودہ دور میں ہم پہلے جیسا معیار قائم رکھنے میں ناکام کیوں ہیں؟''

''اس میں شک نہیں کہ پی ٹی وی نے ابتدائی طور پر معیاری سیریلز دیے لیکن یہ بات صحیح نہیں کہ انہوں نے صرف معیاری سیریلز ہی دیے، کئی ایسے تھے جو غیر معیاری بھی تھے اگر پی ٹی وی نے بیس سال میں تیس اچھے سیریلز دیے تو ہر سال میں ایک اچھا سیریل پیش کیا۔ اس وقت لوگ پی ٹی وی دیکھنے پر مجبور تھے۔ اب کئی چینلز ہیں، کام میں ورائٹی ہے، نیا پن ہے، کچھ تبدیلیاں ہیں ان میں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ غیر معیاری کام ہو رہا ہے۔ آج بھی معیاری کام ہو رہا ہے۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نئے چینلز جب آئے تو وہ اپنے ارد گرد چلنے والے بڑے پروگراموں کے اثرات کی زد میں آگئے پھر نجی سیکٹر میں وسائل کی کمی نے مزید حالات خراب کردیے۔ یہاں فلم ہو یا ڈراما جب ماہرین کے ہاتھوں سے نکل کر غیر پیشہ ور اور دودھ فروخت کرنے والے کے ہاتھوں میں جائے گا تو انجام غیر معیاری کی صورت میں ہی نکلے گا۔ پھر ایک طبقے نے ہمسایہ ملک کے گلیمر سے متاثر ہوکر ان کی پیروی شروع کردی ہے، حالانکہ میرے خیال میں ان ڈراموں میں کہنے سننے کو کچھ بھی نہیں۔ وہ لوگ ان کے پیچھے لگ کر اپنی شناخت بھی کھو رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کام بڑھا ہے تو اس میں نیا پن بھی آیا ہے۔ اب ایکٹنگ کا اسٹائل بدل گیا ہے۔ اگر پاکستان کو بنے 70 سال ہوئے ہیں تو یہ ایک قوم کی تاریخ میں کچھ بھی نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم کن حالات اور وسائل میں کام کر رہے ہیں۔ تنقید برائے تنقید سے ہٹ کر ہمیں اپنے کام میں بہتری پیدا کرنا ہوگی۔''

☆☆☆

ناول

رفعت سراج

دامِ دل

قسط 29

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کر دیں گی' رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ثمرا یکدم طیش میں کیوں آ گیا۔
''اس طرح کیا دیکھ رہی ہو جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔''
''میں اپنا کام ہی کر رہی ہوں……'' ندا بھی اب پھٹ پڑی تھی۔

''کیوں کیا ہو گیا...... ہاں...... ویسے تو تمہیں کام کرنے کی عادت ہی نہیں ہے...... اُس گھر میں تو حشر ہوا تھا انسان کو بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں ملتی تھی......''

''اچھا اب تو آپ کو میرے اندر بے تحاشہ کیڑے نظر آنے لگے ہیں۔ مجھے پتہ ہے آپ بہانے بہانے سے کیوں چیخ رہے ہیں۔ اِس کی وجہ جانتی ہوں میں۔''

ندا بھی اب خود پر قابو نہ رکھ سکی تھی جتنا اُس نے برداشت کرلیا تھا وہ بھی بہت تھا۔ وہ اتنے خوبصورت گھر میں ثمر کے ساتھ بہت آرام دہ زندگی گزارنا چاہتی تھی جس کے اندر خوشیوں کے اور محبت کے سوا کچھ نہ ہو۔

لیکن اِس گھر میں آنے کے بعد سے لے کر اب تک ثمر کے ساتھ کتنی بار اُلجھ چکی تھی یا ثمر نے اُس پر چڑھائی کردی تھی۔

''اچھا...... مجھے تو سمجھ نہیں آسکتی کیونکہ میں اتنا ذہین نہیں ہوں اگر تمہاری سمجھ میں آتی ہے تو ٹھیک ہے۔ میں تو تم سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ وجہ کیا ہے؟ تم جیسے خوش رہ سکتی ہو اپنے خوش رہنے کے راستے نکال لو......اور یہ بات بات پر مجھ سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر ثمر جانے کے لیے پلٹا مگر جاتے جاتے رُک گیا۔

پلٹ کر ندا کی طرف دیکھا اور کہا۔

''کان کھول کر سن لو...... وہ گھر تمہارے نانا کا گھر تھا اُس پر میرا کوئی حق نہیں تھا بہت کچھ برداشت کرتا رہا......لیکن یہ میرا گھر ہے تمہارا کزن اِس گھر میں آئے مجھے بالکل پسند نہیں ہے اور اُس کو مسئلہ کیا ہے وہ پراپرٹی سیل کرنے آیا ہے سیل کر کے چلا جائے کیوں جم کر بیٹھ گیا۔ لگتا ہے امریکہ میں بھی الاؤنسز پر گزارا کرتا ہے فضول میں تم پر رعب جھاڑتا ہے کہ کوئی بہت بڑا بزنس کررہا ہے۔

جو بہت بڑے بزنس کرتے ہیں وہ اِس طرح لمبی تان کر سوتے نہیں اور نہ کہیں اس طرح جم کر اس طرح بیٹھ سکتے ہیں......''

یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختے کے انداز میں وہاں سے چلا گیا۔

''سب ہی کچھ برا لگ رہا ہے میں بھی اور میرا کزن بھی...... بہت دکھ ہو رہا ہے اُس سے علیحدگی کا پتہ نہیں کیا ڈرامہ ہے۔'' ندا اب بیٹھی ہوئی بڑبڑا رہی تھی۔

☆......☆......☆

''بیٹا آج کے لیے میں معذرت کرتی ہوں۔ چمن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ورنہ ہم ٹینا کو اُداس کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے وہ بچی ہمیں بھی بہت پیاری ہے۔ اُس کی وجہ سے تو میری بچیاں بھی خوش رہنے لگی ہیں۔ یوں جیسے ٹینا اُن کی خوشیوں کا بہانہ بن گئی ہے۔''

عطیہ بیگم فون پر علی سے بات کررہی تھیں۔

علی نے اسپتال سے فون کیا تھا کہ وہ ڈرائیور کو بھیج دے گا تو وہ بچیوں کو ٹینا کے پاس بھیج دیں۔ وہ بار بار فون کررہی ہے مہوش اور مہ پارہ کو بہت یاد کررہی ہے۔''

کوشش کے باوجود ڈاکٹر علی کے منہ سے یہ نا نکل سکا کہ بچیوں کے ساتھ چمن کو بھی بھیج دیں چمن کا

خیال آتے ہی ایک عجیب سے احساس جرم کا شکار ہو جاتے تھے۔
جیسے بہت ہی غیر اخلاقی حرکت کے مرتکب ہو رہے ہوں۔ چمن اُن کے دل کے دروازے پر بار بار دستک دیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔
اور وہ پریشان ہو کر خود کو سمجھاتے تھے کہ یہ تو بہت ہی غلط حرکت ہے۔ وہ کسی کی امانت ہے کسی کی بیوی ہے اور ایک شادی شدہ عورت کا خیال تو ذہین میں آنا ہی نہیں چاہیے۔
''بیٹا اصل میں، میں یہ چاہتی ہوں کہ بچیاں چمن کے ساتھ جائیں۔ اب دیکھیں بچیاں ہی تو ہیں ٹینا کی آیا اپنے کسی دوسرے کام میں لگ جائے بچے اس وقت تک کیا کر بیٹھیں بچے ہی تو ہیں۔ بچوں پر نظر رکھنا پڑتی ہے چمن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بس..... ورنہ میں آپ کو بھی انکار نہ کرتی..... انشاء اللہ میں خود چمن سے کہوں گی وہ بچیوں کو لے کر ٹینا کے پاس چلی جائے گی۔''
''چمن کی طبیعت خراب ہے..... کیا ہوا ہے میڈیسن لی.....'' ڈاکٹر علی کے منہ سے پھر بے اختیاری کیفیت میں سوال پر سوال آنے لگے۔
''بیٹا بد نصیبی سے شاید کوئی بڑی بیماری نہیں ہے.....''
عطیہ بیگم کا دل پانی کی طرح پگھل رہا تھا اور بہانے بہانے سے یہ پانی آنکھوں کے راستے بہہ نکلتا تھا۔ آنکھ میں آنسو بھر آئے تو آواز بھی بھرا گئی۔
ڈاکٹر علی عطیہ بیگم کی بدلتی ہوئی کیفیت پر چونک پڑے تھے۔ لفظ بد نصیبی کوئی عام لفظ نہیں تھا۔ ایک ماں جب اپنی بیٹی کے لیے لفظ بد نصیبی استعمال کرتی ہے تو اس لفظ کے پس منظر میں بڑی بڑی قیامتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔
بڑے بڑے رازوں پر پردہ پڑا ہوتا ہے اُن کی اپنی زندگی کبھی بھی آسان نہیں رہی تھی ایک امتحان کے بعد دوسرا امتحان ایک دریا کے بعد دوسرے دریا کا سامنا اور جو لوگ ہر ہر قدم پر اپنی خواہشات کو ناکامی سے دوچار ہوتا ہوا دیکھتے ہیں وہ غیر ضروری طور پر حساس ہو جاتے ہیں..... لہجوں کے معاملے میں محتاط اور رویوں کے معاملے میں بے حد حساس..... عطیہ بیگم کے الفاظ بھی قابل توجہ تھے اور لہجہ بھی دل پر اثر انداز ہو رہا تھا۔
''بیٹا آپ سے اِدھر اُدھر کی بات کر کے اصل بات چھپانا اچھا نہیں لگتا پتہ نہیں کیوں مجھے تو پہلے روز سے آپ اپنے لگتے ہیں۔ آپ کو بتا رہی ہوں چمن کے سامنے ذکر مت کیجیے گا.....'' عطیہ بیگم حد درجہ محتاط ہو کر بات کر رہی تھیں۔
''نہیں نہیں آنٹی مجھے آپ اپنا ہی سمجھے..... ٹینا کے لیے آپ کا گھرانہ رحمت بن گیا ہے..... وہ بہت خوش نظر آتی ہے یوں جیسے بہت مصروف ہوگئی ہے..... میں تو خود آپ سب لوگوں کا احسان مند ہوں..... آپ کی ہر بات میرے پاس ایک امانت ہے۔''
ایک تجسس سا ڈاکٹر علی کے اندر جوار بھاٹا بن کر اُبھر رہا تھا۔ وہ مشتاق نظر آئے کہ ایسا کیا ہے جو عطیہ بیگم بتانے سے پہلے اتنی احتیاط کر رہی ہیں۔
''بیٹا بات یہ ہے کہ چمن کی اپنے شوہر سے باقاعدہ علیحدگی ہوگئی ہے اور کسی عورت کی زندگی میں یہ

حادثہ کوئی معمولی بات نہیں ہوتی شادی شدہ عورت کے لیے تو ایسی قیامت ہے جس کا شور زندگی کے آخری لمحے تک پیچھا کرتا ہے۔۔۔۔
میری بیٹی بہت حساس ہے شروع ہی سے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت محسوس کرتی ہے۔۔۔۔۔ آپ سوچیں اس وقت اُس کی کیا حالت ہوگی شاید میں آپ کو نا بتاتی مگر یہ سوچ کر بتا دیا کہ آپ فون کریں گے اور بچیوں کو بلانے کے لیے اصرار کریں گے پتہ نہیں اِدھر کیا حالات ہوں بار بار انکار سن کر آپ پریشان نہ ہو جائیں ہمارے بارے میں یوں ہی کچھ نا سوچ بیٹھیں۔''
عطیہ بیگم بول رہی تھیں۔ لیکن اب ڈاکٹر علی کی زبان جیسے چٹک کر پتھر بن چکی تھی۔ وہ بولنے کی کوشش کر رہے تھے مگر لگتا تھا کہ جیسے زبان کو جنبش دینا ایک کارمحال ہوگیا ہے۔ باقاعدہ علیحدگی ہوگئی ہے تو پہلے بے قاعدہ علیحدگی تھی۔۔۔۔ یعنی وہ جواب تک محسوس کرتے چلے آرہے تھے وہ وہم نہیں تھا اُس میں قیامت خیز حقائق پوشیدہ تھے۔
زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی جنبش کرنے سے قاصر تھی لیکن خیالات تو اڑان بھرنے سے قاصر نہیں تھے۔ آپ میری بات سن رہے ہیں ڈاکٹر علی کی طرف سے مکمل خاموشی پا کر عطیہ بیگم کو گمان ہوا کے شاید رابطہ منقطع ہوگیا ہے۔۔۔۔ ڈاکٹر علی نے جی یا ہاں بولنے کی بجائے پہلے ہلکا سا کھنکارا کیونکہ وہ واقعی بول نہیں پارہے تھے اور کھنکارنے کی وجہ یہ تھی کہ عطیہ بیگم کو یقین ہو جائے کہ رابطہ بحال ہے اور وہ اُن کی بات پوری توجہ سے سن رہے ہیں۔
''جی آنٹی میں آپ کی بات بہت غور سے سن رہا ہوں۔'' بالآخر وہ ایک جملہ کہنے میں کامیاب ہو گئے۔
''بیٹا اِس وقت میں مشہود صاحب' چمن بہت تکلیف سے گزر رہے ہیں۔ آپ کچھ خیال نہ کیجیے گا۔۔۔۔۔ اپنا خیال رکھیے اور نینا کو کہیے گا کہ ماہ پارہ اور مہوش بہت جلد اُسے ملنے آئیں گی۔ اللہ حافظ۔۔۔۔۔''
عطیہ بیگم نے ڈاکٹر علی عثمان کی طرف سے ایک محسوس ہونے والی خاموشی کو بات ختم کرنے کا اشارہ سمجھا تھا اور قدرے شرمندہ سی ہوگئیں تھیں جیسے وہ اپنی طرف سے بات کیے جارہی ہیں پتہ نہیں ڈاکٹر علی عثمان اتنی تفصیل سے باتیں سننے کے موڈ میں ہیں بھی یا نہیں۔۔۔۔ اسپتال میں ہیں تو آس پاس مریض بھی ہوں گے اور وہ اُن کو اپنے دکھڑے سنانے بیٹھ گئیں۔
ڈاکٹر علی عثمان رابطہ منقطع ہو جانے کے بعد بھی اپنی جگہ پر یوں بیٹھے تھے جیسے سارے کام ختم ہوگئے ہوں اور دور تک فرصتیں ہی فرصتیں۔۔۔۔ وہ ملامتیں جو گاہے گاہے انہیں گھیر لیتی تھیں۔۔۔۔ اب منہ چھپا کر بیٹھ گئی تھیں۔۔۔۔ چمن اچانک ہی اُن کے بہت قریب آ گئی تھی۔

☆۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔☆

''آپ کہیں تو کسی کو Donate کر کے آجاؤں۔۔۔۔'' ارسلان فون پر باپ سے بڑے آف موڈ میں بات کر رہا تھا۔
''اب وہ کھنڈر بھی نہیں ہے جس کے ریٹ نہیں لگ رہے۔ تو تم نے دو لاکھ تو اُس کی Maintenance پر لگا دیے ہیں ابھی بھی دام نہیں لگ رہے۔۔۔۔'' سلمان علی بیٹے پر برس پڑے کیونکہ

بہت ہوگئی تھی۔

اور اِدھر امریکہ میں جمے جمائے کاروبار پر اُس کی غیر حاضری سے بہت برا اثر پڑ رہا تھا۔ اُن کے اپنے کام اتنے تھے کہ ارسلان کے حصے کے کام نمٹانے کے قابل نہیں تھے اور اُن کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ اُس پرانے گھر کے زیادہ سے زیادہ کتنے مل سکتے ہیں جو بھی مل رہے ہیں اُن کے حساب سے تو وہ غنیمت تھے۔

''پاپا.....Seventy Five لگ چکے ہیں لیکن یہ Ten ملین میں جا سکتا ہے۔'' ارسلان سمجھانے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''جس کو تین ملین مل رہے ہوں گے وہ پراپرٹی اِس قابل بھی ہوگی۔'' سلمان علی اب جھنجلا کر گویا ہوئے۔ وہ اِس وقت صرف یہ سننا چاہ رہے تھے کہ ارسلان واپس کب آ رہا ہے۔

''نہیں پاپا لوکیشن کی بھی بات ہوتی ہے ہماری پراپرٹی کمرشل ایریا سے لنک کرتی ہے..... اس کے تو بیس ملین بھی آرام سے مل سکتے ہیں۔'' ارسلان نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا تھا تاکہ بیس ملین کا سن کر والد صاحب آرام سے بیٹھ جائیں۔

''ہاں ہوائی قلعہ بناتے رہو۔ (To Build Casstles In The Air)'' ارسلان نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

''خرچ کرو اللہ اور دے گا۔ (Spent And God Will Send)''

''Stupid......'' سلمان علی نے گرج کر کہا اور فوراً ہی خود کو سنبھال لیا کیونکہ اُن کی گوٹ پھنسی ہوئی تھی اور بیٹا بھی پاکستان جا کر بیٹھ گیا تھا۔

''بہرحال جتنے میں بھی پراپرٹی سیل ہو Twenty Five پرسنٹ ندا کو دے کر آنا..... میری مرحومہ بہن کا شیئر اتنا تو بنتا ہے۔'' انہوں نے ارسلان کو تاکید کے ضمن میں کہا۔

''میں احمق نہیں ہوں پاپا کہ میں اتنا ہیوی اماؤنٹ اُس کے ہینڈ اوور کر دوں۔''

''جس کا رائٹ ہوتا ہے دے دینا چاہیے ہماری طرف سے وہ اسے سمندر میں بہا دے.....'' سلمان علی نے اب ڈانٹنے کے انداز میں ارسلان کو تاکید کی تھی۔

''پاپا Try To Understand یہ اماؤنٹ ندا کو نہیں ملے گا اس کے ہزبینڈ کے اکاؤنٹ میں چلا جائے گا۔'' ارسلان نے اپنی طرف سے بہت عقلمندی کی بات سمجھانے کی کوشش کی تھی اور ایک ایک لفظ پر زور لگایا تھا کہ سلمان علی اُس کو شاباش دیں گے واہ...... کہ وہ کتنے دور کی کوڑی لے کر آیا ہے۔''

''Then Why You Are Worried'' سلمان علی نے سابقہ انداز میں خفگی کا اظہار کیا۔

''پاپا کسی ٹائم اُس کے ہزبینڈ نے اُسے ڈیورس کر دیا......''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ ندا کی شادی ہوگئی ہے۔ اب وہ اپنے اچھے برے کی خود ذمہ دار ہے تم واچ مین بن کر وہاں مت بیٹھو۔ کام نمٹاؤ اور فوراً واپس آؤ...... مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آخر تمہیں ہوا کیا ہے۔ تمہیں شادی شدہ ندا کی اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے۔ جب لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ اپنے تمام معاملات کی خود ذمہ دار ہوتی ہے میرا تمہارا کوئی Concerend نہیں بنتا تمہیں اپنا ٹائم فضول میں ضائع کرنے کی

کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں پھر کہہ رہا ہوں پراپرٹی کے جتنے پیسے مل رہے ہیں پکڑلو ندا کو حصہ دو اور باقی ڈالر میں Convert کر کے U.S بھجوا دو اور خود بھی فوراً چلے آؤ۔'' یہ کہہ کر سلمان علی نے اپنی طرف سے فون بند کر دیا تھا۔

''پاپا اتنی دور بیٹھے ہیں اور ندا کے ہزبینڈ سے ملے بھی نہیں ہیں...... ورنہ وہ میری بات سے اتفاق کرتے کہ یہ بندہ بالکل بھی Reliable نہیں ہے۔ مجھے تو شک نہیں ہے بلکہ پورا یقین ہے کہ ثمر نے پراپرٹی کے چکر میں ندا سے شادی کی ہے...... جہاں اتنے دن گزر گئے وہاں دو چار دن اور سہی...... پاپا کو پتہ نہیں کیا جلدی ہو رہی ہے دو چار ہزار ڈالر اور مل جائیں گے تو کیا برا ہے۔'' وہ خود کلامی کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

کوئی ذہین عورت اُس کی شیطانی ذہانت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ذہین عورت سے اپنے کردار کی منفی خصوصیات چھپانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔

ندا جیسی بے وقوف لڑکیاں تو ڈھونڈے سے نہیں ملتیں...... آخر وہ کب تک بے تھے بیل کی طرح گھومتا پھرے گا۔

اُس کی بھی تو کوئی Proper Family Life ہونا چاہیے۔

دونوں بیویاں طلاق لینے کے بعد اپنے 'سرکل' میں کہتی پھر رہی تھیں کہ اگر وہ طلاق حاصل نہ کرتیں تو خودکشی کر لیتیں اب وہاں اتنی آسانی سے تو بیوی نہیں مل سکتی تھی اور ایسی ویسی...... 'مزدور ٹائپ' کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔

بیوی کے لیے اس کے خیالات ہمیشہ سے بہت بلند تھے کسی Tax Payer کی بیٹی سے کم وہ سوچتا بھی نہیں تھا۔

ندا...... کو تو بے وقوف بنانے کی بھی ضرورت نہیں وہ تو بنی بنائی بے وقوف ہے...... وہ کچھ حسین خواب دیکھ رہا تھا۔

''ویسے تو میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ چمن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مشکل ہے کہ وہ گھر سے نکلے لیکن تم سے کہہ رہی ہوں بچیوں کو لے کر چلی جانا تمہاری اپنی طبیعت بھی بہل جائے گی۔'' عطیہ بیگم بڑے شفیق لہجے میں بولتے ہوئے چمن کے سر پر ہاتھ بھی پھیر رہی تھیں۔ اس وقت اولاد کی محبت میں تمام مصلحتیں...... نزاکتیں ضابطے بھلا بیٹھی تھیں۔

چمن نے بڑی اُداس سی مسکراہٹ ماں کی سمت روانہ کی۔ وہ اُسی کی طرف دیکھ رہی تھیں لیکن یہ مسکراہٹ اُن کو خوشی بخشنے والی نہیں تھی۔

اُداس مسکراہٹ کو ماں سے زیادہ کوئی نہیں محسوس کر سکتا۔ اُسے ماں کی معصومیت پر پیار آ رہا تھا کہ امی کو یہ بھی خیال نہیں رہا کہ طلاق کے کاغذات ملتے ہی اُس کی عدت شروع ہو چکی ہے...... امی یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا اُن سے کوئی کمٹمنٹ کوئی وعدہ نہیں کیا۔

اب آپ مجھے بتایئے میں ڈاکٹر علی کے گھر کیسے جا سکتی ہوں...... ذرا غور کیجیے چمن نے اپنے روتے ہوئے دل کو بمشکل دل کو بہلاتے ہوئے بڑے عام سے انداز میں ماں سے بات کی...... کوشش کی تھی کہ

لہجے سے کچھ جھلکنے نا پائے۔

''کیوں...... جیسے پہلے چلی جاتیں تھیں بیٹا...... اب کیا ہوا ہے......'' عطیہ بیگم واقعی اب حیران ہوگئیں۔

''امی پتہ ہے کیا جو میرے ساتھ ہوا ہے نا وہ ہر تیسری عورت کے ساتھ نہیں ہوتا ہزاروں عورتوں میں کسی ایک کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے شاید آپ کو خیال نہیں رہا......''

''کس بات کا خیال نہیں رہا بیٹا!'' عطیہ بیگم بڑے تعجب کے ساتھ اُسے دیکھ رہی تھیں۔

''امی مجھے طلاق ہوئی ہے اور میری عدت شروع ہوگئی ہے۔ عدت میں عورت گھر سے باہر نہیں جاتی غیر محرموں سے نہیں ملتی...... آپ اتنی اہم بات بھول رہی ہیں۔'' اب چمن کو کھل کر کہنا پڑا۔ اور یہ سنتے ہی عطیہ بیگم نے اپنے سر پر زور سے ہاتھ مارا تھا۔

''ارے کہاں گئی میری عقل لگتا ہے اوسان گنوا بیٹھی ہوں۔ بتاؤ جو بات بیٹی مجھے بتا رہی ہے۔ وہ بات مجھے بیٹی کو بتانا چاہیے...... شاباش ہے تم پر کہ تم کتنی ہمت سے حالات کا مقابلہ کر رہی ہو خود کو سنبھالے ہوئے ہو۔ اللہ تمہاری عقل اور ہوش وحواس کو قائم رکھے...... معاف کردو بیٹی......'' عطیہ بیگم کی آواز بولتے ہوئے بھرانے لگی۔

چمن ایک دم ماں سے لپٹ گئی......

''ارے نہیں امی آپ نے کون سی غلط بات کی ہے آپ...... آپ تو میری خوشی چاہتی ہیں ہر وقت میری خوشی کے لیے سوچتی ہیں...... نہیں خیال رہا اور خیال کیسے ہوتا اتنے دن سے تو آپ کے پاس آکر بیٹھی ہوئی ہوں آپ کو بھی بس یہی لگتا ہوگا کہ یہ تو ہمیشہ سے یہیں رہ رہی ہے بھول گئی ہوں گی کہ کبھی میری شادی بھی ہوئی ہوگی۔''

عطیہ بیگم یہ سنتے ہی بلک بلک کر رونے لگیں چمن اب اپنے آنسو روک کر ماں کے آنسو پونچھنے لگی۔

''امی ایسے نا کریں ایسے مت روئیں اب ختم ہی ہوجائے یہ رونا دھونا آخر ہم کب تک روتے رہیں گے...... ہمیں رُلانے والے تو ہمیں بھول ہی چکے اور ہم ہیں کہ روئے چلے جارہے ہیں۔''

بولتے ہوئے چمن کا کلیجہ پھٹ رہا تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھا ہوا تھا۔ اس لیے کہ ماں کو سنبھالنا تھا...... ماں جس عمر میں پہنچ گئی تھی اب اُس کا خیال بچوں کی طرح رکھنا تھا۔ یہ عمر وہ ہوتی ہے جب بچے ماں باپ کو بچوں کی طرح سنبھالتے ہیں۔

''ہاں بیٹا میں بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ اب یہ رونا دھونا ختم ہوجانا چاہیے۔ میں تڑپ تڑپ کر تمہاری خوشیوں کے لیے دعا کر رہی ہوں...... اللہ کرے ساتھ خیریت کے یہ چار مہینے گزر جائیں...... اور میں تمہاری خوشیوں کے لیے کچھ کروں۔ تمہیں اپنے گھر میں ہنستا بستا دیکھوں۔ چمن ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ جانے وہ کس گھر کی بات کر رہی ہیں۔

☆......☆......☆

شام ڈھل گئی تھی رات سر پر آکھڑی ہوئی تھی ثمر جانے کب گھر سے نکل گیا تھا وہ تو بس کمرے میں جا کر لیٹی تھوڑی دیر کڑھتی رہی پھر نا جانے کیسے نیند آگئی...... آنکھ کھلی تو گھبرا کر باہر آئی تھی اور پھیلی ہوئی

رات دیکھ کر حیران پریشان سوچ رہی تھی۔ وہ کیسے اتنی دیر تک سوئی رہی۔
ثمر نے بھی اُسے نہیں جگایا..... نیند کا بادل ذہن سے اڑا تو فوراً یادداشت نے کام کرنا شروع کر دیا۔
اتنی تو..... تو..... آپ..... آپ ہوئی تھی ظاہر ہے ناراضگی تو شو کریں گے نا..... لیکن مجھے کیا ضرورت ہے کہ پیچھے پیچھے پھر کر مناتی پھروں..... حد ہوتی ہے بات بات پر چلانے لگتے ہیں بات بات پر موڈ آف ہو جاتا ہے۔
''میں نے کیا کیا ہے.....'' ندا نے اپنی خطا ڈھونڈنا شروع کی تو دور دور تک نام ونشان نا ملا بلکہ یوں لگا کہ خطا کے نام سے بھی واقف نا ہو اس نے کبھی غلطی ہی نہ کی ہو..... کڑھ کڑھ کر بس ثمر کے چیخنے چلانے کو یاد کر رہی تھی۔ ادھر اُدھر ٹہل کر تھک کر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔
خیال آیا کہ ثمر کو فون کر کے پوچھنا چاہیے کہ وہ کہاں ہے اور کب تک آئے گا اور جب بھی آئے اُس کے لیے کھانے کے لیے کچھ لیتا آئے۔ اُس کا بالکل بھی موڈ نہیں کہ وہ کچن میں جائے اور اپنے لیے کھانے پینے کا کچھ انتظام کرے۔
یہ سوچ کر وہ بادل نخواستہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے کمرے میں آ کر سیل فون اٹھایا اور ثمر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ نمبر ڈائل کر کے سیل کان سے لگایا تو دل دھک دھک کرنے لگا کہ جانے دوسری طرف سے کس انداز میں بات ہوگی..... رنگ پاس ہو رہی تھی مگر کال اٹینڈ نہیں ہو رہی تھی شاید بزی ہوں۔ شاید راستے میں ہوں شاید کال سائلینٹ پر ہو۔
اب وہ اندازوں سے کھیلنے لگی۔ ریکارڈنگ شروع ہوگئی تھی۔ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا برائے مہربانی دوبارہ کوشش کیجیے.....
تھوڑی دیر بعد..... اب اُس میں اتنا صبر کہاں تھا اُس نے ری ڈائل کر دیا اور منتظر ہوگئی کہ شاید کال ..... ریسو ہو جائے مگر..... کال اس مرتبہ بھی ریسو نہ ہوئی اور ریکارڈنگ چلنا شروع ہوگئی۔ اُس نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے سیل پٹخنے کے انداز میں بیڈ پر رکھ دیا۔
''ہونہہ..... پتہ ہے مجھے ظاہر کر رہے ہیں کہ مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ واہ بھئی واہ اتنا سارا چیخنے چلانے کے بعد بھی ناراض ہیں۔ ایسا کیا کہہ دیا بھئی میں نے..... چلو آئیں گے تو گھر میں ہی نا اُس نے اپنے دل کو بہر حال تسلی دی اور کچن میں چلی آئی۔ باہر کے کھانے کی امید تو دم توڑ گئی تھی۔
اب اُس نے فریج کھول کر جھانکنا شروع کیا کہ شاید کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے گزارہ ہو جائے۔
ابھی وہ دیکھ ہی رہی تھی کہ کال بیل کی آواز گھر میں گونجنے لگی۔
اور وہ بھی اس طرح کے جیسے کوئی کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ کر بھول گیا ہو۔ ثمر کے پاس تو گیٹ کی چابی ہوتی ہے وہ کال بیل رنگ نہیں کر سکتے وہ اُلجھی ہوئی کچن سے باہر آئی تھی۔
کال بیل کی رنگ پورے گھر میں یوں گونج رہی تھی جیسے کسی نے ارادتاً کوئی کال بیل والی سی ڈی پلیئر پر چڑھا دی ہو.....
''یا اللہ کیا مصیبت ہے کیا سمجھا ہے..... کیا بہرے رہتے ہیں اس گھر میں.....''
موڈ تو پہلے ہی خراب تھا کال بیل کی آواز سے یوں لگا جیسے کوئی جلتی ہوئی سلاخیں کانوں میں گھسا رہا

ہو...... وہ پاؤں پٹختی ہوئی گیٹ تک آئی تھی اور بغیر کسی تکلف کے ہر مصلحت بالائے طاق رکھ کے وہ زور سے چلائی تھی۔

''کون ہیں آپ؟ مسئلہ کیا ہے آپ کو...... اتنی بھی تمیز نہیں ہے کال بیل کیسے دیتے ہیں ثمر نہیں ہے گھر پر......'' یہ کہہ کر اُس نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ اب کال بیل کی رنگ بند ہو جائے گی لیکن اُس کی حیرت کی انتہا نا رہی کہ کال بیل ابھی بھی بند نہیں ہوئی تھی۔

اُس نے دانت پیستے ہوئے بڑے جھٹکے سے گیٹ کھولا تھا اور گیٹ کھولتے ہی ہکا بکا سی ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ ارسلان کی آنکھیں بند تھیں اور اُس نے انگوٹھا بٹن پر رکھا ہوا تھا۔

''کیا مسئلہ ہے بھئی آپ کو کسی کے گھر کی تمیز نہیں ہے آپ کو۔'' بالآخر وہ پھٹ پڑی۔ اسی کی وجہ سے تو لڑائی جھگڑا ہوا تھا اور ثمر گھر سے نکل گئے اب یہ پھر آ گئے۔

ارسلان نے ندا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بڑی بے تکلفی سے اندر داخل ہو کر گیٹ بند کر دیا۔

''کیا راستہ بھول گئے ہیں اس وقت آپ کو اپنے گھر میں ہونا چاہیے تھا آپ کو پتہ بھی ہے کہ ثمر کو آپ کا آنا جانا بالکل پسند نہیں ہے...... آپ کی وجہ سے ہماری لڑائی ہوئی ہے۔''

''میری وجہ سے......'' ارسلان نے نیم وا آنکھوں سے ندا کی طرف دیکھا۔

''اتنی ساری سگریٹیں جو پھونک کر گئے تھے میں نے تو دیکھی بھی نہیں تھیں کہ آپ ایش ٹرے ٹکڑوں سے بھر کر چلے گئے ہیں...... ثمر نے پوچھا یہ سگریٹیں کس نے پی ہیں اتنی ساری میں نے بتا دیا ظاہر ہے جھوٹ کیوں بولوں گی...... اور مجھے ضرورت کیا ہے جھوٹ بولنے کی......''

''تم نے بہت اچھا کیا...... مجھے تو سچ بولنے والے لوگ ویسے ہی بہت پسند ہیں۔''

ارسلان نے مسکرا کر ندا کی طرف دیکھا۔ ندا کو ماحول میں عجیب سی بو محسوس ہوئی۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ کر ارسلان کی طرف دیکھا اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سمجھ گئی کہ اس وقت وہ نشے میں ہے......

''آپ اِس حال میں میرے گھر پر آئے ہیں ثمر گھر پر نہیں ہیں مطلب کہ وہ کسی بھی وقت آ سکتے ہیں اگر انہوں نے تمہیں اِس حال میں دیکھ لیا......''

''اُف خدایا جو قیامت برپا ہوگی اُس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے' خدا کے واسطے ارسلان بھائی آپ چلے جائیں اس وقت تو چلے جائیں...... کل فون کر کے آ جایئے گا تاکہ میں ثمر کو بتا دوں کہ آپ آ رہے ہیں اور جو ٹائم میں آپ کو دوں اُس ٹائم میں آیئے گا......''

ندا اپنی دھن میں بولے چلی جا رہی تھی کیونکہ وہ بہت زیادہ پریشان ہوگئی تھی اُس کو یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ اِس وقت اُس کے سامنے مدہوش بندہ کھڑا ہے۔ اور وہ اتنی لمبی تقریر کر رہی ہے...... جب اسے ہوش آئے گا تو اِسے یاد بھی نہیں ہوگا کہ اس سے کیا باتیں کی گئی تھیں۔

ارسلان نے ندا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ندا کو ہاتھ سے ایک طرف کرتے ہوئے آگے بڑھا

''میں کہہ رہی ہوں آپ اندر نہیں جا سکتے...... آپ اپنے گھر جائیں۔''

''ہٹو ایک طرف کسی کا باپ بھی مجھے اندر آنے سے نہیں روک سکتا......'' ندا ٹوکتے ٹوکتے اندر آ کھڑی ہوئی تھی ارسلان نے پوری قوت سے اُسے دھکا دیتے ہوئے کہا تھا۔

''ارسلان بھائی آپ کو اِس طرح نہیں کرنا چاہیے...... میں ایک شادی شدہ عورت ہوں آپ کو خیال کرنا چاہیے......''

''ارے ختم کرو اس شادی کو......'' ارسلان نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں اُسے مفت کے مشورے سے نوازا۔

ندا آنکھیں پھاڑ کر اُس کی طرف دیکھنے لگی کیونکہ کسی نشے میں دھت بندے سے بات چیت کرنے کا شاید پہلا موقع تھا۔ گھر میں اُس نے مدہوش حالت میں اُسے دیکھا تو تھا لیکن لمبی چوڑی بات ہو نہیں پائی تھی۔

''تم بور نہیں ہوتی اُس ڈفر کے ساتھ......'' ارسلان چلتے چلتے بڑبڑانے کے انداز میں گویا ہوا...... ندا اُس کے پیچھے دوڑی......

''آپ سے تو لاکھ درجے اچھے ہیں۔ میں کہہ رہی ہوں آپ چلے جائیں یہاں سے ثمر گھر پر نہیں ہیں وہ آ گئے تو بہت برا ہوگا آپ کے ساتھ بھی اور میرے ساتھ بھی......''

''تم کیوں ڈر رہی ہو میں ہوں نا...... میرے ہوتے ہوئے تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں...... یہ خود غرض شخص اُس وقت تک اچھا ہے جب تک لاکھوں کا چیک اُس کے ہاتھ نہیں آجاتا...... ہونہہ...... ایک Salaied شخص جو سالوں میں لاکھ کی شکل دیکھتا ہے۔'' ارسلان نے استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے قدم آگے بڑھائے......

''مگر میں تو خوش ہوں ندا بھی باز نہیں آئی تھی۔ اب اُس کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے بول رہی تھی۔

''جھوٹ بولتی ہو تمہاری شکل پر لکھا ہوا ہے کہ تم خوش نہیں ہو۔'' ارسلان نے ہوا میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

''پلیز آپ میری شکل پڑھنے یہاں نا آیا کریں۔ پتہ نہیں کب گھر سیل ہوگا کب آپ واپس جائیں گے۔'' ندا نے اب اپنے دونوں ہاتھ سر پر دے مارے تھے۔ سونے کی اینٹیں لگوا دیں تاکہ ورلڈ بینک خریدنے کو تیار ہو جائے...... وہ باقاعدہ اب چلا کر بولی تھی۔

اُس کا خیال تھا کہ شاید چلا کر بولنے سے ارسلان پر اُس کا کچھ اثر ہوگا۔ مگر ارسلان کی ڈھٹائی پر تو شاید تمام عظیم ترین ڈھیٹ لوگ اِس وقت رشک کر رہے تھے۔

مسکرا کر لڑکھڑاتے ہوئے قدم سنبھالے اور مسکرا کر پیار بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ پہلے مجھے جلدی تھی اب نہیں ہے۔ زندگی بہت خوبصورت ہوگئی ہے۔ تو جائیں اپنے گھر میں میرا دماغ کیوں خراب کر رہے ہیں جائیں اپنے گھر جا کر خوبصورت زندگی گزاریں ندا کو سمجھ ہی نا آئی کہ اب وہ اس کے جواب میں بولے کیا۔

ظاہر ہے اب اُس نے اُسے گھر جانے کے لیے ہی کہنا تھا۔ اور صورتحال یہ تھی کہ اب ثمر کے گھر لوٹ آنے کا خوف اُس کے دماغ کو سن کیے دے رہا تھا۔

ارسلان لاؤنج میں داخل ہونے کے بعد صوفے پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں منہ کھلا ہوا تھا یعنی مسلسل بولنے پر تُلا ہوا تھا۔ ندا دونوں ہاتھ کمر پر ہاتھ کر اُس کی طرف گھورنے لگی۔ جیسے ہاتھ بڑھا کر

اُس کا گلا ہی دبوچ لے گی۔
''جن دنوں میں روم..... تمہیں پتہ ہے نا روم کہاں ہے..... یوں سمجھو کے میں اٹلی میں تھا۔'' وہ ندا کو سمجھانے لگا۔
پتہ نہیں کیا بتانے جارہا تھا۔ ندا دانت پیستی اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
''وہاں ہم ایک پاکستانی اسکالر سے پوچھتے تھے کہ وہ ہمیں Wisdom Of The East کے بارے میں ہمیں بتائیں.....
وہ بتاتے تو تھے بڑی Detail سے مگر سب کچھ ہمارے سر سے گزر جاتا تھا۔'' یہ کہہ کر ارسلان رُکا اُسے دو تین ہچکیاں آئیں سلسلہ کام خود ہی منقطع ہو گیا تھا۔
ہچکیوں کے ساتھ ہی ندا نے وہ بُو پھر سے محسوس کی جس کی طرف سے اُس کا ذہن بٹ چکا تھا۔ اور ثمر کے آنے کا خوف حاوی ہو چکا تھا۔ ہچکی رُکتے ہی ارسلان پھر شروع ہو گیا۔ اور اپنا ہاتھ بڑے نفرت انگیز انداز میں جھٹک کر بولا۔
''Go Hell With Wisdom Of The East..... پھر ذرا سی آنکھیں کھول کر ندا کی طرف دیکھا اور بڑے رومانٹک انداز میں گویا ہوا۔
''یہاں آ کر تو Beauty Of The East دیکھ کر پاگل ہو گئے ہیں۔ پھر بڑے نفرت بھرے لہجے میں ثمر پر لعن طعن کی۔
یہ شخص Deserve ہی نہیں کرتا ضائع ہو رہی ہو تم.....'' ندا ارسلان کی باتوں سے اِس بری طرح تپ رہی تھی کہ ایک طرح سے اُس کے ہوش و حواس اُس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا چیز اٹھائے اور ارسلان کے سر پر دے مارے۔
اِس سے قبل کے وہ کچھ بولتی اُسے عقب سے ثمر کی آواز سنائی دی۔
''نکل جاؤ اِسی وقت اپنے اِس کزن کے ساتھ.....'' اُس نے آگے بڑھ کر ندا کا بازو دبوچا اور پھر زور سے جھٹکا دے کر چھوڑ دیا..... ندا کو تو بس ایسا لگا جیسے اُس کی روح پرواز کر رہی ہے اور یہ اُس کی زندگی کے آخری لمحات چل رہے ہیں۔
ثمر کے اِس انداز کا ارسلان پر تو مطلق اثر نا ہوا وہ تو سینے پر نماز کے انداز میں دونوں ہاتھ باندھ کر یوں پُرسکون انداز میں لیٹا ہوا تھا جیسے زرخیز نخلستان میں بانسری کی مدھر دھن گونج رہی ہو۔
''جو عورت اپنے گھر میں نامحرم مرد کو بٹھا کر اُس کی خرافات سن رہی ہو اور اتنی کمزور ہو کہ اُسے دھکے دے کر گھر سے نا نکال سکے تو وہ لائف پارٹنر نہیں اللہ کا عذاب ہے۔''
ثمر زور سے دھاڑا تھا۔ ثمر کی دھاڑ سن کر ارسلان نے چند ثانیے کے لیے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں تھیں۔
''ثمر خدا کے لیے میری بات تو سنیے۔'' ندا بدحواس ہو کر اُس کے قریب آئی اور اُس کا بازو پکڑ لیا۔
''پہلے تم کسی مناسب جگہ بیٹھ کر اِس ٹام بوائے کی خرافات پوری تسلی سے سن لو۔''
ارسلان نے گویا ثمر کے اس جملے پر خصوصی توجہ دی تھی کیونکہ اُس نے اِس جملے کے بعد جواب ارشاد

فرمایا تھا۔
''دیکھ لیا تم نے کتنی محبت کرتا ہے یہ شخص تم سے ندا اپنے بال نوچنے لگی آپ جائیں۔''
''آگ لگا رہے ہیں آپ میری زندگی میں......'' ثمر وہیں کھڑے کھڑے گویا ہوا۔
''آگ لگ چکی نہیں چاہیے مجھے ایسی کمزور عورت جسے اپنی عزت و وقار سے زیادہ رشتہ داریاں عزیز ہوں' نکل جاؤ۔''
''ثمر آپ اس طرح میرے ساتھ نہیں کر سکتے......آپ کو کیا پتہ کہ میں ان کو اس گھر سے بھگانے کے لیے اتنی دیر سے کوشش کر رہی ہوں۔اب دیکھیں ان کی حالت یہ کس حال میں ہیں۔میں تو چاہتی ہی نہیں تھی کہ یہ اندر آئیں زبردستی اندر آ گئے۔''
''تم نے گیٹ کھولا ہوگا تو یہ اندر آیا ہوگا۔''
''تو میں کیا کرتی کال بیل بج رہی تھی اور میں پوچھ رہی تھی کون ہے کون ہے تو مجھے سمجھ ہی نہیں آئی تو میں نے کہا گیٹ کھول کر دیکھتی ہوں کون ہے جو مسلسل بیل رنگ کیے جا رہا ہے۔'' ندا نے اپنی دانست میں بہترین صفائی پیش کی تھی جسے سن کر ثمر مزید ہتھے سے اُکھڑ گیا۔
''بے وقوف لڑکی اگر کوئی کال بیل بجانے کے بعد جواب نہیں دے رہا پھر تو اور احتیاط کرنی چاہیے۔ گیٹ کھولنا ہی نہیں چاہیے۔گیٹ کنفرمیشن کے بعد کھولتے ہیں۔اتنی احمق ہو تم میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔تمہارے ساتھ رہتے ہوئے میں ذہنی مریض بن جاؤں گا بلکہ لگتا ہے میں ٹوٹلی پاگل ہو جاؤں گا۔ کپڑے پھاڑ کر سڑکوں پر پھروں گا......اور اس سے پہلے کہ میری یہ حالت ہو......تم نکل جاؤ یہاں سے چلی جاؤ۔'' ندا نے کہا۔
''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔''
ثمر اُس کا ہاتھ کھینچتا ہوا گیٹ تک لے گیا تھا۔
''پہلے تم نکلو پھر میں اسے دیکھتا ہوں کہ اِسے زندہ نکالوں یا مردہ......''
''نہیں نہیں آپ یہ نہ کریں اس وقت آپ ہوش سے کام لیں......کیا ہو گیا ہے آپ کو اُس عورت کو طلاق دینے کے بعد آپ کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں شاید بہت مس کر رہے ہیں آپ اُسے......جس طرح سے آپ مجھ سے بات کرتے ہیں نا تو صاف محسوس ہو رہا ہوتا ہے اب آپ کو مجھ سے محبت نہیں شدید نفرت ہو گئی ہے۔اس کی وجہ شاید یہی ہوگی کیونکہ میرے کہنے پر آپ نے اُس عورت کو طلاق دی ہے کیونکہ اگر آپ کو طلاق دینا ہی تھی تو آپ میرے کہنے کا کیوں انتظار کر رہے تھے پہلے ہی دے دیتے اب طلاق دی ہے تو پچھتا رہے ہیں...... مجھے دھکے مار کر گھر سے نکال رہے ہیں۔'' اب ندا کی بھی بس ہو گئی اور اِس سے زیادہ اُس کے پاس گنجائش ہو ہی نہیں سکتی تھی۔
اتنی باتیں تو اُس نے نا کبھی سنیں تھیں اور نا کبھی برداشت کیں تھیں۔ مصلحتوں اور موقع کی نزاکتوں کا احساس تو اُس کے خمیر میں ہی نہیں تھا۔ سامنے والا کچھ کہتا تو جواب دینا اُس کا فرض بن جاتا تھا۔اُس کی تربیت اِس انداز میں ہوئی اُسے اِس بات پر آج تک ٹوکا ہی نہیں گیا تھا۔اور اگر کبھی کسی کو ٹوکا ہی نہ جائے تو وہ اپنے آپ کو درست سمجھتا ہے۔

اُس نے سوچا ارسلان پر تو اس وقت کوئی بات کارگر نہیں ہوسکتی لیکن ثمر جو اُس کی اتنی بے عزتی کر رہا ہے کم از کم اُس کے سامنے تو حساب کتاب بے باق کر لیے جائیں۔

ثمر سکتے کی کیفیت میں ندا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اِس سے پہلے جو کچھ ندا بولتی جارہی تھی وہ اُس کا جواب دیے جارہا تھا۔ لیکن اب جو کچھ ندا نے کہا تھا۔

اُس کے بعد جیسے اُس کے الفاظ گم ہوگئے تھے اُس کی ذہنی حالت اتنی مخدوش ہوگئی تھی کہ وہ کوئی انتہائی قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔ وہ خود کو کنٹرول کرنے کے لیے خود کو پتھر بنانے کی کوشش کررہا تھا تاکہ وہ یہاں گڑ جائے یہاں سے ہلے نہیں......

اب اُسے اپنے آپ سے خوف آنے لگا تھا کہ آج کوئی بڑا کام کرسکتا ہے۔ لیکن کچھ بھی سہی اتنی عقل اور سمجھ تو رکھتا تھا کہ یہ وقتی بڑا اقدام اُسے کن راستوں سے گزار کر کس منزل پر پہنچائے گا...... اُس نے گہرے گہرے دو تین سانس لیے اور پھر ندا کو بازو سے پکڑا اور بالکل اُس جانور کی طرح گھسیٹتا ہوا گیٹ کی جانب بڑھا۔ جس کو مالک پہلے پیار سے چلانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اُسے چابک مارتا ہوا گھسیٹتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔

ثمر کے جذبات کی شدت میں اتنی قوت تھی کہ ندا جیسی کمزور لڑکی اُس قوت کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ یہ وہ قوت تھی جس قوت کو استعمال کرلینے کے بعد انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پچھتاوؤں میں گھر کر زندگی بھر کے لیے پچھتاوؤں اور کمزوری کی تصویر بن جایا کرتے ہیں اور آخری سانس تک یہی سوچتے رہتے ہیں کہ آخر اتنا انتہائی قدم اٹھانے کی ضرورت کیا تھی۔

اُس کے سر پر خون سوار تھا اور وہ خون کرنا نہیں چاہتا تھا...... اُس کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ ندا اُس کے سامنے سے ہٹ جائے اِس گھر میں نظر نہ آئے...... اُس نے ندا کو گیٹ سے باہر کر کے گیٹ کو اندر سے بند کیا اور دوڑتا ہوا اندر آیا۔

پہلے تو اُس نے تابڑ توڑ دو تین تھپڑ جما کر ارسلان کے منہ پر رسید کیے...... پھر اُسے گریبان سے گھسیٹ کر کھڑا کیا۔ ارسلان کھڑا ہوا تو ثمر کو اندازہ ہوا کہ وہ کس حال میں ہے۔

''اوہ میرے خدایا......!'' اُس کے منہ سے الفاظ تو نہیں نکلے لیکن دل میں وہ واقعی عظیم حیرت سے دوچار ہوا تھا۔

''یہ شخص اِس حال میں میرے گھر میں میری بیوی سے بات کررہا تھا...... جانے کب سے آیا بیٹھا تھا......'' اِس خیال کے آتے ہی اُس نے ارسلان کو بازو سے پکڑا اور اُسے انتہائی بے دردی سے گھسیٹتا ہوا باہر کی طرف چلا۔

''ارے یہ کیا بدتمیزی ہے تم مجھے اِس طرح سے کیوں گھسیٹ رہے ہو......'' ارسلان نے ثمر کو ٹوک دیا۔

''دکھاتا ہوں میں تمہیں تمیز......''

ارسلان اِس کمزوری کی کیفیت میں ثمر کی شدتوں کا مقابلہ کرنے کی استطاعت ہی نہیں رکھتا تھا۔ یوں جیسے ہوا میں کاغذ اڑا جارہا ہو...... ثمر کے ساتھ گھسٹتا چلا جارہا تھا۔

ندا اور ارسلان کو گھر سے نکالنے کے بعد وہ کافی دیر تک پاگلوں کے انداز میں گھر میں اِدھر سے اُدھر گھومتا رہا کیونکہ اب اُسے بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اُسے کیا کرنا چاہیے اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کا بی پی شوٹ کر رہا ہے۔

کانوں کے پردوں پر دھمک سی پڑ رہی تھی۔ وہ بانو آپا کے کمرے میں جا کر اُن کی میڈیسن میں Tranquilizer تلاش کرنے لگا۔ جو اُسے جلد ہی مل گئی۔

Tranquilizer کی ٹیبلیٹ لے کر وہ کچن میں آیا ٹھنڈا یخ پانی گلاس میں ڈالا اور Tranquilizer کھا کر لاؤنج میں آ گیا۔

بڑا سا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ تقریباً 80 فیصد گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وحشت بال کھولے ناچ رہی ہو...... وہ خاصی دیر ٹیک لگائے بیٹھا رہا پھر وہیں صوفے پر لیٹ گیا۔ چند لمحے چت لیٹا چھت کی طرف تکتا رہا اور پھر اُس کو ہوش نا رہا...... جانے کس وقت گہری نیند نے اُسے آ لیا تھا۔

''صبح نو بجے کے لگ بھگ کال بیل سے اُس کی آنکھ کھلی تھی اُس نے ہڑ بڑا کر اِدھر اُدھر دیکھا اپنی حالت زار کا جائزہ لیا اور چند لمحے گہری سوچ میں کھویا رہا۔

پھر اُسے سب کچھ یاد آ گیا...... نیند پوری ہونے کے بعد اب ذہنی حالت کافی بہتر تھی۔

اُس نے جا کر گیٹ کھولا سامنے صفائی کرنے والی ماسی رجو کھڑی تھی اُس نے بڑے ادب سے ثمر کو سلام کیا ثمر نے ایک طرف ہو کر اُسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

رجو بڑی خود اعتمادی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ کیونکہ ندا سے اُس کی ملاقات ہو چکی تھی اُس کو پتہ چل گیا تھا کہ اُس کا صاحب نئی شادی کر کے بیگم کو اِس گھر میں بسا چکا ہے اُس کے لیے یہ انوکھی نرالی خبر نہیں تھی وہ بہت سے گھروں میں کام کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ صاحب لوگ دوسری تیسری شادی کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تقریباً کئی گھروں میں وہ اعلیٰ درجے کے فسادات دیکھ چکی تھی۔

کہیں صاحب نے بیگم سے چھپ کر شادی کی تھی۔ کہیں الل اعلان...... کہیں دوسری بھی چھوڑ دی تھی اور تیسری آ گئی تھی۔ اُس کو بھلا صاحب لوگوں کے معاملات سے کیا لینا دینا تھا۔

ندا سے بھی اُس کی ایسی کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ ندا تو اُسے اندر بلا کے بانو آپا کے کمرے میں سونے چلی گئی تھی۔ جب اُس کا کام ختم ہو گیا تو اُس نے ندا کو مطلع کیا کہ اُس کا کام ختم ہو گیا ہے۔

''ندا نے اُسے جانے کی اجازت دے دی وہ چلی گئی تھی۔ اور اِس وقت بھی وہ سمجھ رہی تھی کہ ندا موجود ہے۔ اُس نے ندا کی بابت کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا وہ ویسے ہی ثمر سے بہت گھبراتی تھی کیونکہ ثمر کسی ماسی سے بات چیت کرتا ہوا نہیں پایا گیا تھا۔

اور اتنا خاموش رہتا تھا کہ خاموشی ہی ہیبت بن جاتی تھی اور کسی ماسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ خود سے وہ اُس سے بات کر سکیں۔

ثمر گیٹ بند کر کے بانو آپا کے کمرے میں چلا گیا تھا کیونکہ اُس کے اپنے بیڈ روم میں تو عجیب سا بکھیڑا پھیلا ہوا تھا۔ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس طرح سے سمیٹے گا اُس نے بانو آپا کے کمرے میں خود کو بند کر لیا۔ رجو گھر کے کام کرنے لگی اُس کے دل میں یہی تھا کہ شاید بیگم صاحبہ بھی اِس وقت سو رہی ہیں۔

وہ لاؤنج کی صفائی کر رہی تھی کہ افشاں کا فون آ گیا..... اُس نے فون اٹھایا افشاں نے رجو کو پہچان کر ثمر کے بارے میں پوچھا۔

اُس نے بتایا کہ بیگم صاحبہ سے تو ملاقات نہیں ہوئی ابھی تک صاحب نے گیٹ کھولا تھا اور بڑی بیگم صاحبہ کے کمرے میں جا کر سو گئے تھے۔

افشاں کے لیے یہ ایک بہت دل دہلا دینے والی خبر تھی کہ بیگم صاحبہ سو رہی ہوں گی..... جبکہ وہ چمن کو فون کر کے تمام حالات سے آگاہی حاصل کر چکی تھی اور اُسی صدمے کی وجہ سے وہ ابھی تک ثمر سے ملنے بھی نہیں آئی تھی اُس کا اب جی ہی نہیں چاہتا تھا اس گھر میں آنے کو..... ماں ہی نا رہی تھی اب اُس نے اِس گھر میں کیا کرنے آنا تھا چمن بھی اِس گھر سے جا چکی تھی۔ بہرحال خبر سن کر اُسے زوردار جھٹکا تو لگا تھا..... پھر اُسے خود بخود سمجھ بھی آ گئی تھی کہ آخر وہ طلاق جو سالوں سے ٹلتی آ رہی تھی امی جان کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی کیسے واقع ہو گئی سب کچھ سمجھ آ گیا تھا اُس نے رجو سے چند رسمی باتیں کر کے فون بند کر دیا تھا۔

یہ ندا ہی کو پتہ تھا کہ وہ کس طرح ایک نشے میں دھت انسان کو ٹیکسی میں لاد کر گھر تک پہنچی تھی۔ گھر پہنچتے ہی ارسلان تو لاؤنج میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا تھا اور وہ اپنے سابقہ بیڈروم میں بند ہو گئی تھی۔ حیرت اور صدموں کی انتہاؤں پر اُس نے ساری رات جاگ کر کاٹی تھی۔

کوشش کے باوجود وہ سو نہیں پائی تھی۔

رہ..... رہ کر اُسے ارسلان پر غصہ آ رہا تھا کہ اُس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے اگر اُس کی زندگی برباد ہوئی تو اس بربادی کی ذمہ داری سیدھی سیدھی ارسلان پر آئے گی..... وہ ارسلان کو نہیں چھوڑے گی۔

صبح کی روشنی پھیلنے سے اب تک وہ کئی مرتبہ ارسلان کو جھانک کر آ گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ذرا سی بھی کوتاہی سرزد ہو اور پھر وہ اپنا شوق پورا کر کے نشے میں دھت دکھائی دے بات کہنے سننے کے قابل نہ ہو۔ وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح بار بار لاؤنج کے چکر کاٹ رہی تھی۔ رات تو اُس نے بستر پر چت لیٹ کر جیسے تیسے کاٹی تھی۔

لیکن صبح ہونے کے بعد وہ بڑی بے تابی سے ارسلان کے جاگنے یا اُس کے ہوش و حواس کے جاگنے کا انتظار کر رہی تھی۔

ستر ہویں یا اٹھارویں دفعہ شاید اُس نے لاؤنج کا چکر لگایا تھا۔ اب ذرا اُس کی طبیعت میں بحالی شروع ہوئی اُسے لگا کہ ارسلان جاگ چکا ہے کیونکہ اب وہ مختلف کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔

ایک ہاتھ زمین پر لٹکا ہوا تھا اور ایک ہاتھ سے اُس نے اپنی سیدھی ٹانگ ایسے دبائی ہوئی تھی جیسے بہت درد ہو رہا ہو۔

''آپ جاگ رہے ہیں۔'' ندا کو اُس کے جاگنے کی امید ہوئی تو اُس نے بلا تاخیر آواز لگائی۔

''اچھا تمہارا مطلب ہے میں زندہ ہوں اگر تمہارا یہ مطلب ہے تو واقعی اس وقت میں زندہ ہوں تم شاید مجھے مرا ہوا سمجھ رہی تھیں۔''

''اللہ کرے آپ مر ہی جائیں۔'' ندا اپنی فطرت کے عین مطابق برجستہ بولی تھی۔

''آمین...... ارے یارا تنے لوگ میرے مرنے کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ کسی کی نہیں سنی گئی ابھی تک شاید تمہاری سنی جائے...... میں تو خود اِس زندگی سے تنگ آ گیا ہوں اور یوں بھی اب میرے پاس ہے ہی کیا جو مجھے موت سے خوف آئے...... تم دعا کرو میں تھوڑی دیر بعد ہی مر جاؤں۔'' ارسلان بھی کسی اعلیٰ درجے کے ڈھیٹ خمیر سے تخلیق ہوا تھا۔ بجال ہے جو اُس نے ظاہر کیا ہو کہ اُسے ندا کی بات بری لگی ہے۔

''میری دعا میں اثر ہوتو پھر بات ہی کیا ہے...... میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو آج میں اِس حال کو نا پہنچتی۔''

''کس حال کو پہنچ گئی ہو ارے اتنا اچھا حال ہے تمہارا ایک ہینڈسم ڈیسنٹ بندے نے جم کر تمہیں بے وقوف بنایا اور تم کھل کر بڑے پیار سے بے وقوف بنیں۔ اب تو تمہارے پاس اتنا بڑا گھر ہے نانا کی جائیداد میں سے لاکھوں روپے مل رہے ہیں...... بیگم صاحبہ بنی بیٹھی ہو اور کیا چاہیے۔''

''آنکھیں کھول کر دیکھیں آپ اتنے احمق اور جاہل ہیں کہ آپ کو پتہ ہی نہیں کہ آپ ہیں کہاں...... میں آپ کے ساتھ یہاں کیوں موجود ہوں کچھ یاد نہیں آیا آپ کو؟''

ندا کی بات سن کر ارسلان اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''میں کافی دیر سے اِسی بات پر غور کر رہا تھا کہ رات کو تو میں تمہارے گھر میں تھا مجھے کون کرین میں اُٹھا کر یہاں پہنچ گیا۔''

''کتنے افسوس کی بات ہے ارسلان بھائی۔'' ندا نے ارسلان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بولنا شروع کر دیا۔

''آپ کو اتنی سی بھی شرم نہیں آتی اگر آپ ہوش میں ہوتے تو آپ کچھ بھولتے...... کہیں سے اُدھار ملے تو واقعی تھوڑی سی شرم لے لیں...... اِس حال میں کوئی اپنی بہن کے گھر جاتا ہے اور اُس کو اس کے گھر سے دھکے دے کر نکلواتا ہے......''

ندا بولتے بولتے اب پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی ابھی تک اُس نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ رات کی فلم آنکھوں میں چلی اور اُسے ثمر کا کھینچ کر دھکے دے کر گھر سے نکالنا یاد آیا تو روح پر ایسی کاری ضرب پڑی کہ وہ اپنا اختیار کھو بیٹھی وہ اس بری طرح تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی کہ ارسلان دنگ سا ہو کر اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ اب مکمل ہوش وحواس میں تھا اُسے تجسس لاحق ہو رہا تھا کہ اُس کی بے خبری میں ایسا کیا ہو گیا۔

☆......☆......☆

''بھائی آپ پہلے ہی بتا دیتے تو میں بھابی کو تکلیف نا دیتی آپ نے کسی مصلحت کے تحت اگر امی سے چھپایا تھا تو مجھے تو بتا سکتے تھے کہ آپ دوسری شادی کر چکے ہیں؟ وہ تو آخر ایک دن ہونا ہی تھی جس طرح کے حالات چل رہے تھے...... اُس حساب سے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں...... لیکن آپ...... کم از کم اپنی بہن کو تو بتاتے۔''

''افشاں! امی جان کی بیماری کی وجہ سے میں اتنا اپ سیٹ ہو گیا تھا کہ میں خود بھول گیا تھا کہ دوسری

شادی کر چکا ہوں۔ ظاہری بات ہے جو امی جان کی حالت تھی ۔ حالت کو دیکھ کر کوئی بھی اولاد مستقبل کے بارے میں خوشیوں کے بارے میں کیا کوئی پلاننگ چلا رہی ہوتی ہے..... ذہن میں تو صرف یہی ہوتا ہے کہ کسی طرح ماں کی طبیعت ٹھیک ہو جائے ماں اچھی ہو جائے.....'' ثمر کو بہن کو ٹالنے کا بہترین جواز مل گیا تھا..... اُس نے خوب طبیعت سے افشاں کی تسلی کی۔

افشاں رجو سے فون کرنے کے بعد آدھے گھنٹے کے اندر اندر گھر آ چکی تھی کہ وہ رُک ہی نہیں سکتی تھی وہ دیکھنا چاہتی تھی..... کہ وہ کون سی ایسی ماہ رخ پری وش ہے جس کو ثمر نے چمن پر فوقیت دی ہے کوئی تو ایسی بات ہوگی جو اُس کو چمن سے امتیاز دیتی ہوگی۔

''اب نئی بیگم سے ملوایئے تو سہی تعارف تو کرایئے۔'' افشاں نے ثمر کی طرف بہت غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

ثمر جواب میں گردن ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایسا کچھ تھا جس کو افشاں سمجھنے سے قاصر تھی۔ کیونکہ اُس نے تو ایک سادہ سی بات کی ہے..... نئی بھابی لے آیا ہے تو تعارف بھی کرا دے ایسی تو کوئی مشکل بات نہیں ہوئی جس کے اوپر اتنا غور و فکر کیا جائے۔

''بھابی سو رہی ہیں کیا؟'' افشاں نے سوچا شاید بھائی کو برا لگا ہے کہ اُس نے بھابی کی بجائے لفظ بیگم استعمال کیا ہے۔ اُس نے بہر حال دل کڑا کر کے اِس رشتے کو قبول کرنے کا عندیہ دے دیا۔

''وہ گھر پر نہیں ہیں۔'' اس سے پیشتر کہ افشاں کچھ اور کہتی ثمر نے جواب دے کر جان چھڑائی۔

''تو اپنے میکے رہنے گئی ہوئی ہیں..... ابھی ان تکلفات و رسومات کی ضرورت تھی آپ اکیلے ہیں گھر میں اس وقت تو اُن کو آپ کے پاس ہونا چاہیے تھا۔''

''افشاں خدا کے لیے اپنی کوئی بات کرو کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا نہیں ہوا..... یہ تمہارے کرنے کی باتیں نہیں ہیں۔''

''لیکن بھائی میں نے تو ویسے ہی کہہ دیا تھا آپ کیوں ناراض ہو گئے..... آپ نے شادی کر لی ہے آپ نے ہمیں نہیں بتایا ناراض تو مجھے ہونا چاہیے تھا لیکن میں نہیں ہو رہی کہ ٹھیک ہے اب امی جان بھی نہیں ہیں چمن بھابی بھی نہیں ہیں آپ اکیلے ہو گئے ہیں ٹھیک ہے آپ نے شادی کر لی ہے..... اللہ تعالیٰ آپ کے گھر کو آباد رکھے.....

بہنوں کو اور کیا چاہیے ہوتا ہے۔ وہ تو اپنے بھائی کی خوشی چاہتی ہیں..... مگر آپ تو ہر بات کا برا مان رہے ہیں..... افشاں کو بھی اب غصہ آ گیا تھا لیکن بھائی بڑا تھا اس لیے اُس نے بہت محتاط انداز میں اپنے غصے کا اظہار کیا۔

افشاں دیکھو میں تمہیں ایک بات صاف صاف بتا رہا ہوں۔ چمن امی جان کا سلیکشن تھی لیکن میں نے اُس کو بہت دل سے قبول کیا اور ہماری زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی۔ پتہ نہیں پھر اچانک کیا ہوا بہر حال اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ یہ دوسری شادی سمجھو ایک حادثاتی شادی تھی۔''

''تھی کیا مطلب.....'' افشاں نے چونک کر ایک دم بات کاٹ دی۔

''ارے بھئی اُن دنوں میں بہت ڈپریسڈ تھا یہ لڑکی میرے دفتر میں کام کر رہی تھی یہ خود بڑے مسئلے

مسائل میں پھنسی ہوئی تھی۔ بس میں نے اُس سے شادی کرلی سوچا تھا کہ امی جان ٹھیک ہوجائیں گی پھر بتاؤں گا۔ ویسے بھی تمہیں تو پتہ ہی ہے امی جان کو کتنا شوق تھا میری دوسری شادی کروانے کا......'' یہ جملہ سن کر جانے کیا کچھ افشاں کو یاد آ گیا اُسے یوں لگا جیسے اُس کے پپوٹوں پر کسی نے منوں وزن ڈال دیا ہو نظریں جھکیں تو اُٹھ کر ہی نا دیں۔

اُسے سب کچھ یاد آنے لگا اپنے کردہ اور ناکردہ گناہ بھی یادداشت کے کونوں کھدروں سے جھانکنے لگے۔ جو وہ سمجھتی تھی کہ اُس نے اللہ سے معاف کروالیے ہیں۔

''بس وہ امی جان کی غلطی تھی یہ میری غلطی ہے۔''

''ہیں......'' افشاں کے منہ سے معصوم بچوں والا ہیں اتنا لمبا تھا۔ کہ وہ اُس ہیں سے آگے کچھ بول ہی نا پائی جو اِس کی حیرت کا واضح اظہار تھا۔

''کیا مطلب؟ مجھ سے صاف صاف بات کریں بھائی واقعی مجھ کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔ آپ کی دوسری شادی ہوگئی ہے آپ تھی...... تھا کرکے بات کررہے ہیں۔ میں پریشان ہورہی ہوں...... افشاں ایکدم جذباتی ہوگئی اُس کو اِس بات کا بھی خوف نا رہا کہ ثمر اُسے ڈانٹ ڈپٹ کے چپ کرا سکتا ہے۔ اُس کو پورا اختیار ہے کہ وہ افشاں کے سوالوں کا جواب دے یا نا دے وہ اپنا شدید غصہ ظاہر کرکے افشاں کو خاموش بھی کرا سکتا ہے...... لیکن افشاں کا تجسس اب اُس نقطہ عروج پر تھا جہاں سے وہ اپنے سوالوں کا جواب لیے بغیر ہل نہیں سکتی تھی۔

''بھئی سمجھو کہ Miss Selection ہوگیا۔''

''یعنی آپ یوں کہہ رہے ہیں کہ چمن بھابی امی کا مس سلیکشن تھیں اور دوسری والی بھابی آپ کا مس سلیکشن ہیں۔''

''ہاں بھی یہی سمجھ لو...... خدا کے لیے میری جان مت کھاؤ...... اگر میرے لیے تھوڑی سی مہربانی کرسکتی ہو تو میرے لیے ہلکا پھلکا ناشتہ تیار کردو...... میں نے رات بھی کچھ نہیں کھایا اِس وقت بھوک سے مجھے چکر آرہے ہیں۔''

''سگی بہن تھی تکلفات کے پردے بیچ میں نہیں تھے اور بہن بھی چھوٹی...... اور سچ مچ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اور بھوک کے بہانے اِس موضوع کو ٹالنے کا سنہری موقع بھی ہاتھ آرہا تھا۔ افشاں کتنی بھی حیران سہی لیکن بھائی کی بھوک کا سن کر۔ بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی تھی۔

''ٹھیک ہے بھائی آپ فریش ہوجائیں میں دیکھتی ہوں وہ تمام حالات پر غور و غوض کرتی ہوئی کچن کی طرف جارہی تھی۔'' ثمر نے اپنے ہاتھ سر پر رکھ کر گویا سکون کا سانس لیا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اُسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ کہ وہ افشاں سے کیا بات کرے اور کیا چھپائے۔

چمن کے ساتھ بدترین جھگڑوں میں بھی وہ کبھی علیحدگی کے بارے میں نہیں سوچتا تھا مگر ندا تو آناً فاناً ناقابل پیمائش فاصلوں پر کھڑی نظر آرہی تھی۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اس سحر انگیز
ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

"آپ کا مریض اب بہتر ہیں۔ آپ انہیں اپنے ساتھ لے جا سکتی ہیں۔ معمولی زخم ہیں چند دن میں بھر جائیں گے۔ یہ ادویات ان اوقات میں کھلا دیجیے گا۔" وہ سر ہلا کر میری ہدایات سنتی رہی پھر بنا کچھ کہے اپنے نازک ہاتھوں میں نسخہ تھام لیا اور میں بظاہر...

صبح کی سپیدی آسمان پر ہلکی ہلکی نمودار ہونا شروع ہوگئی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ نے فضا میں جیسے جلترنگ بجا رکھے تھے۔ پرندوں کی اس شگفتہ موسیقی کو میں پردہ ہٹا کر آسمان پر نگاہ جمائے مسکرا کر سن رہا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا میرا چشمہ اب میرے ہاتھوں میں تھا جس میں نے صاف کرکے اب اپنی آنکھوں پر لگا لیا تھا۔ منظر اور بھی صاف نظر آنے لگا تھا۔ میں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی تو عصمت کہیں موجود نہ تھی۔

حسبِ معمول وہ اٹھ کے بیدار ہو چکی ہوگی یقیناً نماز پڑھ رہی ہوگی۔ عصمت کو فجر کی نماز پڑھ کر لیٹنے کی عادت نہ تھی وہ سیدھی کچن میں گھس جایا کرتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ۔

"یہ لیجیے گرما گرم چائے۔" وہ اپنے مقررہ وقت پر چائے لے کر حاضر تھی چونک کر میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا تھا۔ تھکن زدہ چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ میں نے اپنے مضطرب دل کو ٹٹولا جو رات سے اتنا بے چین تھا کہ میں رات بھر سو نہیں پایا۔ ساری رات دل پر کچوکے سے لگتے رہے اک کسک نے دل پر ایسا وار کیا کہ ذہن ابھی تک ماؤف تھا۔ کیا یہ ندامت کا احساس بچی کچی زندگی پر ہمیشہ حاوی رہے گا۔ میں بس یوں ہی سوچتا رہ گیا۔ نگاہ دھندلا گئی۔

"کیا میں یوں ہی سکون کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہوں گا۔" سوال پھر اٹھا تھا۔

"لیجیے نا چائے۔" اس کا بڑھا ہوا ہاتھ جوں کا توں موجود تھا میں خجل سا ہو کر اپنے خیالوں سے باہر نکلا تھا اور اس کی میٹھی مسکان سے دل میں تراوٹ محسوس کرتے ہوئے چائے کا کپ تھام لیا تھا۔ وہ مجھے چائے کا کپ تھما کر اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہوگئی اور واپس کچن کی طرف چلی گئی جہاں اب اس نے سب کے لیے ناشتہ بنانا تھا۔ کمرے میں اچانک خالی پن سا آگیا تھا۔ اس کے آنے سے کمرے میں رونق کا احساس اتر آیا تھا۔ عصمت تھی ہی ایک

زندگی میں اللہ نے مجھے بہت نواز رکھا تھا۔
ان پچیس برسوں میں عصمت ہمیشہ میرا ہاتھ تھامے میرے ساتھ زندگی کے سفر میں چلتی رہی۔ اُس نے کبھی میری خامیوں کو سدھارنے کی کوشش نہ کی۔ ایک پُرسکون مسکراہٹ اُس کے لبوں پر ہمیشہ ٹھہری رہتی۔ وہ ہر دکھ کا مقابلہ اس ایک مسکراہٹ کے پیچھے کمال سے چھپالیا کرتی تھی۔ یہ کمال مجھے تو حاصل نہ تھا۔ نہ جانے کیوں میں اُس کی محبت میں اس قدر جذباتی تھا کہ اپنی محبت کے آگے ہمیشہ اُس کی 'چاہ' نظر انداز کر جاتا۔ وہ بھی بھی شکایت بھی نہ کرتی بس وہی ایک مخصوص مسکراہٹ.....
'چپ..... خاموشی..... اور میں خود غرض..... بے حس..... مجھے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ میں اُس کی 'چاہ' سے بے خبر اُسے کیسی اذیت دے رہا ہوں۔ نہ جانے مرد کیوں چاہتا ہے عورت اُسی راستے پر چلے جس پر قدم رکھ کر وہ چلتا ہے۔ میں بھی تو یہی چاہتا تھا کہ عصمت ان ہی راستوں پر قدم رکھے جو صرف میری طرف جاتا ہے۔ اُس کی نگاہ اور سوچ کے سارے دائرے میری ہی طرف گھومتے ہوں۔ میں نے چائے کا کپ خالی کر کے سائیڈ ٹیبل پر واپس رکھ دیا۔ آنکھوں کے آگے سے چشمہ اتارا پسینے سے تر چہرہ میرے چشمے کو بھی بھگو دیا تھا۔ میں نے دھندلائی ہوئی آنکھ سے آسمان کی طرف پھر نگاہ اٹھائی۔ آسمان روشن اور سورج کی کرنیں اب درختوں پر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

آہستہ سے گرنے لگی تھیں۔ گرمی کا احساس ہونے لگا تھا شدید گھٹن سے تنگ آ کر میں نے کمرے کی کھڑکی بند کر دی اور اے سی کے ریموٹ کا بٹن آن کر دیا۔ کمرہ دھیرے دھیرے ٹھنڈا ہونے لگا۔ میرے شل اعصاب بھی کچھ ٹھنڈے ہوئے تھے۔ میں نے بیڈ سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھیں بند کریں۔ پھر میں ماضی کا سفر کرنے لگا۔ آج ماضی کا سفر کرنے کا دل چاہ رہا تھا۔

پچیس سال پہلے...... ہاں پچیس سال...... پہلے...... آہ میں اور عصمت......

ہاں ہماری کہانی......!

جنرل ہسپتال کے سامنے بلڈنگ آگ کی زد میں تھی۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت آگ بجھانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ آگ کے شعلے آسمان تک بلند ہونے سے پہلے ہی بجھا دیے گئے۔ کئی لوگ شدید زخمی تھے۔ جنرل ہسپتال میں ایمرجنسی نافذ ہو گئی۔ ڈاکٹرز کی رضا کار ٹیم میں، میں بھی شامل تھا۔ زخمیوں کی طبی امداد میں مصروف میری نظر ایک شخص پر پڑی۔ ایک کم عمر لڑکی کی گود میں زخمی شخص سر دیے بیٹھا تھا۔

میں نے اُس بوڑھے وجود کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر ایمرجنسی وارڈ پہنچایا تھا۔ لڑکی نے جھکا سر اٹھا کر میری طرف تشکر کی نظروں سے دیکھا تھا۔ شاید بے تحاشا زخمی لوگوں کے درمیان بیٹھی وہ اپنی باری کے انتظار میں بے سدھ وجود کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں اُس کی خاموش نظروں کو نظر انداز کر کے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس ایک نظر نے مجھے اپنے حصار میں لے رکھا تھا نہ جانے کیوں دل کے چاہنے کے باوجود اس خاموش حسن کو دیکھنے کی دوبارہ نظریں جسارت کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔ اُس کے خاموش حسن پر عجیب سوز تھا۔ میں مسیحا تھا، ان ہاتھوں کو مسیحائی کا شرف حاصل کیے پانچ برس بیت گئے تھے۔ ان برسوں میں کبھی دل یوں نہ تھما تھا۔ جیسے آج رُک سا گیا تھا۔ وقت تھم سا گیا تھا۔

اور دل...... دل نے کروٹ سی لے لی اور نگاہوں کو چور بننے پر اُکسانے لگا۔ نگاہ دیدار کی چوری میں ہچکچانے لگا۔ لیکن دیدار پر بہ ضد تھا بے چین تھا۔

''آپ کا مریض اب بہتر ہیں۔ آپ انہیں اپنے ساتھ لے جا سکتی ہیں۔ معمولی زخم ہیں چند دن میں بھر جائیں گے۔ یہ ادویات ان اوقات میں کھلا دیجیے گا۔'' وہ سر ہلا کر میری ہدایات سنتی رہی، پھر بنا کچھ کہے اپنے نازک ہاتھوں میں نسخہ تھام لیا اور میں بہ ظاہر اگلے مریض کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''شکریہ۔'' اُس کے لبوں نے جنبش کی۔

میں اُس کی ترنم آواز پر بے اختیار ہو کر پلٹا۔ وہ جا رہی تھی پھر میرے قدم اٹھ گئے اِسی شام میں نے اپنی خواہش کا اظہار والدہ سے کر دیا۔ میری والدہ میری خواہش پر راضی ہو گئیں۔ اُس دوشیزہ کا گھر میں پہلے ہی تعاقب کر کے معلوم کر چکا تھا۔ میری والدہ اسی بات پر خوش تھیں کہ مجھے کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے۔ ورنہ بہن اور والدہ کے اصرار کے باوجود میرا دل شادی پر راضی نہ تھا۔ وجہ صرف یہ کمبخت دل تھا۔

پانچ برس یہ دل کسی صنفِ نازک کو دیکھ کر نہ مچلا تھا۔ آج پانچ سیکنڈ میں ہی دل کی کایا پلٹ گئی۔ میں نے مسکرا کر اپنی والدہ کو دیکھا اور سینے پر ہلکی سی تھپکی دی جس کے اندر دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

میری ماں اور بہن مٹھائی لے کر اپنا پیغام لے کر پہنچیں تھیں اماں کے دل میں وسوسہ تھا کہ لڑکی

خوبصورت ہے تو یقیناً منسوب ہوگی۔ بہن فرزانہ کو امید تھی کہ لڑکی کا رشتہ کہیں لگا ہوگا۔ پھر خوش قسمتی سے ایسا نہ تھا۔لڑکی کے والد اور والدہ نے کہا کہ رشتے تو کئی ہیں لیکن وہ فی الحال کہیں ہاں کرنے کے خواہاں نہیں ہیں۔ لڑکی کو پڑھنے کا شوق ہے عمر اُس کی صرف انیس برس تھی۔ والد بھی پڑھے لکھے اور گورنمنٹ آفیسر تھے یہ اُن کی اکلوتی اولاد تھی۔ میرے گھر والے ہاں یا نہ سنے بغیر واپس آگئے۔ والدہ نے کہا لوگ بہت عزت سے ملے ہیں۔ اچھے بھی ہیں۔

لیکن بیٹی کی شادی پر فی الحال آمادہ نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ لڑکی کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے ہیں۔ میری باجی لڑکی کو دیکھ کر گرویدہ ہوگئی تھی اسی لڑکی سے رشتہ کرنے پر مصر تھی۔ مجھے اس وقت بہت غصہ آرہا تھا۔ میں ڈاکٹر تھا اپنا گھر اور معاشرے میں اچھا مقام اور شریف تھا۔ دیکھنے میں بھی میری شخصیت جاذبِ نظر تھی۔ میں ایک مکمل شخصیت کا مالک تھا۔ مجھے شدید غصہ آرہا تھا۔ یہ امید ہی نہ تھی کہ وہ لوگ گول مول جواب دے کر ٹال دیں گے۔ پھر یوں ہی ایک ہفتہ گزر گیا۔ میری بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں نے پھر اپنی والدہ اور باجی کو تحقیق کے لیے فون کرنے کو بولا۔ جب اُن لوگوں کو فون کیا تو وہی جواب.....

''ابھی کچھ سوچا نہیں۔''

''یہ کیا مذاق ہے..... آخر کس چیز کی کمی ہے مجھ میں جو وہ لوگ اس قدر نخرے کر رہے ہیں۔'' میں غصے میں چلایا۔

''بیٹا لڑکی والے ہیں..... حق ہے اُن کا..... پھر وہ فی الحال شادی نہیں چاہ رہے۔'' وہ بیٹے کے غصے کو نظر انداز کر کے ٹھنڈے لہجے میں بولیں۔

''ہم شادی کے بعد تعلیم مکمل کروالیں گے۔ آپ اُن کے گھر پھر جائیں۔'' میرا لہجہ ضدی تھا۔

میرے اصرار کی شدت دیکھ کر والدہ پھر جانے کے لیے راضی ہوگئیں۔ میں نے اسکول کے وقت سے لے کر آج تک ناکامی کا منہ نہ دیکھا تھا۔ ہمیشہ امتیازی نمبروں سے پاس ہونا' پھر ڈاکٹر بننے کے بعد ملازمت بھی پکی مل گئی تھی اپنا گھر اور گاڑی سب کچھ میرے پاس بہت کم عمری میں ہی آگیا تھا۔ مجھے خواہش کے حصول کے لیے بھی بہت زیادہ تگ ودو نہیں کرنی پڑی۔ یوں میری درخواست نظر انداز کر دینا مجھے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ میری انا کو شدید ٹھیس پہنچی تھی۔ میرے اپنے خاندان کی کئی لڑکیوں کی نظریں مجھ پر تھیں۔ لیکن دل نے بھی کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا نہ راضی ہوا۔ نہ جانے کیوں زندگی میں پہلی بار یہ دل بے چین ہو کر خودسر بن گیا تھا۔ اُس ہی دوشیزہ کا قرب چاہتا تھا جس کو دیکھ کر یہ دل بڑی ترنگ میں دھڑکا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ کچھ بھی ہوجائے اُس ہی لڑکی سے شادی کرنی ہے اور پھر قدرت مہربان ہوگئی۔

یوں عصمت میری زندگی میں شامل ہوگئی۔ والدہ کے اصرار کی شدت کو دیکھ کر عصمت کے گھر والوں نے ہاں کردی اور چھ ماہ میں ہماری شادی ہوگئی۔

عصمت حسین ہونے کے ساتھ سلیقہ مند بیوی تھی۔ وہ میری کسی بات پر انحراف نہ کرتی۔ اُس نے ایک بار اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس اظہار میں التجا تھی ضد مفقود تھی۔

''میں اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ لبوں کے کنارے سمیٹ کر بولی۔ پھر وہ مجھ سے اجازت طلب نظروں سے سوال کرتی رہی۔ میں نے اُس کی مخروطی انگلیاں اپنے ہاتھوں میں محبت سے تھام لیں۔ پھر اپنی محبت کے سمندر میں شادی سے پہلے کا کیا وعدہ فراموش کر ڈالا۔ اُس نے

میری شدید محبت' ضد اور اَنا کے سامنے پھر کبھی 'سوال' نہ کیا۔ عصمت کے والد نے بھی دبا دبا احتجاج کیا۔ لیکن میں نے ہر سوال اپنی انا کے پتھر تلے کچل دیا اندر لگی اُس آگ کو تسکین ملنے لگی جو اس رشتے کے طے ہونے نہ ہونے کے درمیان میرے وجود کو لگی تھی۔ عصمت کے والد کا جھکا سر میری خودسری کے آگے مزید جھک گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر نہ جانے کیوں لذت مل رہی تھی۔

وقت آگے سرکتا رہا۔ ہمارے آنگن میں ننھی پری اُتر آئی۔ درخشاں بالکل عصمت کا پرتو تھی۔ بے چین گلابی وجود نے میرا گھر جنت بنا ڈالا تھا۔

''ہائے اللہ...... بہت ہی پیاری گڑیا سی بچی ہے' یہ تو میرے فراز کی امانت ہے۔'' فرزانہ باجی واری صدقے ہوئے جا رہی تھیں اور جھٹ اپنے چھ برس بیٹے کے لیے سنہرے بالوں والی درخشاں کو مانگ لیا۔ میں نے مسکرا کر باجی کی طرف دیکھا تھا۔

''آپ کی اپنی بچی ہے باجی......''

باجی میرا جواب سن کر نہال سی ہوگئیں۔ میں نے عصمت کی طرف دیکھا جس سے پوچھنا گوارا نہ کیا تھا۔ اُس کے چہرے پر تفکر کی لہر آئی اور گزر گئی اُس کے لب خاموش تھے۔ درخشاں بڑی ہوتی گئی۔ بات یوں ہی آئی گئی ہوگئی۔ درخشاں کو میری طرح ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ وہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے لگی۔ فراز سوفٹ ویئر انجینئر تھا۔ وہ بہت جلد تعلیم سے فارغ ہوتے ہی نوکری کرنے لگا۔ فراز کو قسمت سے نوکری بھی اچھی مل گئی تھی۔

درخشاں کے ڈاکٹر بننے میں ابھی تین سال باقی تھے کہ فرزانہ باجی فراز کا رشتہ درخشاں کے لیے لے آئیں۔ اُن کو مٹھائی سے لدا پھندا دیکھ کر میں ٹپٹا گیا۔

''میں کچھ نہیں سنوں گی۔ فراز انتظار کرنا نہیں چاہتا۔ اُس نے آسٹریلیا میں اپلائی کیا ہوا تھا۔ وہاں اُس کو بہت اچھی آفر آئی ہے وہ جانے سے پہلے شادی کرنا چاہتا ہے۔ درخشاں کو ساتھ ہی لے کر جائے گا۔'' وہ ایک لمبی بحث کے بعد پھر بولی تھیں۔

''باجی لیکن درخشاں اپنی پڑھائی بیچ میں نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے ہم ابھی شادی نہیں کر سکتے۔'' میں نے سختی سے اپنا موقف بتایا جس پر وہ بھپر گئیں۔

''اب بہن سے اس لہجے میں بات کرو گے۔ پڑھائی کا کیا ہے ہوتی رہے گی۔'' وہ سچ مچ بے تحاشا رونے لگیں۔ میں نے باجی کی بات کبھی نہیں ٹالی۔ آج بھی اُن کی ضد کے آگے ہار گیا۔

عصمت میرے جھکے سر کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اُس کے سامنے خفت محسوس ہو رہی تھی۔ آج جس کرسی پر میں بیٹھا تھا پچیس برس پہلے اُس کے والد شاید اسی دل اور احساس کو سمیٹے بیٹھے تھے لیکن اُس درد کو میں اُس وقت محسوس کر ہی نہ سکا جو آج محسوس کر رہا تھا۔ کچھ لمحے کیسے اذیت ناک ہوتے ہیں پلٹ پلٹ کر سامنے آجاتے ہیں۔ بیٹی اور باپ کا تعلق اور اُس سے بڑی مانوس محبت نے میری اَنا کے بت کو پاش پاش کر دیا تھا۔ پچیس برس پہلے کا منظر ایک لمحے میں میری آنکھوں کے آگے گزر گیا۔ کل میری بیٹی رخصت ہو کر آسٹریلیا چلی گئی۔ فراز نے بے شمار وعدے میری ہتھیلی پر رکھ دیے تھے۔ ایسے ہی جیسے کبھی میں نے عصمت کے والد سے کیے تھے۔ درخشاں کی بھری بھری آنکھیں ایئرپورٹ سے جاتے وقت مڑ مڑ کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں وہی کچھ تھا۔

''چپ...... خاموشی...... اور میرے دل میں ایک کسک......!''

☆☆......☆☆

افسانہ

عطیہ ہدایت اللہ

شامِ قفس

> ''اُلو کی پٹھی تُو کیا سمجھتی ہے میں تجھے بیوی بنا کر عزت سے رکھوں گا۔نہیں میرا گال اب بھی تیرے تھپڑ کی گرمی سے سنگ رہا ہے۔اور میں جب تک تیرا یہ خوبصورت جسم اور شکل بگاڑ نہ دوں۔یہ گال سلگتا ہی رہے گا۔'' آمنہ کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔''چپ......آواز نکلی تو......

''میڈم صدیقہ! یہ آخر ہو کیا رہا ہے تو بہ توبہ اتنی دھاندلی...... دیکھیں تو ان خواتین کو' کبھی برقعہ پہن کر آجاتی ہیں' کبھی لمبی چادر لپیٹ کر' کبھی شال اوڑھ کر' ہر بار' نئے نئے شناختی کارڈ

لے کر ووٹ ڈالتی ہیں اور ڈھیروں جعلی ووٹ پڑ رہے ہیں اس خاص حلقے میں۔'' آمنہ نے دونوں ہاتھوں میں اپنے گھنے بھورے بالوں والا سر پکڑ کر بے بسی کے عالم میں مخالف کیمپ کی اس دھاندلی اور ہڑبونگ کو دیکھ کر کہا۔

''اصل میں آمنہ بیٹا! تم پہلی بار ایسی بیک ورڈ جگہ پر پولنگ کی ڈیوٹی دینے آئی ہو۔ اس لیے اتنی شاک ہو رہی ہو' میں تو برسوں سے یہ ڈرامہ دیکھ رہی ہوں' یہ پولیٹکس کی دنیا ہے' یہاں ایمانداری' قابلیت اور کسی تعلیمی معیار نہیں بلکہ چالاکی' دھوکہ اور پیسہ چلتا ہے۔ کروڑ لگاؤ اور اگلے تین سال میں دس کروڑ کمالو۔ دیکھو ملک زبیر خان کو' اس کے علاقے کے لوگ' رشتہ دار' مزارعے اور دوست کس طرح ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ پانچ سو ہزار غریب کے ہاتھ میں پکڑا دو' پھر اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا' کون آ رہا ہے' کون جا رہا ہے۔'' میڈم صدیقہ نے نوعمر مس آمنہ کو حقیقت حال سمجھانا چاہی۔ پچیس سالہ انتہائی خوبصورت گورنمنٹ ٹیچر آمنہ شہر کے ایک ہائی اسکول میں انگلش اور ہسٹری پڑھاتی تھی۔ وہ نہایت محنتی' ذہین اور خوش اخلاق ٹیچر جانی جاتی تھی۔ اس کے والد فوت ہو چکے تھے۔ گھر میں سب سے بڑی ہونے کے ناطے ایک چھوٹی بہن' بھائی اور ماں کی ذمہ داری اُسی نے اٹھا رکھی تھی۔ سرکاری تنخواہ کے ساتھ وہ گھر میں بچوں کو ٹیوشن' امتحانات میں ممتحن اور اب الیکشن میں بھی ڈیوٹی دینے پر راضی ہوگئی تھی۔ آخر گھر کے اخراجات اور سفید پوشی بھی تو قائم رکھنی تھی۔

''دیکھو بی بی یہ تمہاری تیسری بار ہے اب تم عبائے پہن کر آ گئی ہو۔ یہ تم لوگ کیسے مسلمان ہو۔ کیا تمہارا کوئی دین ہے۔ اور وہ دیکھیں میڈم صدیقہ' اسکول کی دیوار کے ساتھ کسی کا گھر ہے وہاں سے عورتیں بیک ڈور سے پھلانگ کر پھر سے آ رہی ہیں۔ دیکھو! میں تم لوگوں کو اتنی کھلم کھلا دھاندلی نہیں کرنے دوں گی۔ میں پولیس بلالوں گی۔ غضب خدا کا...... ملک زبیر کتنا باؤلا ہوا جا رہا ہے۔ باوجود Restriction کے بار بار اندر جھانک رہا ہے۔ اس کی تو الیکشن ہی کینسل کر دینی چاہیے۔''

''تم کون ہوتی ہو ہمیں باتیں سنانے والی' ہم ملک زبیر کے لوگ ہیں۔ تمہیں پتہ بھی ہے مس صاب' وہ کتنا زور آور شخص ہے' ہتھیلیوں کے درمیان دبا کر پیس دے گا۔ اتنی سی تو تمہاری جان ہے۔'' ایک جوان' منہ پھٹ عورت نے آمنہ کے سامنے ہاتھ لہرا لہرا کر دھمکی دی۔

''میں ابھی جا کر ملک صاب اور اُن کے کارندوں کو بتاتی ہوں کہ تمہیں ایمان دار بننے کا شوق چرایا ہے۔'' دندناتی ہوئی وہ خاتون باہر چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں ایک پکی عمر کا گھنی لمبی مونچھوں والا' بھاری بھر کم لمبا تڑنگا مرد فٹ سے اندر آ گیا۔

اے مس صاحب کیوں روکتی ہو ہمارے ووٹرز کو برا بھلا کہتی اور ووٹ پول کرنے سے منع کرتی ہو۔ آرام سے مہر لگاؤ اور دیکھتی رہو' اگر پانچ دس ہزار چاہیے تو پھینک دو آگے' آگے سے بولیں تو نسوار بنا کر منہ میں دبالوں گا۔ ہونہہ دو' دو ٹکے کی استانیاں' یہاں کرسی پر بیٹھ کر ہمیں اچھے برے کی تمیز سکھانے آتی ہیں۔'' اُس پگڑی والے شخص نے زور سے نسوار والی تھوک زمین پر پچکاری کردی۔

''دو' دو ٹکے کے تم لوگ ہو جو کرسی حاصل کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز پر تلے رہتے ہو۔

ہم علم بانٹنے والے لوگ ہیں۔ لوگ بھیڑ بکریاں چراتے ہیں۔ ہم آپ کے بچوں کو چراتے ہیں۔''

''زیادہ ٹرٹر نہ کر علم سکھانے کی بچی۔'' اُس آدمی نے لال پیلا ہو کر آگے بڑھ کر مس آمنہ کو کس کر تھپڑ رسید کر دیا۔ مس آمنہ کچھ دیر کو تو گال پکڑے سکتے میں کھڑی رہ گئی۔ پھر یکدم کرسی سے اُٹھ کر سامنے کھڑے دانت پیستے مرد کو جوابی تھپڑ رسید کر دیا۔

''بدتمیز آدمی' تجھے کسی عورت سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ تم ہمیں بھی اپنی خواتین جیسی اجڈ گنوار عورتیں سمجھتے ہو۔ جسے جب چاہے روئی کی طرح دھنک دو۔'' اتنے میں کچھ لوگ اِدھر اُدھر سے جمع ہونے لگے اور مخالف پارٹی کے لوگ پولیس کے پاس جانے کی باتیں کرنے لگے۔ میڈم صدیقہ اس قسم کے حالات سے کئی بار نمٹ چکی تھیں اور سمجھدار' جہاندیدہ خاتون تھیں۔ انہوں نے جلد ہی معاملہ رفع دفع کر دیا۔ پانچ بج گئے۔ پولنگ کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ آمنہ نے اپنا سارا کام سمیٹ کر سب کے ساتھ سلام دعا کی اور گھر بہت برے موڈ کے ساتھ واپس آئی۔ دور دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اُس کا بھائی اُسے لینے کے لیے انتظار کر رہا تھا۔ اسکول کی ڈیوڑھی میں سے گزرتے ہوئے اُس بدتمیز آدمی نے اُسے شعلہ بار نظروں سے دیکھا اور ساتھ کھڑے اپنے ہی جیسے آدمی سے کچھ کھسر پھسر کی۔ اسکول اور درس وتدریس کی معمول کی زندگی پھر سے شروع ہو گئی۔

''باجی میرا ایم بی اے کا آخری سال ہے پھر میں انشاء اللہ نوکری کر کے آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا۔'' اُس کا بھائی لاؤڈ میں آ کر آمنہ کے گردن پر سر رکھ دیتا۔

''نہیں تُو نے فنانس اور بزنس میں ایم ایس کرنا ہے۔ تُو نے بہت آگے جانا ہے' ابھی تم بس پڑھتے رہو۔''

''اور باجی میں تو بی اے کے بعد بی ایڈ کر کے ٹیچنگ کروں گی۔'' چھوٹی بہن بھی لاؤڈ میں آ جاتی۔

''کیا تم لوگ بھوکے مر رہے ہو جو اتنی جلدی کمانے کی فکر میں ہو ابھی تو میرے اعصاب اور طاقت بحال ہیں' ثریا تُو سوشل ورک میں ایم اے کرنا..... آج کل این جی اوز میں اُس کی بڑی مانگ ہے۔'' آمنہ پیار سے اُس کے پھولے گال پر پیار کرتے ہوئے کہتی۔

''آمنہ وہ جس آدمی نے تجھے تھپڑ مارا تھا۔ کافی دونوں سے ہار گیا تُو اُس کی بے ایمانی سے کتنی کڑھ رہی تھی۔'' میڈیم صدیقہ نے اسکول میں اُسے ہنس ہنس کر بتایا۔

''آمنہ تجھے کچھ معلوم بھی ہے تمہاری خالہ نے شندانہ کی شادی میں پہلے سے آنے کا کتنا کہا ہے۔ اب تو چھٹی لے لے۔ آخر پنڈی جانا' تین چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔ تو نے ویسے بھی اس سال چھٹیاں نہ ہونے کے برابر کی ہیں۔ اتنی محنت کرتی ہو لڑکیوں کے ساتھ..... اب دو چار دن آرام سے گزارنا..... آج درخواست دے دینا۔'' آمنہ کی امی نے اُسے اسکول جاتے ہوئے آواز دی۔

''اماں جی لے لوں گی چھٹی..... پر آج تو چاول' گاجر کی کھیر تو بنا دے کتنے دن ہو گئے تیرے ہاتھ کی کھیر کھائے ہوئے۔'' آمنہ نے پلٹ کر لاؤڈ سے ماں سے فرمائش کی۔ یہ شہر کے ساتھ ایک بیرونی علاقہ تھا۔ جو بہت تیزی کے ساتھ آباد ہو گیا تھا۔ آمنہ کے باپ نے اپنی

پینشن اور ساری جمع پونجی جمع کی ہوئی اس پانچ مرلے کے گھر بنانے میں صرف کردی تھی۔ شکر ہے اللہ کا اپنا چھت' اپنی دیواریں ہیں ورنہ آمنہ کے بابا کے مرنے کے بعد کہاں بھٹکتے پھرتے۔

آمنہ کی ماں اکثر اپنے ملنے والوں سے ذکر کرتیں۔لڑکیوں کا یہ ہائی اسکول شہری آبادی کی آخری حد ایک اونچی لمبی دیوار کے پار ہندو بستی علاقے کے قریب واقع تھا۔

لوگوں نے اس طرف جانے کے لیے دیوار میں راستہ بنالیا تھا۔ اکثر ٹیچرز راستے میں ساتھی بن کر ساتھ ہی جاتیں' آج آمنہ کی طبیعت تھوڑی ڈھیلی ڈھالی تھی۔ ویسے بھی آج گرمی تھی کہ جہنم کی آگ برس رہی تھی۔

''توبہ توبہ آج تو چڑیوں کے بھی پر جل جائیں۔کلاس روم کا پنکھا بھی خراب ہے۔آج تو آئی شامت۔'' اپنی ہی سوچوں میں گم لان کا گلابی سوٹ پہنے ہاتھوں میں چیک شدہ کاپیاں کتاب اور بڑا سا بیگ سنبھالے دیوار کے سائے تلے آمنہ چلتی چلی جارہی تھی۔ اچانک ہی ایک گلی کے بیرونی راستے کے ساتھ ایک پرانی سی گاڑی نے بریک لگائے۔ آمنہ نے قدم روک کر اس کے گزرنے کا انتظار کیا۔ اچانک ہی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سے ایک لمبا چوڑا' پگڑی کا ایک حصہ چہرے کے گرد لپیٹے شخص نے چیل کی طرح آمنہ پر ایک بڑی سی سیاہ چادر ڈال دی اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پھینکا۔ آمنہ نے لاتیں چلائیں۔ بری طرح کسمساتی رہی لیکن کہاں ایک نازک پھول جیسی لڑکی اور کہاں ایک بھیڑیا......

بدقسمتی سے گرمی اور لُو کے تھپیڑوں نے عام لوگوں کو گھروں میں محصور کررکھا تھا۔ بچیوں کی جانچ شدہ کاپیاں' اپنے مضمون کے لیے تیار شدہ نوٹس اور کتابیں وہیں بکھر کر رہ گئیں۔ کچھ دیر بعد ایک دو ٹیچرز پیچھے سے آئیں۔ آمنہ کی بکھری کاپیاں اٹھائیں اور پھر آن کی آن میں اسکول میں خبر پھیل گئی کہ مس آمنہ اغوا ہوگئی ہیں۔ پولیس نے ڈھونڈا اسکول کے انچارج' ماں' بہن بھائی' رشتہ داروں نے زمین آسمان ایک کردیے لیکن اُسے نہ ملنا تھا نہ ملی جتنے منہ اتنی باتیں' کوئی واقعی رنجیدہ اور افسوس کا اظہار کرتا' اور کوئی مزے لے لے کر اُس کے گھر سے بھاگنے کی داستانیں رقم کرنے لگے تھے۔

''توبہ توبہ بیوہ ماں کا بھی خیال نہ آیا۔ اُن کی عزت دو کوڑی کی کردی۔ شکل دیکھو پریوں جیسی اور کرتوت دیکھو چڑیلوں جیسی' لوگ اِدھر اُدھر کھڑے باتیں بناتے رہے۔ اُدھر آمنہ کو اغواء کرکے لے جانے والی گاڑی بہت دور پہاڑوں کے دامن میں ایک چٹیل میدان میں آکھڑی ہوئی۔

''ملک جی اسرار نے اطلاع دی ہے کہ راستوں میں ناکہ بندی ہے پکڑے گئے تو لینے کے دینے پڑجائیں گے۔ اچھا ٹھیک ہے۔ تم گاڑی سڑک کے راستے حجرے میں پہنچادو۔ میں لڑکی کو پیدل راستہ طے کروا دیتا ہوں۔'' ملک نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ اور گرمی و حبس سے نیم بے ہوش آمنہ کو گاڑی سے نکال کر کھڑا کیا گیا ٹھڈے دیتا' کھینچتا ہوا چلنے پر مجبور کررہا تھا۔ پتھروں پر چلتے چلتے نازک سی گلابی چپل کے اسٹریپ ٹوٹ گئے۔ اس کے پاؤں پر اپنا بھاری پاؤں رکھ کر ملک نے اُسے چپل اُتار پھینکنے پر مجبور کردیا۔

ملک نے ابھی تک چہرے اور گردن کے گرد

چادر لپیٹ رکھی تھی۔

''ذلیل آدمی تُو ہے کون...... مجھے کیوں اغواء کر کے لائے ہو اور اب کہاں دھکے دے کر لے جا رہے ہو۔''

''تڑاخ......'' ایک زناٹے دار تھپڑ اُس کے گلابی گالوں پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر گر گئی اس مضبوط ہاتھ نے اُسے ایک جھٹکے سے نہایت بے دردی سے کھڑا کر دیا۔ اچانک اُس آدمی نے اپنے چہرے کے گرد لپیٹے کپڑے کو ہٹایا۔

''میں وہی ذلیل آدمی ملک زبیر ہوں جسے تُو نے تھپڑ کے بدلے تھپڑ مارا تھا اُس وقت تُو نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ یہ تھپڑ تجھے کتنا مہنگا پڑے گا۔ چل آگے چل ورنہ اس پتھریلے میدان میں پٹخ پٹخ کر مار ڈالوں گا۔'' آمنہ لرز اٹھی۔

''او ہو تو اس کمینے زبیر نے مجھ سے بدلہ لیا ہے۔ یا اللہ اب میں کیا کروں۔'' آمنہ رونے لگی۔ اس کے قدم ذرا بھی آہستہ ہو جاتے تو پیٹھ پر ایک آہنی ہاتھ کا تھپڑ اُس کی کمر دہری کر دیتا۔ چل چل کر اس کے نازک سپید پاؤں خون آلود ہو گئے۔ پتھروں اور کنکریوں سے رگڑ رگڑ کر پاؤں کی کھال اُترنے لگی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر گر گر جاتی تو ملک اسے گھونسوں' لاتوں سے پھر اٹھا دیتا۔ جیسے وہ کوئی مال بردار گدھا ہو۔ سب سے مشکل کام پہاڑی پر بنی پگڈنڈی پر اوپر ہی اوپر چڑھنا اور پھر نیچے ڈھلوان پر اترنا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔

دور کسی مسجد سے عشاء کی نماز کے لیے اذان دی جا رہی تھی۔ نیچے گاؤں میں دور دور کچے پکے گھر بنے تھے۔ تقریباً ہر ایک کی چھت پر ایک برج نما کمرہ تھا۔ جس میں سوراخ بنے ہوئے تھے۔ تاکہ لڑائی کی صورت میں ان سوراخوں میں بندوق کی نالی رکھ کر فائرنگ کی جا سکے۔ گائے' بھینسیں اور بکریاں گھروں کے باہر بندھی ہوئی تھیں۔ خارش زدہ کتوں کی بھونکنے کی عجیب منحوس

آوازیں گونج رہی تھیں۔ گوبر اور مینگنیوں کی بدبو سے آمنہ کا جی متلانے لگا۔ ایک گھر کے سامنے ملک زبیر نے اُسے ہاتھوں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا اور اندرونی دروازہ لات مار کر کھولا۔ سامنے ہی کچے آنگن میں قبائلی کپڑوں میں ملبوس ایک بوڑھی خاتون بری طرح بدک گئی۔ ملک نے اُسے لمبے بالوں کی چٹیا سے کھینچ کر بوڑھی خاتون کے سامنے ڈال دیا۔

''اے ہے زبیرے' یہ بچونگڑی کہاں سے اٹھا لایا۔ کون ہے یہ؟''

''ارے! اب تُو زیادہ پوچھ گچھ نہ کر...... رات جانے لگی ہے۔ وگمہ سے کہہ...... اسے پانی دے کہ پاؤں ہاتھ کا خون صاف کرے اور کوئی ڈھنگ کا جوڑا پہنا دے۔ میں مولوی صاحب کو لے کر آرہا ہوں۔ شوکتے سے کہو چائے اور حلوہ بنا لے اب اس وقت اور کیا ملے گا۔'' ملک نے ماں کی بات کو نظر انداز کر کے جلدی جلدی اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''لیکن تُو کرنا کیا چاہتا ہے یہ مولوی' حلوہ' چائے بتا تو دے نا؟''

''میں اس کے ساتھ ابھی نکاح کرنا چاہتا ہوں تُو چاہتی ہے اغواء کے کیس میں پکڑا جاؤں؟'' ملک نے تلخی سے جواب دیا اور جلدی میں باہر نکل گیا۔

''ارے او وگمہ دیکھ تو زبیرا' تیرے لیے شہر سے سوغات لایا ہے۔ اب جلدی سے اِسے جھاڑ پونچھ کر زبیرے کے قابل بنا۔ وہ مولوی کو لینے گیا ہے۔'' بڑے سے گھیر دار فراک اور لمبے چوڑے شلوار چادر میں ملبوس وگمہ نے وہیں بیٹھ کر سینہ پیٹنا شروع کر دیا۔

''ہائے' ہائے ارے یہ بلا کہاں سے آ گئی۔ تُو نے بھی اسے کچھ نہ کہا۔''

''لو کبھی ہمارے مردوں نے ہماری کبھی سنی ہے۔ جو مرضی ہے وہ کرتے ہیں۔ رونا دھونا بند کر ابھی زبیر آنے والا ہے۔ ہڈی پسلی تیری ایک کر دے گا۔ جا اسے لے جا۔''

وگمہ نے بڑی ہی بے دردی سے آمنہ کو مارتے' کھینچتے ہوئے اندر لے گئی اپنا ایک جوڑا اُسے پہنایا۔

''لے اپنا منہ ہاتھ دھو اور یہ دھول مٹی سے اٹے پاؤں بھی دھو ڈال۔ اب میرا بستر اخراب نہ کرنا۔'' وگمہ نے دھڑام سے پانی سے بھرا لوٹا آمنہ کے سامنے رکھ دیا۔ آمنہ گھٹنوں میں سر دے کر روتی بلکتی رہی۔ اتنے میں ملک زبیر کے ساتھ ایک بوڑھا ہانپتا کانپتا آدمی اس کی ماں اور مولوی اندر آئے۔

''اے استانی پر بڑھا تیرا ولی ہے اسے نکاح کا اختیار دے' جلدی کر دیر ہوئی ہے۔'' ملک زبیر کی دانت پیستے' غصے سے لرزتی آواز بلند ہوئی۔ آمنہ کو ایسا لگا جیسے پھانسی کے تختے پر کھڑی ہے اور پاؤں کے نیچے سے تختہ کھسکنے والا ہے۔

''نہیں...... نہیں...... نہیں......'' ہذیانی آواز میں وہ چیخی۔

''نہ کی بچی تجھے تو میں دیکھ لوں گا۔ ادے آگے بڑھ کچھ کر......'' ادے نے آگے بڑھ کر آمنہ کے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دائیں سے بائیں ہلایا۔

''دیکھ گل دین ملالڑکی نے سر ہلا کر تجھے نکاح کی اجازت دے دی جا اب نکاح باندھ' میں چائے اور حلوہ حجرے میں بھیجتی ہوں۔''

''چلو ادے نکاح ہو گیا۔ تجھے مبارک ہو' ملک زبیر نے اندر آ کر ماں کے سامنے سر جھکایا۔

ماں نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ وگمہ نے آمنہ کے پاؤں بے دردی سے کھینچ کر دھوئے اور پلنگ پر نفرت سے دھکیل کر بٹھادیا۔

''چل ادے تو کمرے میں جا کر بیٹے کی دوسری دلہن لانے کی خوشیاں منا اور میں اُدھر کوٹھری میں بچوں کے ساتھ لیٹ کر سوکن ملنے کا رونا رولوں گی۔'' وگمہ نے ساس کو ہاتھ سے پکڑ کر باہر کی طرف دھکیلا۔

ذرا سی دیر میں ملک زبیر اپنی اونچی بھاری پگڑی اُتارتا آمنہ کی طرف بڑھا۔ آمنہ کا دل جال میں پھنسی سی کمزور چڑیا کی طرح دھک دھک کرنے لگا۔ کچھ دیر ملک زبیر پلنگ کے قریب کھڑا رہا۔ اور پھر آمنہ کے اوپر ایک طوفان آ کر گزر گیا۔ جو اس کے نازک وجود کو ریت کی طرح بہا کر لے گیا۔

ملک زبیر پلنگ سے اُترا اور آمنہ کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر لا پٹخا۔

''اُلو کی پٹھی تو کیا سمجھتی ہے میں تجھے بیوی بنا کر عزت سے رکھوں گا۔ نہیں میرا گال اب بھی تیرے تھپڑ کی گرمی سے سگ رہا ہے۔ اور میں جب تک تیرا یہ خوبصورت جسم اور شکل بگاڑ نہ دوں۔ یہ گال سلگتا ہی رہے گا۔'' آمنہ کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔

''چپ آواز نکلی تو یاد رکھ پھاڑ دوں گا۔

اپنے ہاتھ آگے بڑھا...... آ...... گے بڑھا...... اچھا...... کون سے ہاتھ سے تھپڑ رسید کیا تھا۔'' ملک نے اُس کے نازک ہاتھوں کو بے دردی سے مروڑ کر اپنے سامنے پھیلا لیے۔

''یہ سیدھا ہاتھ......'' آمنہ نے سوکھے پتے کی طرح لرزتے ہوئے جواب دیا۔

''رکھ ہاتھ کو پلنگ کے بازو پر...... رکھ...... کہ......'' آمنہ کے ہاتھ کو کھینچ کر سرخ پایوں والے پلنگ کے بازو پر رکھا۔ پھر ایک لمبا سا پتھر لے کر اُس کے نازک ہاتھ کی الٹی طرف کو چٹنی کی طرح پیٹنا اور رگڑنا شروع کر دیا۔ اور ساتھ ہی تھوکوں کی پھوار میں مغلظات کا ایک طوفان‘ جو اُس وحشی درندے کے منہ سے بغیر نان اسٹاپ کے نکل رہے تھے۔ آمنہ کے ہاتھ اور انگلیوں کا گوشت پِس‘ پِس کر جگہ جگہ سے پھٹ گیا۔

جب آمنہ میں مزید درد سہنے کی سکت نہ رہی تو اُسے چند لاتیں‘ گھونسے مار کر ملک حجرے کی طرف چلا گیا۔ روتی بلبلاتی‘ ماں کو یاد کرتی آمنہ جانے کس وقت بے ہوش ہوگئی۔ صبح آمنہ اپنی سوکن وگمہ کی ٹھوکر سے بیدار ہوئی۔

''اے اٹھ جا...... زمین پر لیٹی کیا کر رہی ہے۔ کیوں...... ملک کے لیے پلنگ کم پڑ گیا تھا۔ اُٹھ باہر آ...... آج تیری پہلی صبح ہے۔ ادے اور دادا کو سلام کر اور آ کر چائے بھی پی لے...... آج...... آج تیری خاطر داری کر رہی ہوں‘ کل سے تو نے گھر چلانا ہے۔''

''اٹھ...... ملک تو اب رات کو ہی آئے گا۔'' وگمہ نے بڑی رعونت اور طنزیہ لہجے میں بات کی۔ اٹھنے کی کوشش میں وہ بار بار نیچے گر جاتی بڑی سی چادر کو اپنے گرد لپیٹتی آمنہ چیونٹی کی چال چلتی باہر آنگن میں نکل آئی۔

''ہوں تو یہ ہے وہ شہر کی استانی...... جسے زبیرا بھگا لایا ہے ملک ہی کی طرح اونچا لمبا‘ سفید داڑھی والے شخص نے اُسے سر سے پاؤں تک گھورا۔ چل او وگمہ اسے بھی پاس بٹھا کر چائے پلا دے۔ سسر نے سلامی کے پینتیس روپے اس کے آگے پلنگ پر پھینکے اور پگڑی سنبھالتا باہر چلا گیا۔

''او...... لڑکی چل اِدھر پیڑھی پر بیٹھ۔'' وگمہ

نے چائے اور موٹا پراٹھا پیڑی کے سامنے سرکا دیا۔

''میرا جی نہیں چاہتا...... میں نہیں پیئوں گی۔'' آمنہ نخیف سی آواز میں منمنائی۔

''اے بی بی ایسے نہیں چلے گا۔ تیری سوکن کے چھوٹے چھوٹے پانچ بچے ہیں۔ وہ انہیں سنبھالتی ہے۔ میری اور سُسر کی خدمت کرتی ہے۔ حجرہ اور اُس کے مہمان سنبھالتی ہے۔ اور تُو ابھی چھڑی چھانٹ' اب تو تجھے بھی سارے کام کرنے پڑیں گے اور...... پھر زبیرے کا غصہ' اُس کی مار' اور اور سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔

''سمجھیں نا...... چل جا چولہے کنارے۔''

ساس نے اُس کی بری حالت کو نہ جانے کیا سمجھا۔ اور چائے کے گھونٹ لیتی' زیرلب مسکراتی رہی۔ وقت مٹھی میں بندریت کی طرح پھسلتا رہا۔ آمنہ کو اگر اپنے لوگ اب دیکھ لیتے تو یقین نہ کرتے کہ یہ وہی پھولوں کی نازک ڈال اسمارٹ' بذلہ سنج اور تعلیم یافتہ اور ٹیچرز طلباء کی یکساں ہر دل عزیز ٹیچر ہے۔ ہلدی جیسا پیلا زرد رنگ زخموں سے چور چور بدن گہرے سیاہ حلقوں کے پنجرے میں بند دو بے بس مجبور آنکھیں دایاں ہاتھ تو بے دم لٹک گیا تھا۔ بھلا ایک عورت کی مجال' جو مرد کے تھپڑ کا جواب دے سکے۔

بھینسوں' گایوں کے گوبر اٹھاتی دیواروں پر بھوسا ملا کر تھاپتی' تندور پر ڈھیروں روٹیاں تھاپتی' دہی بلوتی' بڑے سے کچے آنگن میں چھڑکاؤ کر کے جھاڑو لگاتی۔ ڈھیروں چکنائی سے لپے برتن دھوتی' اس کا جوڑ جوڑ ہل جاتا' اور رات گئے ملک زبیر کی لاتیں' ٹھڈے الگ سہتی۔

پھر وہ پے در پے تین بچوں کی ماں بھی بن گئی۔ مصلے پر بیٹھ کر اب بھی اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتی نہ تھکتی۔ اور آخر ایک محنتی' ایماندار نے اُس کی ماں کی دوبارہ اپیل اور رونے سسکنے کو اپنے لیے چیلنج سمجھ کر آمنہ کے اغواء کی پھر سے تفتیش شروع کر دی۔ اب کے اسکول جانے والے راستے کے گلی کے سرے پر باورچی خانے میں کام کے دوران آمنہ کے اغواء کا ڈرامہ دیکھتے ہوئے ایک ملازم نے زبان کھولی ورنہ باقی گھروں کے ملازموں نے اُسے سختی کے ساتھ ڈرایا اور روکا ہوا تھا۔

''بتا دے گا نا تو پھر مہینوں' سالوں تھانوں کے چکر کاٹتا رہے گا۔ گواہی دینا تو اپنی جان کو خود مصیبت میں ڈالنا ہوتا ہے۔''

''وہ جی میں کھڑکی کے سامنے سینک میں برتن دھو رہا تھا۔ گلی کے سرے پر سے صبح کافی استانیاں گزرتی ہیں۔ میں انہیں دیکھتا رہتا ہوں۔ (ذرا شرما کر) اُن میں ایک خوبصورت سی مس گزر رہی تھی۔ ایک ٹویوٹا راکھ رنگ کی گاڑی وہیں کھڑی ہوئی اور اُس مس کو چادر میں لپیٹ کر پچھلی سیٹ پر گرا دیا۔ میں نے بیگم صاب کو بتایا تو کہنے لگیں۔''

''دن رات ٹی وی کے سامنے بیٹھا رہتا ہے اب خود سے بھی ڈرامے بنانے لگا۔ چپ کر یہ بکواس کسی کے سامنے نہ دہرانا۔ بس جی میں نے نہ بتایا۔ پر اُس کی بوڑھی ماں ہر وقت اِدھر روتی لوگوں سے پوچھتی۔ میرا دل دکھتا بس آج آپ کو بتا دیا۔ پر مالکوں یا کسی کو پتہ نہ چلے۔ مجھے نوکری سے نکال دیں گے چھوٹے بہن بھائی ہیں۔''

ملازم نے تھانیدار اکرم کے آگے ہاتھ جوڑ کر استدعا کی۔ اُس اغواء کار کا حلیہ پتہ کیا۔ اسکول سے پتہ کیا ہر طرف ہاتھ پیر مارے۔ الیکشن میں آمنہ کے ساتھ ڈیوٹی کرنے والی میڈم صدیقہ نے ملک زبیر کے ساتھ کا واقعہ سنایا۔

سب نے کہا کہ وہ بہت صلح جو اور نیک بچی تھی۔ تھانیدار اکرم نے مردہ فائلوں میں پھر سے روح پھونکی۔ ملک زبیر کے ٹھکانے کا پتہ چلایا۔

لیکن وہ پاکستان کی حکمرانی سے ذرا دور کا علاقہ تھا اس لیے تھانیدار نے آمنہ کی ماں اور بھائی کو سن گن لینے بھیجا۔ جیسے تیسے کر کے ماں اس کے گھر پہنچی۔ سامنے ہی آمنہ کا سانس لیتا ڈھانچہ گوبر سے لتھڑے ہاتھ...... بکھرے سوکھے بال' ننگے پاؤں کھڑی حیرت اور سکتے کے عالم میں اپنی وقت سے پہلے بہت بوڑھی ہوتی ماں کو دیکھتی رہی۔

پھر جیسے اس کے دل پر کسی نے گھونسا دے مارا۔

''ماں...... ماں...... میری ماں......'' ماں کے سامنے زمین پر بیٹھ کر دو ہتھڑ چلاتی آمنہ چلائی۔ ماں نے اس ڈھانچے کو اٹھایا۔ پاگلوں کی طرح اسے ٹٹولنے لگی۔

''مینو' مینہ...... میری مینہ تُو تو زخم' زخم ہے دیکھ تیرا تو ہاتھ یہ دیکھ بے دم لٹک رہا ہے تجھے کیا ہوا میری حوروں جیسی بچی...... مینہ...... م...... ی...... نہ......''

آمنہ کے گلے میں ماں کے ہاتھ ڈھیلے ہو گئے اور پل بھر میں کسی دیمک زدہ درخت کی طرح دھڑام سے نیچے گر گئی۔ آمنہ کی ساس اور سوکن وگمہ نے اُسے اٹھانا چاہا لیکن بیٹی کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ پہلے جھٹکے میں دل نے کام بند کر دیا۔ آمنہ نے اپنی ساس' سسر' سوکن اور ملک کے پیر پکڑے...... ہاتھ جوڑے روئی منتیں کیں۔ اللہ کے واسطے دیے تو صرف اُسے ماں کی لاش شہر لے جا کر تدفین میں شرکت کی اجازت دے دی گئی۔ وہ بھی صرف ایک ہفتے کے لیے......

آمنہ بھائی کے ساتھ ماں کی لاش لے کر گئی تو لاش سے زیادہ لوگ اُسے دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ قل کے بعد اُس کی اسکول میٹس' بہن بھائی' رشتہ داروں غرض ہر کسی نے ملک زبیر سے خلع لینے کا مشورہ دیا۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ ملک زبیر کو نوٹس ملا تو اُس کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔ جس شکار کو وہ روز بوٹی بوٹی کر کے مزے لے لے نوچ رہا تھا۔ وہ اس کے چنگل سے نکل جائے گی۔ یہ وہ کب گوارا کر سکتا تھا۔ وہ آمنہ کے گھر گیا۔ انہیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دے کر گیا ہماری عدلیہ میں اچھے لوگ بھی ہیں۔ لیکن اس کی آنکھوں پر پٹی بھی تو بندھی ہوئی ہے۔ جو بعض وقت خود غرض لوگوں کو نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ سے بالکل اندھا کر دیتی ہے۔ انتقام کی آگ میں جلتے ملک زبیر نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے فسخ نکاح کا دعویٰ خارج کروا دیا۔ اور گھسیٹتا ہوا آمنہ کو پھر اُس جہنم میں لے گیا۔ اب کے تو اس کے جسم کو گرم سیخوں سے داغ داغ دیا گیا۔ ایسی مار پڑی کہ تیسرے ہی دن وہ دھڑام سے گری۔ چند گہری سانسیں لیں۔ بچوں کو گلے لگایا اور کلمہ پڑھتی ہوئی اس دنیا سے قبر کے دروازے میں داخل ہو کر ایک نئی دنیا کی زندگی کی طرف چل دی۔ ملک زبیر نے کھلی ڈاٹسن میں لاش کو ڈالا۔ اور پلنگ کو دروازے کے سامنے دھر کر کال بیل بجائی۔ بھائی باہر نکلا تو پلنگ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''لے تیری بہن کو خلع مل گئی۔ سنبھال اسے اور کبھی اُس طرف آنے کی کوشش بھی نہ کرنا...... آج ایک طاقت ور انسان جو مرد کہلاتا ہے۔ ایک کمزور انسان جو عورت کہلاتی ہے سے بدلہ لینے میں کامیاب و سرفراز ہوا۔ آمنہ میری بہت ہی اچھی دوست' ہمسائی اور بہنوں کی طرح تھی۔ آج اس کی برسی ہے۔ اور اس کی قبر پر دعا کر کے چند پھول چڑھا کر میں گھر آ گئی ہوں۔ یہی شاید ہم عورتوں کا مقدر ہے...... یہی شاید ہمارے مردوں کا مزاج مگر جو بھی ہے شام قفس بالآخر تمام ہوئی۔

☆☆......☆☆

نسوانیت

مجھے بڑی اچھی لگتی تھیں لڑکیاں چھپکلیوں اور کاکروچ کو دیکھ کر چیخیں مارتی ہوئی۔ نزاکت سے بھری ہوئی خود میری بہن اس جگہ سے 100 فٹ دور رہتی تھی۔ جہاں اس قسم کی چیزیں پائی جاتی تھیں۔ مگر ناں! جی نزاکت تو چھوڑو اس میں تو نسوانیت بھی......

مجھے شروع سے ہی عیشہ شدید قسم کی ناپسند تھی۔ خدانخواستہ اُس کی وجہ ہماری لڑائی وغیرہ نہیں تھی نہ ہی کچھ ایسا کہ وہ دیکھنے میں بری تھی ماشاءاللہ وہ خاندان کی چند بے حد حسین لڑکیوں میں سے تھی نہ بدتمیز تھی نہ لڑاکو اور نہ ہی اس میں کوئی اور قابل ذکر برائی تھی اور چند بشری خامیاں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں مگر مجھے اس میں کبھی کوئی بشری خامیاں بھی نظر نہ آئیں۔

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ شاید میرے دماغ میں کوئی خلل ہوگا جس کی باعث میں اتنی کمال لڑکی سے چڑتا تھا۔ تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مجھے لڑکیاں لڑکیوں کی طرح ہی اچھی لگتی تھیں۔ دھیما بولنے والی سبک چلنے والی کام کرنے میں تجربہ دکھانے والی' ناز و ادا دکھانے والی عیشہ سے چھوٹی عرشیہ کی طرح گوکہ عرشیہ دیکھنے میں عیشہ کا پاسنگ بھی نہیں تھی مگر مجھے پسند تھی۔

عرشیہ کے مقابلے میں عیشہ میں تو نسوانیت ہی مفقود تھی۔ آندھی طوفان کی طرح آتی اپنی بات کرتی اور چلی جاتی۔ جب خالہ کے گھر جانا ہوتا وہ مصروف ہی ملتی تھی۔ بڑے بڑے دیگچے چڑھائے کچھ پکانے میں مصروف یا سر پر دوپٹہ باندھے اسٹول پر چڑھی جالے اُتار رہی ہوتی۔ گھر کی صفائی ستھرائی ہو رہی ہوتی تھی۔ پائپ لگا کر فرش دھونے میں مصروف ہوتی واشنگ مشین لگا کر کپڑے دھل رہے ہوتے' برتن دھو کر خشک ہو رہے ہوتے۔ اور کچھ نہیں تو خالہ کے سر کی مالش کر رہی ہوتی ان کے کندھے یا ہاتھ پیر دبانے میں مصروف ہوتی۔

اور خالہ احتجاج کر رہی ہوتیں۔

''ارے میرا بچہ! کیا میں آرام کر کر کے تھک گئی جو مجھے دبا رہی ہے سارا گھر تو خود کو سنبھالا ہوا ہے۔ دبانا تو مجھے چاہیے تجھے مگر وہ ان سنی کر کے اپنا کام کرتی رہتی اور مسکراتی رہتی۔

ان ہمہ وقت کی مصروفیات کے باوجود بھی اُس کا تعلیمی ریکارڈ شاندار تھا۔ مجھے حیرت

ہوتی تھی۔ میں بہت پڑھتا تھا تب بھی 70s میں مارکس آتے تھے اور وہ ہمہ وقت کام میں مصروف رہ کر بھی 80 میں مارکس لاتی تھی اور انٹر پری انجینئرنگ کے شاندار رزلٹ پر تو میں نے جل کر پوچھ ہی لیا۔

''تم پڑھتی کس وقت ہو؟'' اور وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

''رات کے کھانے کے بعد اور صبح فجر کے بعد.....'' جواب مزے سے دے کر اُس نے مجھے دیکھا۔

''اور تم کس وقت پڑھتے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''میں تو ہر وقت ہی پڑھتا ہوں۔'' میں نے بے زاری سے کہا۔

''ہر وقت مت پڑھا کرو۔ اس سے ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے۔ صبح فجر کے بعد پڑھا کرو۔ دیکھنا کتنا فرق پڑتا ہے اور پھر واقعی میں نے صبح میں پڑھنا شروع کیا تو میری کارکردگی پہلے سے بہت اچھی ہوگئی۔ میں MBA کا اسٹوڈنٹ تھا۔

اب آپ اُس کی ساری کارکردگی سن کر سوچ رہے ہوں گے کیا پاگل انسان ہے جن خوبیوں کو سراہنا چاہیے ان پر غصہ کر رہا ہے۔ تو اُس کی ان خوبیوں کا تو میں متعارف تھا۔ مگر اس کے مردوں والے کاموں سے مجھے سخت چڑ تھی۔ ان تمام کاموں کا جن کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے علاوہ اکثر خالہ کے گھر جانے پر ایسے سین بھی دیکھنے کو ملتے۔ عیشہ صاحبہ اسٹول رکھے پنکھے کا Capasitor لگا رہی ہوتی تھیں۔ یا سیور بدل رہی ہوتیں' نلکے کا ٹیکنا جانچ رہی ہوتیں۔ پانی کی موٹر کی بیلٹ لگائی جارہی ہوتی سلائی مشین کی موٹر ٹھیک کر رہی ہوتیں۔ واشنگ مشین کی موٹر بدل رہی ہوتیں۔ ایسا نہیں تھا کہ گھر میں کوئی مرد نہیں تھا خالو کے علاوہ اس کے دو بھائی بھی تھے۔ سنان اور عیشان اور اکثر جب وہ اس قسم کے کام انجام دے رہی ہوتی تھیں تو وہ گھر میں موجود ہوتے تھے مگر ناں! جی مردوں سے کسی کام کا کہنا تو ان کی شان کے خلاف تھا۔

کیونکہ وہ تو اپنے گھر کی ماسی' مکینک' پلمبر اور گارڈز سب کچھ خود ہی تھیں۔

اور اس دن تو میری اس سے تھوڑی بہت دلچسپی بھی ناپسندیدگی میں بدل گئی جب کہیں سے ایک چھپکلی آنکلی عرشیہ چیخیں مارتی ہوئی میرے پیچھے آکھڑی ہوئی اور ابھی میں ہیرو بن کر چھپکلی مارنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کہیں سے عیشہ بی بی ہیتوں والی جھاڑو پکڑے برآمد ہوئیں اور جھاڑو پٹ سے چھپکلی کو دے ماری اور وہ بے چاری چھپکلی تو دوسری سانس بھی نہ لے سکی وہیں ساکت ہوگئی۔

مجھے بڑی اچھی لگتی تھیں لڑکیاں چھپکلیوں اور کاکروچ کو دیکھ کر چیخیں مارتی ہوئی۔ نزاکت سے بھری ہوئی خود میری بہن اس جگہ سے 100 فٹ دور رہتی تھی۔ جہاں اس قسم کی چیزیں پائی جاتی تھیں۔

مگر ناں! جی نزاکت تو چھوڑو اس میں تو نسوانیت بھی نام کو نہ تھی۔ سارے مرد مار قسم کے کام' ارے بھئی مجھے بھی پتہ ہے یہاں مرد مار نہیں مردانہ وار کام آئے گا۔ مگر ان دنوں میری اُردو اتنی اچھی نہیں تھی اور میں مرد مار قسم کے کام ہی کہتا تھا۔

بہر حال اس دن سے عیشہ میرے دل سے

قطعی اتر گئی اور اُس کی جگہ اپنے پیچھے چھپنے والی عرشیہ نے لے لی۔ مجھے اس دن اُس کا مجھے نہ بلا کر خود چھپکلی مارنا بہت کھلا تھا میری مردانہ EGO بہت بری طرح سے ہرٹ ہوئی تھی۔
اور میں نے عرشیہ سے پوچھ بھی لیا۔
''کیوں ہے یہ ایسی؟''
''کیسی؟'' عرشیہ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔
''ہر کام میں گھسنے والی جو کام اس کے کرنے کے نہیں ان میں بھی گھسی رہتی ہے۔''
میں خاصا چڑا ہوا تھا۔
''اس کو شوق ہے ہر وقت سب کی نظروں میں رہنے کا۔'' عرشیہ کے لہجے میں کسی ناگن کی سی پھنکار تھی۔ اور مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہے۔ جو عیشہ کو ناپسند کرتے ہیں یعنی میری گروپ ممبر تھی وہ...... اور بس اسی دن سے وہ میری گڈ بک میں شامل ہوگئی۔ دشمن کا دشمن دوست کی مصداق......
اس دن میں نے عیشان اور سنان کو بھی غیرت دلانے کی کوشش کی۔
''تمہیں برا نہیں لگتا جب وہ تمہارے حصے کے کام بھی خود کرنے کھڑی ہو جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔
''نہیں لیکن کیوں برا لگے گا۔'' عیشان نے کہا۔
''ہاں کیوں برا لگے گا جبکہ وہ یہ سارے کام ہمارے خیال سے ہی کرتی ہے۔ اصل میں اس میں احساسِ ذمے داری بہت زیادہ ہے۔ وہ کہتی ہے بھائی آپ دونوں......
''اچھا اچھا اور جلدی جلدی پڑھ کر اچھی جابز پر لگ جاؤ اور بابا کا بازو بنو وہ اب بہت بوڑھے اور کمزور ہو چکے ہیں۔'' سنان نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔
''ہاں اور اس نے ہمیں اتنا ریلیکس رکھا ہوا ہے کہ ہم زیادہ کورس بھی اٹھا لیتے ہیں۔''
عیشان نے کہا تو میری نظر عرشیہ پر پڑی جو اس کی تعریفوں پر بڑے زہر خند انداز میں بھائیوں کو دیکھ رہی تھی۔
''ہاں سب کچھ وہی ہے میں تو کچھ نہیں ہوں۔'' عرشیہ نے چڑ کر کہا۔
''کیوں نہیں ہو تم تو ہماری ننھی سی پیاری سی بہن ہو۔'' سنان نے اسے خود سے لگایا۔
''جو صرف آرام کرنے کے لیے دنیا میں آئی ہو۔'' عیشان نے اسے چھیڑا تو اس نے چڑ کر پاس پڑا کشن اسے دے مارا۔ ان سب بہن بھائیوں میں ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ عیشان اور سنان جڑواں تھے پھر عیشہ تھی اور اس سے سال بھر چھوٹی عرشیہ......
''اور یوں بھی عیشہ کی تو لائن ہی انجینئرنگ ہے اچھا ہے ابھی سے وہ یہ سب سیکھ لے۔'' عیشان نے کہا۔
''لیکن اس نے مکینیکل انجینئر نہیں سول انجینئر بننا ہے۔'' میں نے کہا۔
''سو تو ہے مگر گھر میں ضرورت تو رہتی ہے آئے دن ان کاموں کی تو اگر وہ سیکھ رہی ہے تو اس کا شوہر ہی مزے میں رہے گا بعد میں ہمیں ہی دعائیں دے گا۔'' سنان نے کہا تو میں نے سر ہلا دیا مگر میں غیر متفق ہی تھا۔ میرا اب بھی وہی خیال تھا کہ مردوں والے کام مردوں کو خود کرنے چاہئیں۔

☆......☆......☆

اب یہ میری قسمت کہ وہ شخص میں ہی تھا

جس سے اس کے دونوں بھائیوں کو امید تھی کہ وہ شکر گزاری سے مرا جائے گا ان کی بہن کو عقد میں لینے کے بعد......

یہ سب کیسے ہوا تو میری جیسے ہی تعلیم مکمل ہوئی امی کو میری شادی کی فکر لاحق ہوگئی اور میں نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی امی میری پسند پوچھیں گی میں جھٹ سے عرشیہ کا نام لے دوں گا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

اس دن میں گھر پہنچا تو زرش اور امی بہت خوش خوش نظر آ رہی تھیں۔ میں امی کے پاس آ کر بیٹھا۔

''کیا بات ہے ماں! کیا کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے؟'' میں نے خالص فلمی انداز میں ماں کہا تھا۔

''ہاں میرے چاند! خزانہ ہی سمجھو۔'' وہ بھی میری ہی ماں تھیں بالکل میرے ہی انداز میں جواب دیا۔

''بتائیں ناں کیا بات ہے ماشاءاللہ آپ دونوں بہت خوش نظر آ رہی ہیں۔'' میں نے تجسس سے کہا۔

''بات ہی خوشی کی ہے میرے لعل!'' امی ابھی بھی غالباً سسپنس رکھنا چاہ رہی تھیں اور میرا تجسس سے برا حال تھا۔

''تو بتائیں ناں امی۔'' اب میں نے چڑ کر کہا۔

''اتنی بڑی خوشی کی خبر ایسے ہی تھوڑی بتاؤں گی جاؤ زرش پلیٹ میں مٹھائی نکال کر لاؤ'' امی نے مجھ سے اور زرش سے بیک وقت بات کی۔ اور زرش بھی بوتل کے جن کی طرح سیکنڈوں میں مٹھائی کی پلیٹ سمیت حاضر تھی امی نے پلیٹ میری سمت بڑھائی۔ جس میں پائن ایپل اور کھوئے کی میری پسند کی مٹھائی تھی ساتھ ہی چمچہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اور میں نے واہ کہتے ہوئے چمچہ بھر کر منہ میں رکھ لیا۔

''وہ میں اور تمہارے ابو آج عائشہ (خالہ) کی طرف گئے تھے عیشہ کا ہاتھ مانگنے اور انہوں نے ہاں کردی ہے۔'' امی نے دھماکہ کیا اور مجھے لگا کہ میری فیورٹ مٹھائی میں آج حلوائی نے چینی کی جگہ کونین ڈال دی ہے۔

''مگر امی! آپ نے مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا۔'' میں نے چڑ کر سامنے ٹیبل پر پڑے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر مٹھائی اس میں اگل دی۔

''تمہیں کوئی اور پسند ہے کیا؟'' امی کے چہرے پر تاریکی پھیل گئی۔

''امی اسی گھر میں ایک اور لڑکی بھی تو ہے۔'' میں نے کہا تو امی سے زیادہ زرش کے چہرے کے زاویے بگڑے تھے۔

''اور اس دوسری لڑکی میں کوئی ایک خوبی جو پسند کرنے کے لائق ہو۔ نہ شکل نہ عقل، پڑھائی میں ڈفر، گھر کے کام کاج سے نابلد، ہڈحرام موٹی۔'' پتہ نہیں زرش میں عرشیہ کے حوالے سے کتنا زہر بھرا ہوا تھا۔

''امی! دیکھ رہی ہیں آپ اسے۔'' میں نے امی کو مدد کے لیے پکارا۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے کوئی ایک خوبی ہو تو بتاؤ اس میں۔'' امی نے مجھے بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔

میں نے مانا کہ نہیں کوئی بھی خوبی اس میں پھر وہ اک شخص ہزاروں میں نمایاں کیوں ہے میں نے اپنے جذبات کو شاعری میں

ڈھالا۔

''نظر کی عینک لے لیں پہلی فرصت میں Back Bencher آپ کو نمایاں نظر آرہے ہیں۔'' زرش نے چڑ کر کہا۔

''جب عقل پر پتھر پڑ جائیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' امی نے بھی کہا۔

''ہڈ حرام بلا کی ہے اس عمر میں ماں سے چکیاں پسوانا۔'' امی نے روہانسا ہو کر کہا۔

''امی! میری اچھی جاب ہے میں ماسیاں رکھ لوں گا۔'' میں نے امی کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا۔

''سب کام ماسیاں نہیں کرتیں کچھ کام عورت کو بھی کرنے ہوتے ہیں۔ ملازم کے دم پر گھر نہیں چلا کرتے۔ وہ بلا کی پھوہڑ اور ہڈ حرام ہے تمہاری زندگی جہنم بنا دے گی۔'' امی نے سمجھایا۔

''مگر امی وہ میری پسند ہے۔'' میں بھی اپنے موقف سے ہٹا نہیں۔

''تو ٹھیک ہے جا کر اپنی خالہ سے بات کر لو خود ہی کیونکہ ہمارا تو منہ پڑے گا نہیں کہ خود سے بڑی کو مانگ کر خود ہی اسے رد کر کے چھوٹی کے لیے دست سوال دراز کر دیں۔'' امی بڑی بے دلی سے اُٹھ کھڑی ہوئیں ساتھ ہی زرش نے سامنے رکھی مٹھائی کی پلیٹ بھی اٹھالی گویا مجھے یہ مٹھائی کھانے کے حق سے بھی دست بردار کر دیا۔

☆......☆......☆

میں نے امی سے تو کہہ دیا مگر کئی دن سوچتا رہا مگر خالہ کے گھر جانے کی ہمت نہ کر سکا مگر کب تک اس مصیبت اس بلا کو بھی تو سر سے اتارنا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو محترمہ واشنگ مشین کو زمین پر لٹائے ڈرائیر کی موٹر بدلنے میں مصروف تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے سلام جھاڑا۔ اور زندگی میں پہلی بار اس کی نظریں جھکیں اور اُس کا گلابی چہرہ سرخ ہو گیا ار میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''گویا یہ انداز بھی آتے ہیں محترمہ کو...... نسوانیت سے بھرپور۔'' میں سوچ کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔

لیکن جو کہنے گیا تھا اس کے لیے منہ ہی نہیں پڑ سکا کیونکہ وہاں تو اس دن مجھے بڑا اسپیشل پروٹوکول ملا خالہ تو دیکھتے ہی شروع ہو گئیں۔

''ارے شُرِم (Shurem) تم تو عید کا چاند ہو گئے نظر ہی نہیں آتے ہو تم نے تو ابھی سے ہمیں سسرالی اور اس گھر کو اپنا سسرال سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ ارے یہ تمہارا سسرال بعد میں خالہ کا گھر پہلے ہے۔'' خالہ نان اسٹاپ شروع تھیں۔

''نہیں خالہ ایسی بات نہیں ہے۔'' میں نے تمہید باندھنے کی کوشش کی۔

''ایسی ہی بات ہے جس دن سے آپا نے عیشہ کا ہاتھ مانگا ہے اسی دن سے تم غائب ہو۔'' انہوں نے میری بات سنی ہی نہیں۔

''وہ بات یہ ہے کہ......'' میری بات ادھوری تھی کہ خالہ نے کاٹ دی۔

''بات وات کو چھوڑو آج مجھے آنا بھی تھا تمہاری طرف مٹھائی لے کر...... عیشہ کی پھوپی آئی تھیں عیشہ کا رشتہ لے کر مگر جب انہیں پتہ چلا کہ ہم نے اُس کی بات تم سے طے کر دی ہے تو بڑی ناراض ہوئیں کہ کوئی رشتے ناطے ایسے طے ہوتے ہیں بڑی مشکل سے منایا تو انہوں نے عرشیہ کی بات کی افراہیم کے لیے اور ہاں

کروا کر ہی اٹھیں۔'' وہ سانس لینے کو رکیں۔

''تو آپ نے عرشیہ کا رشتہ طے کر دیا۔'' مجھے اپنی آواز کسی گہری کھائی کی گونج لگی۔

''ہاں اب اسی کی تو مٹھائی دینی تھی آپا کو اور بات بھی کرنی ہے کہ کوئی چھوٹی موٹی رسم بھی ادا کر لی جائے تاکہ خاندان والوں کو بھی خبر ہو جائے۔'' خالہ نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''پتہ نہیں امی ابو سے بات کر لیں۔'' میں نے بے دلی سے کہا اسی دوران عیشہ لوازمات سے بھری ٹرالی اسی شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ میرے سامنے رکھ گئی تھی۔

''ہونہہ وہی مشورہ کرنا ہے تو میں شام تک آتی ہوں تمہارے خالو کے ساتھ...... ارے تم تو ایسے ہی بیٹھے ہو یہ سب منہ دیکھنے کو نہیں بنایا میری بیٹی نے۔'' خالہ کے لہجے میں بیٹی کی محبت تھی۔

''وہ خالہ! عرشیہ خوش ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''لو بھلا خوش کیوں نہیں ہوگی ماشاء اللہ! افراہیم بھی تمہاری ہی طرح اچھا پڑھا لکھا۔ اچھی جاب باتمیز اور چندے آفتاب و چندے ماہتاب ہے تم ملے تو ہو اس سے۔'' خالہ نے افراہیم کی خوبیوں کا کھاتا کھول لیا۔ خالہ صرف ملنے کا کہہ رہی تھیں جبکہ افراہیم سے میری اچھی دوستی تھی اور میرا دل چاہا کہ اسی دوستی کا واسطہ دے کر عیشہ اس کے نام کر دوں اور عرشیہ اپنے نام کروالوں۔ مگر ایسا سوچا جا سکتا تھا عمل ناممکن تھا کیونکہ یہ زندگی تھی کوئی گڑیا گڈے کا کھیل نہیں تھا۔

☆......☆......☆

اس دن عرشیہ بھی میرے پاس بیٹھی تو مجھے جیجو، جی جو کر کے چھیڑتی رہی۔ گویا جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ خالہ میری خوش بختی کے گن گاتی رہیں کہ میرا رشتہ آتے ہی ان کی دوسری بیٹی کا نصیب بھی کھل گیا۔ اور میں جلتا کڑھتا رہا۔ گھر آ کر میں نے عیشہ کے لیے امی کو ہاں کہہ دی۔ امی اور زرش کا چہرہ کھل گیا۔ اور میرا بجھ گیا۔

☆......☆......☆

منگنی مشترکہ رکھی گئی دونوں کپلز کی، عیشہ اس دن حسب معمول بہت پیاری لگ رہی تھی ہر کوئی تعریف کر رہا تھا۔ مگر جو لوگ دل پر نہ چڑھ سکیں وہ کبھی پیارے نہیں لگ پاتے ایسا ہی میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ مجھے تو نارمل سی لگتی عرشیہ افراہیم کے پہلو میں بیٹھی کھل رہی تھی۔

منگنی بخیر و خوبی انجام پا گئی تو اب ایک ڈیڑھ سال بعد ہونے والی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں امی اور زرش مجھ سے چیزوں کے بارے میں پوچھتی تو میں بے دلی دکھاتا ایک دن میں آفس سے آیا تو امی اور زرش باتیں کر رہی تھیں۔

''امی! مجھے بھائی خوش نہیں لگتے۔ کہیں ہم کچھ غلط تو نہیں کر رہے؟'' زرش کی آواز میں اندیشے تھے۔

''یہ اس کا ہی نہیں آج ساری نسل کا المیہ ہے اپنے لیے ہیرا چھوڑ کر کوئلہ پسند کرتے ہیں۔ اور پھر ان کے ہاتھ بھی کالے ہوتے ہیں اور منہ بھی، ابھی ناراض ہے لیکن دیکھنا ایک دن یہ میرے مجھے ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں دے گا۔ میں ماں ہوں اس کی اسے کھائی میں گرتا نہیں دیکھ سکتی۔'' امی نے کہا تو میں بے دلی سے ان

سے ملے بغیر کمرے میں آ گیا۔

☆......☆......☆

اور پھر شادی کا دن آ پہنچا۔ پھوپو سے بات کر کے خالہ نے دونوں بیٹیوں کی شادی ساتھ ہی رکھ لی۔ شادی والے دن عیشہ ڈیپ ریڈ کلر کے شرارے میں آسمان سے اتری حور لگ رہی تھی ایسا لگتا تھا کوئی پری فیری تو پیا سے راستہ بھٹک کر زمین پر آ گئی اور پھر اس کے بیٹھنے کا مغلیہ شہزادیوں والا انداز کوئی نارمل بندہ ہوتا تو ہوش وحواس کھو دیتا۔ مگر میں نارمل تھا ہی کب' دوسری جانب عرشیہ بھی اچھی لگ رہی تھی۔ مگر مسلسل باتیں کر رہی تھی۔ خالہ خالو سے اپنے دونوں بھائیوں سے اور تو اور افراہیم سے بھی اور وہ اسے ہنس ہنس کر واسطے دے رہا تھا کہ آج تو خاموش ہو جاؤ ایک دن تو عزت رہنے دو اللہ کے واسطے......

شادی سے اگلے دن عیشہ خاصی پژمردہ سی تھی' ویسی کھلی کھلی نہیں تھی جیسی کہ عموماً شادی کے بعد لڑکیاں ہوتی ہیں گو کہ میں نے اس سے کچھ کہا نہیں تھا مگر غالباً وہ میرا گریز اور اوپرا پن محسوس کر چکی تھی۔

اس کے بعد زندگی چل پڑی میں نے کبھی بھی عیشہ کو خود سے بے تکلف ہونے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ہمیشہ ایک تناؤ بھرا' تکلف بھرا فاصلہ رکھا۔ دوسری طرف افراہیم کا شادی سے پہلے ہی ملک سے باہر جانے کا ارادہ تھا۔ سو وہ چھ مہینے کے اندر عرشیہ کو لے کر کینیڈا چلا گیا۔

عیشہ سے منگنی کے بعد سے اب تک میری دو بار ترقی ہو چکی تھی اور امی اسے عیشہ کی خوش بختی سے محمول کرتی تھیں۔ پہلے تو میں ٹالتا رہا لیکن ایک دن انہوں نے یہ بات عیشہ کے سامنے کہہ دی میں نے دیکھا اس کے لبوں پر بڑی خوبصورت مسکان دیکھی تھی۔ اور میرے اندر آگ لگ گئی۔

''واہ! امی واہ ساری محنت میری اور آپ اسے دوسروں کے کھاتے میں ڈال دیں۔'' میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کی مسکان فوری سمٹی تھی۔

''دوسرے کون بھائی! یہ آپ کی نصف بہتر ہیں آپ کا لباس' یہ میں نہیں قرآن کہتا ہے۔'' زرش نے ملامتی نظروں سے مجھے دیکھ کر خاصے دکھ سے کہا۔

''اور محنت تو تم پچھلے چار سال سے کر رہے تھے تو ترقیوں کا سلسلہ پچھلے ڈیڑھ سال سے عیشہ کی منگنی کے بعد سے کیوں شروع ہوا۔'' امی بھی کہاں چپ رہنے والی تھیں۔

''بہر حال میں اس سب کو نہیں مانتا تھا میری ترقی میری محنتوں کا ثمر ہے۔'' میں یہ کہہ کر اٹھ گیا۔

☆......☆......☆

عیشہ کے امی ابو اور زرش سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ اور ابو تو اس سے بہت ہی خوش تھے۔ کیونکہ پہلے جن کاموں کے لیے انہیں پلمبر' مکینک اور دیگر لوگوں کو بلانے کے لیے دوڑایا جاتا تھا۔ وہ سب کام اب ان کی بہو ہی انجام دیے دیتی تھی۔ ابو اکثر کہتے تھے۔

''یہ بہو نہیں ہے میری بیٹی ہے۔'' اور کہتی کہتیں:''' کام کے سلسلے میں چھلاوہ ہے۔'' اور زرش کو تو دوست' بہن' ساتھی اور دوسرا ہٹ سب مل گیا تھا۔

صرف ایک میں بدنصیب تھا۔ جسے جیون ساتھی ہوتے ہوئے بھی یہ سکھ نصیب نہیں تھا۔

بہر حال یہ دماغ کا فتور بھی خود میرا اپنا ہی تھا۔

☆......☆......☆

عیشہ کی شروع میں ایک عادت تھی کہ اگر میں جلدی آ جاتا تو پوچھتی تھی کہ ''ارے آپ جلدی آ گئے؟'' کچھ دن تو میں برداشت کرتا رہا کیونکہ میں نے ایسا ہی سوال اسے خالو سے اکثر کرتے دیکھا تھا۔ اور خالو کا جواب ہوتا۔

''ہاں کام جلدی ہو گیا تھا تو میرا دل چاہا کہ فوراً اپنی بیٹی کے ہاتھ کی گرما گرم چائے پیوں سو میں آ گیا۔''

شاید ایسا ہی وہ کچھ مجھ سے بھی سننا چاہتی تھی کہ جہاں محبت ہو وہاں Expectations بھی ہوتی ہیں کیا ہوا جو مجھے اس سے محبت نہیں تھی وہ خود تو مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ اور یہ اس کے ہر انداز سے ظاہر تھا۔ اور ایسا ہی ایک دن تھا جب اس نے مجھ سے میرے جلدی آنے پر یہ سوال کیا تھا اور میں پھٹ پڑا۔

اگر جلدی فارغ ہو جایا کروں تو کہاں جایا کروں' بتاؤ مجھے سڑک پر وقت گزارہ کروں یا کہیں افیئر چلالوں' اس کے ساتھ وقت گزارہ کروں۔'' میرا لہجہ خاصا بلند اور ہتک آمیز تھا اس نے سہم کر مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''سوری! آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' وہ بھرائے لہجے میں کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اور پھر واقعی اس نے مجھ سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا کسی بھی سلسلے میں......

مشرقی عورت میں ایک بڑی اچھی خاصیت ہوتی ہے اگر اسے اپنے رائٹ مین سے محبت نہ ملے تب بھی اپنی محبت کا دامن اس کی جانب سے سمیٹتی نہیں ہے ہاں خود کو نہ ملنے والی محبت پر سمجھوتہ کر لیتی ہے۔ سو اس نے سمجھوتہ کر لیا۔

میرا رویہ اس کے ساتھ اتنا بدصورت تھا کہ وہ اپنے وجود میں میرے لیے سمٹ گئی۔ باقی سب سے اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ مگر میرے ساتھ وہ بھی لیے دیے رہنے لگی۔ صرف کام کی بات کرتی تھی۔ میرے رویے کی بدصورتی کو امی اور زرش دونوں محسوس کرتی تھیں۔ اور وہ اکثر سمجھانے کی کوشش کرتیں مگر میں نے ایک دن ان سے بھی بڑی سختی سے کہہ دیا۔

''امی! یہ میرا اور میری بیوی کا معاملہ ہے اور میں اس میں کسی کی بھی مداخلت برداشت نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا اور امی نے مجھے بڑی شاکی نظروں سے دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

شروع شروع میں جب تقریبات میں جانے کے لیے وہ تیار ہوتی تھی تو مجھے ضرور مسکرا کر دیکھتی تھی۔ ظاہر ہے ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا شوہر اسے سراہے۔ مگر میں نے کبھی اس کی تعریف نہیں کی۔ خواہ وہ کتنی ہی حسین کیوں نہ لگ رہی ہوتی۔ چاہے بعد میں تقریب کے دوران نظریں اس کے حسین وجود سے لپٹ لپٹ جاتیں۔ مگر میرے منہ سے تعریف کا ایک لفظ نہیں نکلتا تھا۔ اور میرے تعریف نہ کرنے پر اس کا دمکتا وجود ماند پڑ جاتا تھا۔ بعد میں امی ابو اور زرش اس کی تعریفوں کے قلابے ملا دیتے مگر اس کی بجھی ہوئی روشنی واپس نہیں آتی تھی۔ پھر اس نے یہ سب بھی چھوڑ دیا اب وہ بغیر کسی ستائش کی تمنا کے تیار

ہوتی اور باہر نکل جاتی تھی۔ جہاں امی کہیں بھی جانے سے پہلے اپنی دونوں بیٹیوں پر نظر کا دم ضرور کرتی تھیں۔

☆......☆......☆

ان دنوں زرش کا رشتہ آیا تھا۔ رشتہ بہت اچھا تھا امی ابو اور مجھے ہمیں سب کو بہت پسند آیا۔ عیشہ ان دنوں ماں بننے کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ زرش کے سسرال والوں نے شادی کا وقت تو ایک سال کا لیا مگر وہ منگنی ابھی فوراً کرنا چاہتے تھے۔ امی عیشہ کی طبیعت کے پیش نظر منگنی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ کیونکہ کچھ بھی کھایا پیا نہیں جا رہا تھا اس سے...... وہ جو کھاتی تھی الٹیاں لگ جاتی اُسے...... اسے کچھ بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ دن بدن ویک ہو رہی تھی۔

مگر شاباش ہے اس پر اُس نے امی کو راضی کر ہی لیا۔ زرش کے سسرال والوں کا مسئلہ یہ تھا کہ معصب کی والدہ پر معصب کی شادی خاندان میں کرنے پر بہت دباؤ تھا۔ وہ دو بہوئیں خاندان سے لا چکی تھیں۔ اب ایک باہر سے لانا چاہتی تھیں۔ اور پھر معصب کو بھی خاندان کی کوئی لڑکی پسند نہیں تھی۔ اور صرف اس وجہ سے کہ رشتہ بہت اچھا ہے کوئی بدمزگی نہ ہو جائے عیشہ نے اپنی طبیعت کا خیال نہ کیا۔ اور امی کو منگنی کے لیے راضی کر لیا۔

منگنی بینکوئٹ میں رکھی گئی۔ دونوں فیملیز نے مل کر ایک ہی تقریب رکھ لی۔ زرش بہت پیاری لگ رہی تھی۔ زرش اور معصب کا جوڑا بڑا شاندار تھا۔

حسین تو عیشہ بھی بہت لگ رہی تھی ڈارک گرے اور ریڈ کلر کے سوٹ میں چہرے پر ممتا کا نور لیے وہ کوئی اپسرا دکھائی دے رہی تھی مگر میں نے حسب معمول اسے درخور اعتناء نہیں سمجھا تھا۔ تقریب کے دوران ہی پتہ نہیں کیوں مجھے اچانک سے پیلی پیلی سی دکھائی دینے لگی تھی۔ مگر میں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ تقریب بحسن خوبی اختتام پذیر ہوئی۔ اور معصب کے گھر والوں کے جاتے ہی وہ ڈھے گئی اسے ہال سے ڈائریکٹ ہاسپٹل لے جانا پڑا۔ اسے شدید قسم کا Dehydration ہوا تھا۔ ڈرپ لگی تھی۔

دوسرے دن معصب کی والدہ آئی تھیں۔

''ارے بہن اگر اتنا مسئلہ تھا عیشہ کے ساتھ تو آپ بتا دیتیں۔ ہم چھوٹی موٹی رسم گھر پر ہی کر جاتے۔'' انہوں نے گلہ کیا۔

''امی کا کوئی قصور نہیں ہے میری بیوی کو نمبر بنانے کی عادت زیادہ ہے۔'' میں نے جل کر کہا۔ کہ کل تقریب کی تھکن اور رات سے مستقل ہاسپٹل میں تھے میں اور امی......

''اسے محبتیں کرنا اور نبھانا کہتے ہیں جو مردوں کو نہ کرنا آتی ہیں نہ نبھانا آتی ہیں۔'' امی کے لہجے میں واضح تنبیہ تھی اور میں چپ ہو گیا۔

''اور ہمیں ایسا ہی گھرانہ چاہیے تھا۔'' آنٹی نے کہا اور میں نے جل کر اسے دیکھا جو خود تو آرام سے بیڈ پر لیٹی تھی اور ہمیں خوار کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

بہر حال پورے ٹائم اس کی الٹیاں نہیں رکیں۔ پھر ایک خوبصورت سی صبح اس نے میرے بیٹے کو جنم دیا۔ پہلی بار باپ بننے کے احساس نے مجھے اندر تک سرشار کر گیا۔ جب اسے بچے کے ساتھ روم میں شفٹ کیا گیا تو

میرے اندر داخل ہونے پر اس نے مجھے بڑی آس سے دیکھا تھا مگر میں اسے نظرانداز کر کے اپنے ننھے شہزادے کی کارٹ پر آ گیا۔ امی نے آگے بڑھ کر میرے منہ میں مٹھائی ٹھونس دی۔ جو میں نے منہ سے آدھی توڑ کر آدھی ہاتھ میں پکڑ لی اور ایک ہاتھ میں اپنے بیٹے کو اٹھا لیا۔ مٹھائی پوری کھا کر میں نے ہاتھوں پر لگا شیرہ اس ننھے فرشتے کے لبوں سے لگا دیا۔ اور وہ چٹورہ فوراً چپٹ گیا۔

امی، ابو، زرش، میں اور عیشہ ہم سب بہت خوش تھے۔ میں جتنی دیر کمرے میں رہا اپنے بیٹے میں ہی لگا رہا۔ میں نے نہ عیشہ کی خیریت پوچھی نہ ہی اسے کوئی حرف تسلی دیا۔

میں نے اپنے ننھے سے دنیاوی ذائقوں سے نا آشنا بیٹے کو تو شیرہ چٹا دیا۔ مگر دو میٹھے بول اپنی بیوی کے کانوں میں نہ اتارے کہ جس نے پل پل مر کر میری اولاد کو جنم دیا تھا۔

تو ثابت ہوا کہ میں بھی عام سا مشرقی مرد تھا جس کی نگاہوں کو بیوی کا حسین وجود بھاتا تھا مگر جس کا دل بیوی کی محبت سے۔۔ خالی تھا۔ مگر محبت نہ ہونے کے باوجود جس نے اسی ناپسندیدہ وجود سے اپنی اولاد حاصل کر لی تھی۔

☆......☆......☆

گھر والوں کو اریب کے روپ میں کھلونا مل گیا تھا میں نے بیٹے کا نام بھی خود رکھا تھا۔ اس سے پوچھا تک نہیں تھا۔ مگر اس اللہ کی بندی نے ایک بار بھی شکوہ نہیں کیا۔

زرش کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی جو کہ چھ ماہ بعد کی تھی۔ ہمارے ہاں روپے پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ دکانیں اور گھر کرائے پر تھے ابو کی پنشن آتی تھی۔ میں نے بھی ایک بڑی رقم امی کو دی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ساری بڑی بڑی چیزوں کی خریداری آخری تین مہینوں میں کرنے کا تھا۔

اور جب تین مہینے باقی رہ گئے تو میں نے امی سے کہا۔ عیشہ کمرے میں تھی ہم تینوں لاؤنج میں تھے۔

''بس امی! اب تیزی سے ان تین مہینوں میں ساری تیاری کرنی ہے۔''

''کون سی تیاری..... ساری تیاری ہو چکی ہے۔'' امی نے لاپرواہی سے کہا۔

''کیا تیاری ہوئی ہے اور کب ہوئی ہے۔'' میں نے حیرت سے امی کو دیکھا۔

''ارے بھی' فرنیچر' زیور کا آرڈر دے دیا ہے۔ ہال بک کروا لیے ہیں مہندی کا بھی شادی کا بھی..... کراکری لے لی ہے۔ الیکٹرانکس بالکل آخر میں لیں گے۔ کپڑوں اور پہناوؤں کی خریداری آخری مہینے میں کریں گے ارے فیشن جو گھنٹوں کے حساب سے بدلتے ہیں۔'' امی نے تفصیل بتائی۔

''اور یہ سب کب ہوا ہے۔'' میرا لہجہ زہریلا ہوا تھا۔

''تاریخ طے ہونے کے فوراً بعد سے۔''

امی نے ابھی تک میرے لہجے کے زہریلے پن کو نوٹ کیا ہی نہیں تھا مگر ابو اور زرش نے مجھے غور سے دیکھا۔

''اور کس نے کیا ہے؟'' ہر لمحہ میرے لہجے کا زہر بڑھ رہا تھا۔

''ہال تمہارے ابو اور عیشہ نے جا کر بک کروائے ہیں۔ فرنیچر اور زیور عیشہ اور زرش نے پسند کر کے آرڈر کر دیے ہیں۔ اور باقی چیزیں بھی عیشہ اور زرش.....'' امی نے یونہی

کہتے کہتے سر اٹھایا اور میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر رک گئیں۔
''کیوں کیا ہوا ہے ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔'' امی کو احساس ہو گیا کہ کچھ غلط ہو گیا ہے۔
''باقی سب بھی خود ہی کر لیں اور مجھے شادی اور مہندی کا کارڈ بھجوا دیجیے گا۔ میں شرکت کر لوں گا۔'' میرا لہجہ بہت کٹیلا تھا۔
''مگر ہوا کیا ہے..... ہم نے تو تمہارے ہی خیال سے سب کیا ہے کہ تم تھک جاتے ہو' تم پر زیادہ برڈن نہ پڑے۔'' وہ صفائی دینے لگیں۔
''سگے بھائی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر اب آپ مجھے ایکسکیوز دے رہی ہیں۔'' میں پھٹ پڑا۔
''ابھی ہم پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ ہمیں تمہیں ایکسکیوز دینے پڑیں۔'' جواب بڑے ہی سرد لہجے میں ابو کی طرف سے آیا۔
''ابو! میرا وہ مطلب نہیں تھا لیکن.....''
میری بات درمیان میں ہی تھی کہ ابو نے کاٹ دی۔
''اگر تمہیں یہ سب پسند نہیں آیا تو ہم بکنگ اور آرڈرز کینسل کر دیتے ہیں۔'' ابو یہ کہہ کر لاؤنج سے باہر نکل گئے۔
''اور بھائی چیزیں مجھے استعمال کرنی تھیں۔ اس لیے میں نے پسند کی تھیں اگر آپ کو نہیں پسند آیا یا یہ سب تو کینسل کر دیں۔'' یہ کہہ کر زرش بھی باہر چلی گئی۔ اور امی نے ملامتی نظروں سے مجھے دیکھا۔
''اور کوئی شخص ہوتا تو ایسی بیوی کے پیر دھو دھو کر پیتا۔ ایک تم ہو ناقدرے۔'' امی نے کہا اور اسی وقت شومئی قسمت عیشہ کمرے سے باہر نکلی اور مجھے اپنا زہر باہر نکالنے کا موقع مل گیا۔
''سارا بوجھ اٹھا رکھا ہے اس نے تمہارا۔''
امی کے منہ سے یہ الفاظ نکلنا غضب ہو گئے۔
''آپ جانتی ہیں نہیں چاہیے تھی مجھے ایسی عورت نہیں پسند تھی مجھے ایسی عورت زبردستی مسلط کی ہے آپ نے مجھ پر ایسی عورت۔''
میرے الفاظ نے اس کے چہرے کی ساری شادابی سارا گلدل نچوڑ کر اسے زرد کر دیا۔
اور وہ واحد دن تھا ہماری ازدواجی زندگی کا..... جب میں کمرے میں آیا تو وہ سر سے پیر تک کمفرٹر میں ملفوف تھی۔ ورنہ ہمیشہ وہ میرے لیٹنے کے بعد لیٹتی تھی۔ اور ہولے ہولے لرزتے کمفرٹر نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ رو رہی ہے اور مجھے کمینی سی خوشی ہوئی۔ لیکن ایک اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ امی کو پتہ نہیں چل سکا کہ میں اُن کی لاڈلی بھانجی کی روح کس نیوکلیئر بم سے چوس چکا ہوں۔

☆......☆......☆

اس کے بعد گھر والوں کا رویہ میرے ساتھ عجیب سا ہو گیا۔ عیشہ تو پہلے کون سا مجھ سے گپیں لگاتی تھی جواب لگاتی۔ وہ تو پہلے بھی ضرورتاً بات کرتی تھی۔ اور اب تو سوچتی رہتی بات کرنا ناگزیر ہوتا تو بات کرتی تھی۔
شادی کے ابھی بہت سے کام باقی تھے مہندی اور شادی کے کھانے ڈیسائڈ کرنے تھے۔ میں نے امی ابو سے پوچھا تو انہوں نے دوٹوک کہا۔
''جو تمہاری مرضی ہو تمہاری پسند ہو وہ رکھ لو۔'' مجھے ایکدم سے شرمندگی سی ہوئی۔ اپنا ہی بوجھ ہلکا ہونے پر میں جو ڈرامہ کر چکا تھا اس کے بعد یہ سب بنتا تھا۔ گو کہ نہ ہی میں نے

بکنگ کینسل کی تھی' ہالز کی اور نہ ہی فرنیچر وغیرہ کے آرڈر منسوخ کیے تھے مگر میں نے ڈرامہ خوب ڈالا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ جو طے ہو وہ باہمی رضا مندی سے طے ہو۔'' میں نے رسانگی سے کہا۔

''نہیں ہم پہلے ہی تم پر اپنی پسند کا خاصا بوجھ ڈال چکے ہیں اب تم اپنی پسند سے اپنی زندگی جیو' تمہیں جو کرنا ہے۔'' امی کہہ کر اٹھ کر چلی گئیں۔

''ابو! امی کو کیا ہو گیا ہے۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''کچھ نہیں ہم نے تمہاری مظلومیت کو مان لیا ہے۔ پہلے ہم نے تم پر اپنی پسند کی لڑکی مسلط کر دی اور اب تمہاری بہن کی شادی کی تیاری خود ہی کر لی۔ اس لیے اب تم آزاد ہو۔ آگے جو کرنا ہے اپنی مرضی سے کرو۔ اپنی زندگی جیو۔'' یہ کہہ کر ابو اخبار اور گلاس اُٹھا کر چلتے بنے۔

آگے الیکٹرانکس کی خریداری میں بھی امی ابو اور زرش نے ایک لفظ نہیں بولا گھر کی ڈیکوریشن وغیرہ سب میرے ذمے آ پڑا۔ اور آفس سے آ کر جب سارے کام مجھے دیکھنا پڑتے تو مجھے جھنجلاہٹ ہوتی۔ لیکن اب میں غصہ کرنے کا حق بھی کھو چکا تھا۔ اب کہیں ذہن میں اس کے کیے گئے کاموں کے لیے شکر گزاری ہوتی تھی۔ مگر منہ سے کبھی میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ امی ابو کو کوئی کام اس کی شادی کے کرنا ہوتا تو باقاعدہ آ کر میرے پاس اجازت لیتے کہ اگر تمہاری اجازت ہو تو ہم یہ کر لیں۔ اور میں شرمندگی کے سمندر میں ڈوب جاتا۔

''امی ابو! آپ اس طرح کیوں کر رہے ہیں میرے ساتھ۔'' ایک دن تو میں جھنجلا گیا۔

''اپنی زیادتیوں کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔'' امی کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا اور میں تڑپ گیا۔

''نہیں امی! اس طرح مت کہیں۔ آپ نے کوئی زیادتی نہیں کی میرے ساتھ۔'' میں نے امی کا ہاتھ تھام لیا۔

''شاید..... تمہارے ساتھ تو نہیں کی۔ مگر کسی کے ساتھ کر دی۔'' امی نے کہہ کر باہر لان میں کرسی پر پاؤں اوپر کر کے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آسمان کو تکتی عیشہ کو دیکھا۔

''کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کا حق ہوتا ہے کہ ان کی قدر کی جائے۔ مگر ہم انہیں اپنی محبت یا ضد کے ہاتھوں چند ناقدروں کو سونپ دیتے ہیں اور پھر اُن کی بربادی کا تماشہ دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کر پاتے۔'' امی کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''امی! اس سلسلے میں مجھے معاف کر دیں۔ میں مجبور ہوں میرا دل نہیں مائل ہوتا اس کی طرف۔'' میں نے معذرت کی اور امی نے سر ہلا دیا۔

زرش کی شادی بحسن وخوبی انجام پائی۔ دوسرے دن وہ آئی تو بڑی کھلی کھلی تھی۔ اور مجھے دوسرے دن کی عیشہ یاد آئی وہ کیسی پژمردہ سی تھی۔ کہیں اندر گلٹی فیلنگز آ ئی تھیں۔

امی زرش کی شادی کے بعد سے بہت خاموش ہو گئیں تھیں۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگی تھیں۔ انہیں اپنی بھانجی کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور زیادتی کھانے لگی تھی۔ یوں ہماری شادی کو دس سال گزر گئے عیشہ نے ایک بار پھر

سمجھوتے کی راہ اپنالی۔ مگر امی سمجھوتہ نہ کرسکیں۔ وہ خود کو عیشہ کا قصور وار سمجھتی تھیں ایک بار میں نے خود سنا تھا۔ وہ عیشہ سے معافی مانگ رہی تھیں۔

''مجھے معاف کردے میری بچی! مجھے نہیں پتہ تھا وہ اتنا کٹھور اتنا سنگدل ہوگا کہ تیری خوبیوں کو...... پس پشت ڈال کر اپنی انا کا پرچم بلند رکھے گا۔'' امی رو رہی تھیں۔

''ارے نہیں خالہ امی! آپ نے تو اپنی طرف سے اچھا ہی کیا۔ اب یہ تو نصیب کی بات ہے۔ محبت نصیب میں نہ ہو تو کسی طرح نہیں ملتی۔ کچھ بانصیب ہوتے ہیں جنہیں بن مانگے محبتوں کے دریا ملتے ہیں اور کوئی بوند کو بھی ترستا ہے۔ مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ نہ آپ سے نہ شریم سے...... کیونکہ وہ بھی بے قصور ہیں۔ محبت بے اختیار ہوتی ہے ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی۔'' اس نے تو امی کو اپنی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر امی کو یہ دکھ اندر ہی اندر دق کی طرح چاٹ گیا وہ کوئی بیماری نہ ہوتے ہوئے بھی بستر سے لگ گئیں۔ عیشہ انہیں تسلیاں دیتی رہتی تھی مگر وہ گھلتی چلی گئیں۔ عیشہ نے ان کی بڑی خدمت کی۔ لیکن وہ چلی گئیں جاتے جاتے وہ عیشہ کو دعائیں دیتی گئی تھیں اور ابو اب بھی اسے اٹھتے بیٹھتے دعائیں دیتے تھے جن کی وہ کسی باپ کی طرح خدمت کرتی تھی۔

یوں ہی دس سال گزر گئے ہمارے تین بچے ہوئے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی...... زرش بھی اپنے گھر میں خوش تھی اس کے چار بچے تھے۔ وہ جب بھی گھر آتی عیشہ ہمیشہ کھلے دل سے اس کا استقبال کرتی تھی۔ کبھی منہ نہیں بناتی تھی اس کے پسند کے کھانے بناتی جو فرمائش اس کے منہ سے نکل جاتی اسے پورا کرتی تھی۔ اسے اکثر و بیشتر تحائف دیتی غرض وہ دونوں میں نند بھاوج سے زیادہ بہنیں لگتی تھیں سب کچھ بیسٹ تھا سب کچھ اپنی جگہ درست تھا۔ بس ایک میں بے کل تھا۔

مجھے گھر کے اندر اپنا آپ ناکارہ پرزے کی طرح لگتا تھا۔ گھر میں کوئی کام نکلتا میں سوچتا کہ اس سنڈے کو یہ کام کرنا ہے مگر کوئی بھی کام اتوار کا انتظار کرنے سے پہلے ہو چکا ہوتا تھا۔ ان میں نل کے ٹپکنے سے لے کر ڈیپ فریزر تک کے جملہ امراض شامل تھے۔ ان میں چھوٹے موٹے کام تو وہ خود کرلیتی تھی لیکن جہاں پلمبر، الیکٹریشن یا مکینک وغیرہ کو بلانا ناگزیر ہوتا تھا وہ وہاں بھی میری مدد نہیں لیتی تھی۔ میں آفس سے آکر آرام کرتا تھا۔ میں نے کبھی بچوں کو شور کرتے یا بدتمیزی کرتے نہیں دیکھا۔

ان کی ہر چیز کی ٹائمنگ سیٹ تھی۔ سونے کی، پڑھنے کی، سپارہ پڑھنے کی، کھیلنے کی اور ٹی وی دیکھنے کی۔ اور وہ اس کے خلاف کبھی نہیں جاتے تھے نہ کبھی کوئی ضد کرتے۔ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے اپنی چھوٹی چھوٹی باتیں شیئر کرتے تھے۔ مگر کسی کی شکایت نہیں لگاتے تھے۔ میں نے دیکھا تھا کہ عیشہ نے ان تینوں کو ہر چیز کا روشن پہلو دیکھنے کی عادت ڈالی تھی۔ تاریک پہلو کو وہ زیادہ تر Avoid کرتے تھے۔

تو میں آفس سے آکر آرام کرتا، پھر چائے وغیرہ پی کر کچھ وقت دوستوں کو دیتا۔ گھر آکر کھانا پھر بچوں سے گپ شپ ابو سے باتیں دل چاہا تو ٹی وی دیکھا ورنہ آرام...... میں ہر صبح

بالکل فریش ہوتا تھا۔ میرے سارے دوست مجھ پر رشک کرتے تھے کہ شادی شدہ تین بچوں کا باپ ہونے کے باوجود گھر کا اکلوتا کھانے اور گھر دیکھنے والا ہونے کے باوجود میں اتنا فریش کیسے ہوتا ہوں۔ جبکہ وہ سب میرے مقابلے میں انتہائی پژمردہ اور مضمحل ہوتے تھے۔ لیکن میں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ مجھے گھر سرے سے دیکھنا ہی نہیں پڑتا ہے۔ گروسری سے لے کر الیکٹرانک آلات کی دیکھ ریکھ تک میری بیوی کے ذمے ہے۔

میں ان دس سالوں میں ترقی کرتے کرتے جی ایم کے عہدے پر آ گیا تھا اور ان سب کو میں اپنی محنت مانتا تھا اور مانتا کیوں نہیں۔ میرے آئیڈیاز ادارے کے مالکان کو پسند آتے تھے۔ میرے دیے گئے مشوروں کی بدولت کاروبار کو فائدہ ہوتا تھا تو میں اس پوسٹ پر تھا۔

☆......☆......☆

اور اب دس سال گزرنے کے بعد افراہیم اور عرشیہ واپس پاکستان آ گئے تھے۔ سنا تھا ان کے دو ہی بچے تھے۔ ان کو آئے سال گزر گیا مگر میرا ان سے ملنا نہیں ہوسکا۔ عیشہ جاتی آتی رہتی تھی۔ اس نے دو ایک بار مجھ سے کہا بھی چلنے کو مگر میں نے منع کر دیا تو اس نے کہنا چھوڑ دیا۔ جب جانا ہوتا تھا بچوں کو لے کر چلی جاتی تھی۔

گاڑی تو ویسے بھی دیگر کاموں کی طرح وہ خود ڈرائیو کر لیتی تھی۔ اور اس میں ایک اچھی بات تھی کہ وہ کسی چیز کے پیچھے نہیں پڑتی تھی۔ میرے نہ جانے میں میرے دل کا چور شامل تھا جو مجھے جانے سے روکتا تھا۔

☆......☆......☆

اس دن اچانک چلتے چلتے میری گاڑی ہیٹ اپ ہوگئی میں ایک طرف روک کر گاڑی چیک کرنے لگا کہ اچانک میرے پیچھے کوئی آ کر کھڑا ہوگیا۔ اور کوئی سخت چیز میری کمر سے لگا دی اور میں نے سوچا لو بھئی شیریم آج تم بھی کراچی کے حالات کا شکار ہو گئے۔ حالانکہ روزانہ کی طرح آج بھی عیشہ نے کئی سورتوں کا حصار کر کے مجھے بھیجا تھا تو گویا آج وہ حصار بھی کام نہیں آیا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک خاصی سخت اور کھردری سی آواز آئی۔

''پیچھے مڑو۔'' میں ایکدم سے پیچھے گھوما تھا مگر نظریں اُٹھا کر اوپر نہیں دیکھا۔

''ہونہہ! تیری جوانی پر تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اِدھر مجھے دیکھ تیری سالی نے میرا کیا حشر کیا ہے۔'' ایک جانی پہچانی سی آواز ابھری اور میں نے چونک کر سر اٹھایا تو وہ افراہیم تھا جو کہ اپنا موبائل جیب میں رکھ رہا تھا جس سے اُس نے مجھے ڈرایا تھا واقعی افراہیم اپنی عمر سے 15 سال بڑا لگ رہا تھا اور لوگ مجھے کہتے تھے کہ میری عمر رُک گئی ہے آگے بڑھ ہی نہیں رہی ہے۔

''واقعی یار! تجھے کیا ہوگیا ہے۔ 35 سال کی عمر میں تو تُو 50 سال کا بابا لگ رہا ہے۔'' میں نے شرارت سے کہا۔

''ہائے! کیا سنائیں تمہیں 'داستانِ الم۔'' وہ آہ بھر کر بولا۔

''نہیں میرے یار تو سنا میں سننے کو تیار ہوں۔'' میں نے مسخرے پنے سے کہا۔

''گھر چل کر سناؤں گا۔ اور باقاعدہ گا کر سناؤں گا۔ غضب خدا کا سال ہوگیا مجھے آئے'

صاحب کا مزاج ہی نہیں مل رہا کہ آ کر مل لیں۔'' وہ طنز سے بولا۔

''میں نہیں ملا تو' تُو خود کون سا آ کر ملا ہے۔'' میں نے بھی طنزیہ ہی کہا۔

''نہیں یہ تو میرے فرشتے تھے جنہوں نے تجھے بیچ راستے میں بھی پہچان لیا ہے۔ میرے ساتھ تو چل مسئلہ تھا گھر سیٹ کرنا ہے کاروبار سیٹ کرنا تھا تیرے ساتھ کیا مسئلہ تھا عرشیہ بھی جب بھگ گئی ایک ہی بات پتہ چلی کہ تُو گھر میں نہیں ہے کبھی گھر میں بھی رہتا ہے یا نہیں۔'' وہ طنزیہ ہی بولا۔

''شام کا کچھ وقت تو میرا یار دوستوں کے لیے مخصوص ہے' ہوسکتا ہے۔ وہ انہی اوقات میں آتی ہو۔'' میں نے صفائی دی۔

''خوش نصیب ہے تو جسے عیشہ جیسی عورت ملی۔ یہاں یار دوست تو دور رشتے دار تک چھوٹ گئے ہیں۔'' اس نے کہا اور میرا منہ حلق تک کڑوا ہو گیا ایک اور معتقد عیشہ کا۔

''اب کیا ساری باتیں یہیں کرنے کا ارادہ ہے۔ چل گھر چل' میں مکینک کو فون کرتا ہوں وہ گاڑی لے جا کر سروس کردے گا اور تیرے گھر بھی پہنچا دے گا۔'' اُس نے سارا پروگرام خود ہی سیٹ کرلیا۔

''نہیں یار پھر کبھی سہی۔'' میں نے بہانہ تراشا۔

''نہیں آج اور ابھی...... دیکھ لیا تیرا ایک سال میں پھر کبھی۔'' اس نے کہتے ہوئے اپنا سیل نکالا اور مکینک کو جگہ بتائی دس منٹ میں مکینک آ کر گاڑی لے گیا اور میرے منع کرنے کے باوجود وہ مجھے اپنے گھر لے آیا۔ گھر اچھا بڑا اور عالیشان تھا مگر لان سے لے کر گھر کے اندر تک ایک بے ترتیبی اور پھیلاوہ سا تھا۔ میری نظروں میں ناگواری اتر آئی جو اس نے فوراً محسوس کرلی۔

''ابھی سے گھبرا گیا میرا شہزادہ! ابھی تو عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔'' وہ میرے کان میں گنگنایا۔

اور مجھے لے کر لاؤنج میں آ گیا جہاں ایک کونے میں ڈائننگ ٹیبل پڑی تھی جس پر غالباً دوپہر کے کھانے کے برتن پڑے تھے۔ کھانے کی ڈشز' ہاٹ پاٹ' پلیٹیں میں بچا ہوا کھانا اور سوکھی روٹیاں اور چاول' میری طبیعت مکدر ہونے لگی اور میری نظروں میں اپنا چمچماتا گھر پھرنے لگا۔ لیکن میں نے خود کو سنبھالا۔

''عرشیہ نظر نہیں آ رہی ہے وہ کہاں ہے؟'' میں نے دل سنبھال کر پوچھا۔

''وہ خود نہیں آتیں ان کی زیارت کرنے کے لیے ان کے پاس جانا پڑتا ہے۔'' اُس نے طنزیہ کہا۔

''تو چلو مل لیتے ہیں۔'' میں نے فوراً کہا۔

''یار! مل لینا جاتے ہوئے آج صرف میری سن لے...... بہت دنوں بعد کوئی اپنا ملا ہے۔ میرا سینہ بھرا ہوا ہے کہیں پھٹ نہ جائے ، بچے چھوٹے ہیں میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔'' وہ عجیب رنجیدہ سا تھا۔

''کیوں ایسا کیا ہوا ہے تیرے ساتھ...... تو اتنا رنجیدہ کیوں ہے؟'' میں نے اُس کا کندھا تھپتھپایا۔

''تجھے پتہ تو ہوگا امی عریشہ کا نہیں عیشہ کا رشتہ لے کر گئی تھیں۔'' اُس نے مجھے دیکھ کر کہا اور میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''عیشہ امی ابو کو دادو کو دونوں بہنوں کو غرض

گھر میں ہر کسی کو پسند تھی مگر خوش نصیبی کا ہما تیرے سر پر بیٹھ چکا تھا۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر صوفے کی بیک سے سر ٹکا کر بیٹھا۔

''میں تب تک محبت کے معاملات تک نہیں پہنچا تھا مگر اپنی عادات واطوار کی بناء پر عیشہ پسند مجھے بھی تھی۔ مگر یہ محبت کے معاملات نہیں تھے۔'' اُس نے رُک کر میری طرف دیکھا غالباً جانچنا چاہتا تھا کہ اپنی بیوی کے بارے میں بات کیا جانا مجھے کھل تو نہیں رہا۔ مگر میرا بلینک فیس دیکھ کر اُس کی ہمت بڑھی۔

''امی سے غلطی یہ ہوئی کہ عیشہ کا رشتہ ہونے کا سن کر اور مامی کے یہ کہنے پر کہ کیا ہوا بڑی کی ہوگئی ہے تو چھوٹی تو ابھی باقی ہے۔ جذبات میں آکر عرشیہ کا رشتہ دے بیٹھیں۔ میرا کوئی عیشہ کے ساتھ محبت والا معاملہ تو تھا نہیں۔ سو مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ مگر ابو اور دادو نے اسے امی کی فاش غلطی کہا۔ اور بعد میں وقت نے ثابت کیا کہ ابو اور دادو ٹھیک تھے۔ مگر امی جذباتی ہو رہی تھیں سو انہوں نے اپنا فیصلہ برقرار رکھا کہ اسی طرح بھائی سے جڑی رہیں گی۔'' استہزائیہ ہنسا تھا اور اُس نے سامنے پڑے جگ سے پانی گلاس میں نکال کر پیا۔

''میرے سامنے شادی کے بعد بھی بہت سے مسائل تھے۔ دونوں بہنوں کی شادی کرنی تھی۔ امی ابو اور دادو کو حج کروانا تھا۔ خود کاروبار کرنا تھا گھر اپنا تھا مگر اسے بنانا تھا۔ سو میں نے باہر جاب کو ترجیح دی۔ سارے گھر والوں نے جان مارلی کہ عرشیہ میرے ساتھ نہ جائے۔ مگر اُس نے گھر میں وہ فساد کیے کہ لے جائے بنا چارہ نہ رہا ہم سب کا خیال تھا عرشیہ یہاں ہوگی تو سیونگ زیادہ ہوجائے گی۔ اور میں جلدی آجاؤں گا مگر ناں! جی عرشیہ وہ عورت ہی نہیں جو کسی کا مان رکھ لے یا کسی کی مان جائے۔ ہم باہر چلے گئے۔ میں نے کینیڈا جیسے ملک میں بھی خود اکیلے جاب کی عرشیہ کو جاب نہیں کرنے دی میں پیسہ کمانے کی مشین بن گیا۔ مگر اس عورت نے قدر نہ کی۔'' اس نے ابھی یہیں تک کہا تھا کہ اس کے دونوں بچے کمرے سے بھاگتے ہوئے نکل کر آئے اور مجھے دیکھ کر بھی اگنور کر کے ڈائننگ پر جا بیٹھے افراہیم نے سلام کرنے کو کہا تو ٹکڑا تو ڑ ہیلو کہا اور انہیں آدھے بچے کھانے والی پلیٹوں میں مزید کھانا ڈال کر بغیر منہ ہاتھ دھوئے شروع ہوگئے میری طبیعت متلا گئی۔

''افراہیم! روکو انہیں پتہ نہیں کب سے کھانا کھلا پڑا ہے۔ بیمار ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''کچھ نہیں ہوگا انہیں ان کے معدے عادی ہیں ایسا ہی گندا سندا کھانا کھانے کے۔'' اس کا لہجہ بڑا عجیب سا تھا۔

''تمہیں اس گھر کو دیکھ کر لگتا ہے اس گھر میں کئی میڈ ہیں۔'' اُس نے پوچھا تو میرا سر نفی میں ہلا تھا۔

''یہاں ڈسٹنگ کی الگ' جھاڑو کی الگ' کپڑوں کی الگ' برتنوں کی الگ ماسی ہے' کھانا پکانے کے لیے خانساماں ہے استری کی الگ ماسی ہے۔'' اُس نے گنوایا تو میری نظر جگہ جگہ پھیلے کپڑوں اور بے ترتیب کچن اور ڈائننگ تک گئی اور میری نظروں کا تعاقب کرتی اُس کی نظروں میں استہزاء اتر آیا۔

''ملازمین کا کام' کام انجام دینا ہے کسی گھر کے بکھیڑے سمیٹنا نہیں۔'' وہ بڑا عجیب سا ہنسا تھا۔ بچے کھانا کھا کر اور بچا کر اب ایک

دوسرے کو مار رہے تھے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور مجھے اپنے بچے یاد آرہے تھے تمیز و تہذیب کا مرقع' افراہیم نے انہیں شور کرنے سے منع کیا مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تب افراہیم نے انہیں لان میں جانے کو کہا تو وہ شور کرتے باہر نکل گئے۔

''میں کیا کیا پلان لے کر گیا تھا مگر اس عورت نے سب ملیامیٹ کر دیے۔ میں دادو کا لاڈلا تھا اکلوتا پوتا جو تھا۔ مگر میری دادو مجھے دیکھنے کی حسرت لیے اس دنیا سے چلی گئیں مگر اس ظالم عورت نے مجھے پاکستان نہیں آنے دیا۔ یہ تو چلو پھر بھی کم ہے میں واقعی مشین کی طرح پیسہ کماتا تھا مگر یہ عورت مجھے ایک پائی اپنے ماں باپ اور بہنوں کو دینے نہیں دیتی تھی۔ پائی پائی کا حساب رکھتی تھی۔ اور پیسہ بھیجنا تو دور کی بات میں تو ان سے فون پر بات بھی چھپ کر کرتا تھا کہ اگر اسے پتہ چل جاتا تو وہ ہنگامہ ہوتا تھا کہ دنیا دیکھتی تھی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ میرے والدین نے میری بہنوں کی شادیاں کس طرح کی ہیں۔'' اُس کی آنکھوں میں نمی اتری تھی اور مجھے یاد آیا میری بہن کی شادی کا بوجھ میری بیوی نے کیسا بانٹا تھا اور میں نے کیسا فساد کیا تھا۔

''میرے ماں باپ مجھ سے ملنے کی حسرت لیے اس دنیا سے چلے گئے میری بہنیں مجھ سے بات کرنے کی حسرت لیے بابل کی دہلیز پار کر گئیں۔'' اُس نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے نمی کو اندر دھکیلا...... اور مجھے اپنی مرتے دم تک دعائیں کرتی ماں اور بڑھاپا سکون سے گزارتا باپ یاد آئے۔ امی آخری وقت میں مکمل طور پر بیڈ پر آ گئی تھیں مگر مجال ہے اس کے ماتھے پر کبھی بل پڑے ہوں۔ امی ہر وقت صاف ستھری خوشبوؤں میں بسی رہتی تھیں۔ نہ ان کے بیڈ سور ہوئے اور نہ ان کے پاس سے وہ مخصوص بو آتی تھی جو کہ مستقبل بیڈ پر آ جانے والے لوگوں کے پاس سے آتی تھی اور اب ابو بھی گو کہ ایکٹو تھے مگر لاپرواہ چیزیں پھیلاتے تھے مگر وہ منٹوں میں سمیٹ دیتی تھی۔ روز ضد کر کے ان کے کپڑے بدلوائی تھی۔

''اور اس پر بھی بس نہیں تھا۔ دو دو جابز کرنے کے باوجود گھر آتا تھا تو پورا گھر الٹا پڑا ہوتا تھا۔ اور جب میری نفاست پسند طبیعت اتنی گندگی دیکھ کر اُکتا جاتی تو کسی سٹرڈے یا سنڈے کو میں خود صاف کرتا پورا گھر...... اور دوسری طرف وہ میری تنخواہ کا حساب کتاب ہی نہیں رکھتی تھی۔ اُس کو اڑانا بھی اپنا فرض سمجھتی تھی فروزن آئٹم لا کر فریزر بھر دیتی اور پھر وہی پورا مہینہ ہم بریڈ کے ساتھ کھاتے رہتے اپنے لیے عجیب و غریب طرز کے کپڑے لے آتی۔ جس میں عجیب مضحکہ خیز نظر آتی یہ تو جو میرا حال دیکھ رہا ہے یہ سب وہی جنک فوڈ کھا کھا کر میری حالت ہوئی ہے۔'' میں نے تھل تھل کرتے اُس کے وجود کو دیکھا جبکہ میں آج بھی فٹ تھا۔ وجہ میری بیوی کے ہاتھ کے ذائقے دار مگر کم تیل میں پکے کھانے تھے۔

''اور یہ تو کچھ بھی نہیں ہے اس سے ڈبل تیری سالی ہو رہی ہے۔'' اس کے لہجے میں ایک محسوس کی جانے والی عجیب سی نفرت دبے زاری تھی۔

''ہم وہاں رینٹ پر رہتے تھے۔ وہاں کا قانون ہے کہ گھر چھوڑنے سے قبل گھر کو دوبارہ پہلے والی صاف ستھری حالت میں درست

حالت میں چھوڑنا ہوتا تھا۔ وہ جس حالت میں گھر کو رکھتی تھی ہر گھر چھوڑنے سے قبل ایک خطیر رقم گھر کی حالت درست کرنے پر خرچ ہوتی تھی۔ بچوں کی طرف سے لاپرواہ ہے ان کی حالت تو دیکھ چکا ہے۔ میرے سارے رشتے دوست چھڑوا چکی ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بول رہا تھا۔ اور مجھے اپنا سجا سنورا گھر اور تمیزدار بچے یاد آ رہے تھے۔

''اور تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب مجھے یہاں نہیں رہنا ہے۔ کوئی فائدہ نہیں تھا اپنی جان مارنے کا' میں کتنی ہی جان مار لیتا...... نہ میری بیوی نے میری قدر کرنی ہے نہ میرے بچوں کو سنورنا ہے۔ تب میں نے اس سے چھپ کر سیونگ کرنا شروع کر دیں اور اتنا بچا لیا کہ یہاں آ کر یہ گھر لیا اور ایک چھوٹا موٹا کاروبار کر لیا ہے مگر گھر کی طرح کاروبار میں بھی برکت نہیں ہے۔ یہاں آنے کے فیصلے پر بھی بڑے لے دے ہوئی تھی۔ مگر تب میں نے پہلی بار اسٹینڈ لیا میں نے اس سے کہا کہ میں بچوں کو لے کر جا رہا ہوں تمہیں اگر یہاں رہنا ہے تو رہو' خود کماؤ اور بس محترمہ سیدھی ہو گئیں۔ کیونکہ کام کے نام سے تو ان کی جان جاتی ہے۔'' وہ طنزیہ بولا اور مجھے یاد آیا کہ سیونگ کرنا میں نے عیشہ سے ہی سیکھی تھیں وہ خواہشات سے زیادہ ضروریات پر خرچ کرتی تھی گھر میں چیزیں کم مگر معیار میں اچھی رکھتی تھی انہیں سیونگ کی بدولت اب ہم نے 1000 گز کے پلاٹ پر اپنا گھر بنا لیا تھا جلد ہی اس میں شفٹ ہونے والے تھے۔ اور ابو کا بنایا ہوا گھر ہم نے زرش کو دے دیا تھا۔

''تمہیں پتہ ہے یہاں آ کر میری بہنیں مجھ سے ملنے آئیں تو اس عورت نے وہ ہنگامہ کیا کہ مجھے دوسرے دن ان کے گھر جا کر اپنے بہنوئیوں سے معافی مانگنی پڑی کہ میں اپنے بہنوئیوں کے بگڑے تیور دیکھ چکا تھا اور کسی اونچ نیچ متحمل نہیں تھا کہ جو عورت چند گھنٹوں کے لیے میری بہنوں کو برداشت نہیں کر سکتی اس نے ہمیشہ کے لیے کیا انہیں برداشت کرنا ہے۔ اب جب اپنی بہنوں سے ملنا ہو یا اس جہنم سے کچھ لمحے سکون میں گزارنے کا دل چاہے تو اپنی بہنوں کی طرف چلا جاتا ہوں۔'' بڑی دیر بعد اب اس کے لبوں پر مسکراہٹ اور لہجے میں محبت در آئی تھی اور مجھے زرش اور عیشہ کی مثالی محبت اور بہناپا یاد آیا۔

''گھر میں اگر کوئی کام ہو جائے تو ہفتوں پڑا رہتا ہے جب تک میں نہ دیکھوں ارے گھر میں ہوتی ہے کسی پلمبر' مکینک' مالی کو بلانا کوئی مسئلہ ہے مگر نہیں اسے بے دام کا غلام جو ملا ہوا ہے۔ کوئی Insect یا چھپکلی دیکھ لے تو سولہ سال کی لڑکیوں کی طرح چیخیں مارنے لگتی ہے گھر آ کر بھی سکون نصیب نہیں ہوتا۔ بندہ گھر آ کر ریلیکس ہوتا ہے۔ مگر یہاں وہ بھی نہیں ہے۔ میں باہر کا دیکھتا ہوں یہ گھر دیکھ لے گی تو برا ہے کیا مگر نہیں۔'' اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور انہیں خصوصیات کی بناء پر مجھے اپنی بیوی بری لگتی تھی مگر میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ گھر کے کام نہ دیکھنے پر میں کتنا ریلیکس اور فریش رہتا ہوں۔ اپنی جاب میں ترقی کر کے جی ایم بن چکا ہوں۔''

''خالہ اور عیشہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکی ہیں مگر یہ بدلنے کو تیار ہی نہیں ہے۔ تو بھی سوچتا ہوگا کہ پہلی ہی ملاقات میں میں کیا یوسف وزلیخا

لے کر بیٹھ گیا مگر میرے یار میرا دل بھرا ہوا ہے۔ میرے اندر بہت گھٹن ہے۔ اور نکالنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے۔ سارے دوست یار' سارے رشتے دار چھڑوا دیے اُس نے' تُو بھی اس کے لیے اس لیے قابل قبول ہوگا کہ تو اُس کا بہنوئی ہے۔ ورنہ تیرا حال بھی دوسرے دوستوں جیسا کرنا تھا اُس نے' کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ اسے چھوڑ دوں مگر ماموں ممانی کی صورت نظروں میں آ جاتی ہے۔ اپنے بچوں کی محبت آڑے آ جاتی ہے۔ ورنہ کب کا فارغ کر چکا ہوتا۔'' وہ نفرت سے بول رہا تھا اور میں نے سوچا کوئی اپنے جیون ساتھی سے نفرت بھی کر سکتا ہے۔ عیشہ مجھے ناپسند تھی مگر میں نے کبھی اس سے نفرت نہیں کی۔

''کینیڈا میں دس سال کینیڈین ڈالر دو دو جگہ کمانے کے باوجود میں دنیا کا ناکام ترین انسان ہوں ناکام ترین باپ ہوں۔'' وہ استہزائیہ ہنسا اور میں نے سوچا میں نے ہر کامیابی کو اپنی صلاحیت سمجھا حالانکہ ہر کامیابی کے پیچھے میری بیوی کھڑی تھی اس نے مجھے ذہنی سکون اور جسمانی آسودگی سے ہی نہیں نوازا اُس نے میرے لیے دنیا میں گھر نہیں جنت سنواری اور میں نے اُس کے ساتھ کیا کیا کبھی اسے محبت کا اعتماد و آسودگی نہیں دی۔

''تھینکس یار! تیری وجہ سے میرے اندر کی گھٹن نکل گئی ہے۔ اب چل کر اپنی سالی کو درشن دے دے ورنہ اس پر بھی ہنگامہ ہونا ہے کہ میں نے اسے بتایا نہیں۔'' اس نے کہا اور میں نے دل میں کہا کہ تھینکس تو مجھے تیرا کرنا ہے یار کہ تیری وجہ سے میری آنکھوں پر بندھی پٹی اتر گئی۔

ہم دونوں عرشیہ سے ملنے اس کے کمرے میں گئے وہ اسپلٹ آن کیے LCD پر کوئی فلم دیکھ رہی تھی۔ یہ کمرہ پورے گھر سے زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبلز پر آدھ کھائی چیزوں کی پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ فرنچ فرائز' برگر' پیزا وغیرہ اور ان کے ڈبے بھی' اور عرشیہ کے سامنے فرائڈ فش اور فرائڈ چکن رکھے ہوئے تھے جنہیں وہ کیچپ اور چٹنی میں ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھی اور حالت اس کی وہی تھی جو افراہیم نے بتائی تھی وہ افراہیم سے ڈبل سے بھی زیادہ ویٹ کی تھی۔ خوبصورت تو وہ ویسے بھی نہیں تھی وہ خالو کی طرح قبول صورت تھی خوبصورت تو عیشہ تھی خالہ کی طرح' اور اب محترمہ عرشیہ صاحبہ کے وہ معمولی نقوش بھی چربی کی تہہ میں دفن ہو چکے تھے۔ مجھے اس بلا کی مانند کھاتی ہوئی اور ویٹ میں اضافہ کرتی ہوئی عورت سے وحشت ہوئی۔

اُس نے مجھے دیکھا تو جھٹ سلام کر دیا۔

''ارے شریم بھائی! السلام علیکم بڑے نصیب ہمارے جو آپ کو سال بھر بعد دیکھنا نصیب تو ہوا۔'' میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''ارے! تم نے انہیں کچھ کھانے پینے کو بھی پوچھا یا ایسے ہی سوکھے منہ سے لیے پھر رہے ہو۔'' وہ افراہیم سے خاصے بدتمیز اور ہتک آمیز لہجے میں بولی اور مجھے پھر دھیمے اور تمیز دار لہجے میں بولتی عیشہ یاد آ گئی۔ کمال ہے دو سگی بہنیں اور دونوں میں اتنا تضاد......

''میڈم! زندگی کھانے پینے سے ہٹ کر بھی کچھ ہے۔'' وہ تپ کر بولا۔

''ہاں ہاں بھئی میرے رشتے دار ہیں ناں! تم کیوں پوچھو گے تم تو اپنی بہنوں کے آگے پیچھے پھرتے ہو۔'' وہ پھنکاری اور میں نے سوچا یہ ایسی

کیوں ہے۔ تب مجھے یاد آیا جو اپنی سگی بہن سے بغض رکھتی تھی وہ شوہر کے رشتے داروں سے کیوں نہیں رکھے گی۔ مگر اس سے پہلے جھگڑا مزید بڑھتا میں نے سیز فائر کر دیا۔

''نہیں عرشیہ! افراہیم نے مجھے کھلا پلا دیا ہے میں کافی دیر سے آیا ہوا ہوں وہ میرے خاطر و مدارات میں لگا ہوا تھا۔'' میں نے کہا تو اُس نے مشکوک نظروں سے افراہیم کو دیکھا جو برہمی سے اسے ہی دیکھ رہا تھا اور پھر میں نے اسے مزید کچھ بولنے کا موقع بھی نہیں دیا۔

''اچھا عرشیہ! افراہیم! میں چلتا ہوں عیشہ انتظار کر رہی ہوگی۔'' میں نے کہا تو افراہیم نے مجھے دیکھا۔

''مگر یار! تو جائے گا کیسے' تیری گاڑی تو ورکشاپ میں ہے۔'' اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

''ارے! کسی بھی پبلک ٹرانسپورٹ سے چلا جاؤں گا۔'' میں نے لاپرواہی سے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ افراہیم' شریم بھائی کو چھوڑ کر آؤ۔'' عرشیہ کا لہجہ تحکمانہ تھا عیشہ نے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی ہاں میرا لہجہ ایسا ہی تحکمانہ ہوتا تھا وہ میرا نام نہیں لیتی تھی آپ جناب سے بات کرتی تھی۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے مجھے ایک کام سے بھی نکلنا ہے میں ساتھ ہی نکلتا ہوں۔'' وہ بھی فوراً تیار ہو گیا۔

''نہیں یار! تجھے تکلیف ہوگی۔'' میں نے منع کیا۔

''کوئی تکلیف نہیں ہوگی وزیر اعظم نہیں ہے یہ ملک کا جس کے پاس ٹائم نہ ہو۔'' جواب عرشیہ کی طرف سے آیا اور اس سے پہلے کہ پھر تکرار شروع ہو جاتی میں نے کہا۔

''چل پھر نکلتے ہیں۔'' میں کہتا ہوا اٹھ کھڑا بھی ہو گیا لان میں دونوں بچے لڑنے میں مصروف تھے۔ اس کے بیٹے نے بیٹی کو نیچے گرایا ہوا تھا اور اسے بال پکڑ کر مار رہا تھا مگر افراہیم اَن دیکھا کرتا آگے نکل گیا اور مجھے پھر اپنے بچے یاد آئے اور آج تو Judgement Day تھا۔ مگر میں اَن دیکھا نہ کر سکا اور میں نے دونوں بچوں کو الگ کیا اپنے گھر میں ایسے مناظر دیکھے جو نہیں تھے تکلیف ہوئی تھی مجھے.....

''بیٹا! بہنوں کو نہیں مارتے۔'' میں نے افراہیم کے بیٹے سے کہا۔

''کیوں؟'' اُس نے مجھے دیکھا۔

''کیونکہ لڑکیاں کمزور ہوتی ہیں وہ مقابلہ نہیں کر پاتیں ان کی حفاظت کرتے ہیں انہیں مارتے نہیں ہیں۔'' میں نے جیب سے چاکلیٹس نکال کر دونوں کو دیں جو میں اپنے بچوں کے لیے اکثر لاتا تھا۔

''اور بہنیں بھی بھائی سے لڑتی نہیں محبت کرتی ہیں۔''

''جی اچھا انکل!'' دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ اور بچے تو کچی مٹی ہوتے ہیں جس سانچے میں ڈھالو ڈھل جاتے ہیں بس کوئی ڈھالنے والا ہو۔

واپسی کا سفر ہمیشہ تھکن لاتا ہے مگر مجھے تو اس سفر نے فریش کر دیا تھا۔ افراہیم راستے بھر گلے شکوے ہی کرتا رہا میں گھر آیا تو بچے اور ابو سو رہے تھے گھر میں خاموشی تھی۔ بس کچن میں کسی کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ عیشہ ہی تھی۔ مگر میں وہاں نہیں گیا میں ابو کے

کمرے میں آ گیا ابو سو رہے تھے۔ میں دیوار پر لگی امی کی تصویر کے آگے کھڑا ہو گیا۔ آخر امی کا شکریہ بھی تو ادا کرنا تھا۔ اس گوہر نایاب کو میری جھولی میں ڈالنے کا جس کی میں پچھلے گیارہ سال سے ناقدری کر رہا تھا۔

''تھینک یو امی!'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور مجھے باقاعدہ لگا کہ امی مسکرائی ہیں۔

''کیا دیکھ رہے ہو برخوردار!'' پیچھے سے ابو کی آواز آئی میں نے مڑ کر دیکھا وہ اٹھتے ہوئے چشمہ لگا رہے تھے۔

''آپ کی بیوی کو دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے شوخی سے کہا۔

''ہشت! اپنی بیوی کو دیکھنے کا حق صرف مجھے ہے۔ اور بھئی بیوی اپنی اپنی...... میری بیوی کو چھوڑو اپنی کو دیکھو اُس کا بھی حق ہے۔'' وہ میرے ہی باپ تھے۔ میری بات کا جواب میرے ہی انداز میں دیا۔

''اسے بھی دیکھ لیں گے اور یہ کیا بات ہوئی آپ کے بعد دنیا میں وہ میں دوسرا ہوں جو آپ کی بیوی کو پرے استحقاق کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔'' میں نے ٹھنک کر کہا۔

''آج ماں کی تصویر کے سامنے بھی' ایک زمانے بعد کھڑے ہوئے ہو۔ ایک زمانے بعد تمہارے لہجے میں خوشیوں کی کھنک ہے۔ بیوی کے متعلق بات بھی نرمی سے کر رہے ہو۔'' وہ بات کرتے کرتے رُکے تھے اور انہوں نے چشمہ اُتار کر آنکھوں کی نمی کو پونچھا تھا۔

''تمہیں پتہ ہے تمہاری ماں کو یقین تھا اس وقت کا' تمہارے پلٹنے کا۔ وہ شدت سے منتظر تھی اس وقت کی۔ مگر اس کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ وہ کہتی تھی کہ جلد یا بدیر تمہیں احساس ضرور ہو گا کہ قدرت نے تمہیں کیا عطا کیا ہے اور تم کیا مانگ رہے تھے کہ انسان اپنے لیے شر ایسے مانگتا ہے جیسے خیر۔'' وہ بہت آزردہ تھے۔

''ہاں ابو میں نے بہت دیر کر دی۔'' میں بھی افسردہ ہوا۔

''اُس کا اور میرا بہت سا خوبصورت وقت میری ناشکری پی گئی۔'' میں استہزائیہ ہنسا۔

''نہیں کوئی ایسا زیادہ بھی وقت نہیں گزرا ینگ مین! ابھی تم دونوں جوان ہو خوبصورت ہو۔'' انہوں نے مجھے دیکھ کر آنکھ ماری شرارت سے اور میں نے چہرے پر ملامت طاری کر کے سر نفی میں ہلایا تو وہ ہنسے۔

''اور یوں بھی اتنی دیر بھی یوں ہو گئی کہ عرشیہ ملک سے باہر تھی۔'' ان کی بات پر میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''اور باقی کی دیر یوں ہو گئی کہ تم نے اس ایک سال میں ان سے ملنے یا ان کے گھر جانے کی کوشش بھی نہیں کی اپنی خود ساختہ مظلومی کی وجہ سے۔'' ان کے ہر ہر لفظ پر میری آنکھیں حیرت سے پھٹ رہی تھیں۔

''پلیز! اتنی حیرت سے مجھے نہ دیکھو کہ ہوں میں تمہارا باپ ہی' تمہاری سوچ کی حد جہاں ختم ہوتی ہے۔ وہاں سے میری سوچ شروع ہوتی ہے۔ میں تو پچھلے ایک سال سے اس Miracle کا انتظار کر رہا تھا۔'' وہ بڑے مزے سے کہہ رہے تھے۔

''ابو آپ بھی ناں! مجھے کہنے کو کچھ سوجھا ہی نہیں۔''

''ہاں میں بھی...... اب چلو نکلو یہاں سے۔ اس کے پاس جاؤ جسے ایک زمانے سے سنگریزوں پر چلا رہے ہو اور وہ بھی ننگے پیر۔''

ابو نے کہا تو میں اٹھ کھڑا ہوا اور ویسے بھی مجھے آج عیشہ سے ملنے کی ایسی Excitement تھی جیسے کہ اپنی اولین محبت سے پہلی بار ملنے کی ہوئی ہے۔

''اور ہاں میری فکر مت کرنا میں سو رہا ہوں۔'' وہ شرارت سے بولے۔ اور میں نفی میں سر ہلاتا باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

وہ کچن میں بڑے مگن انداز میں کوئی ڈش پکانے میں مصروف تھی۔ کسی ڈول ہاؤس کی مانند سجا میرا گھر اور یہ کچن اور اس میں باربی ڈول دکھتی میری خوبصورت اور اسمارٹ بیوی...... منظر بہت مکمل تھا۔

میں بغیر آہٹ کیے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا وہ کھانا بھوننے میں اتنی مگن تھی کہ اسے میری آمد کا احساس بھی نہیں ہوا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے بالکل اس کے کان کے پاس جا کر کہا تو وہ باقاعدہ ڈر کر اچھلی تھی چمچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کڑاہی میں گرا تھا اور مجھے یہ سب بڑا اچھا لگا تھا۔

''آپ کب آئے مجھے پتہ نہیں چلا۔'' وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

''آج یہ نہیں پوچھو گی میں جلدی کیسے آ گیا۔ حالانکہ مجھے آنے میں بہت دیر ہو گئی ہے۔'' دوسرا جملہ میں نے زیرلب کہا تھا۔

''نن...... نہیں......'' وہ گھبرا کر ہکلائی تھی اور اس کے چہرے پر خوف پھیل کر سمٹا تھا اور مجھے تکلیف ہوئی میں نے قدم قدم پر اس کے ساتھ برا کیا تھا۔

''چلو میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔'' میں نے بازو اس کے کاندھے پر پھیلا کر اس کا ایک ہاتھ تھام لیا اور اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ وہ عادی نہیں تھی ان التفافات کی۔

''میرا دل چاہ رہا تھا اپنی خوبصورت بیوی کے پیارے پیارے ہاتھوں سے بنی مزیدار چائے پینے کا۔'' میرے الفاظ کے ساتھ ہی اُس کی گلابی رنگت شہابی ہو گئی وہ آج بھی شادی کے اولین دنوں کی طرح دکھتی تھی۔ اور اس نے فوراً بھاگنے کی ٹھانی۔

''لائیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔'' اس نے میرے حلقے سے نکلنا چاہا۔

''بنا لینا چائے بھی...... پہلے میری بات سنو۔'' میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ کر دوسرا ہاتھ بھی اس کے کندھے پر رکھا اور اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں قید کر لیا اور اس نے نظروں کے ساتھ چہرہ بھی جھکا لیا منظر اور خوبصورت ہو گیا۔

''مجھے معافی مانگنی ہے عیشو!'' میں نے کہا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ جسے میں نے اپنے ہونٹوں سے ہٹا کر چوم لیا اور اس نے ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کی تھی مگر میری گرفت مضبوط تھی۔

''نہیں عیشو! مجھے آج کہنے دو۔ میں نے تمہارے ساتھ شادی کے اولین دن سے ہی برا رویہ روا رکھا۔ ایک خوبصورت وقت کو اپنی بے جا ضد کے ہاتھوں برباد کر دیا۔ تمہیں اس جرم کی سزا دی جو تمہارا تھا ہی نہیں۔'' میں دھیمے دھیمے سروں میں بول رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے بے ریا پانی کے دو شفاف قطرے نکلے جنہیں میں نے تیزی سے اس کے کاندھے سے ہاتھ ہٹا کر اپنی ہتھیلی پر لے لیا اور بالوں میں جذب کر لیا۔

"یہ آنسو آخری بار تمہاری آنکھوں سے بہے ہیں۔ اب کم از کم میری وجہ سے تمہاری آنکھوں سے آنسو نہیں بہیں گے یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"
میں نے اسے اپنے کاندھے سے لگا کر اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اس کے ہونٹوں پر ایک مدھری مسکان پھیل گئی۔
"بہت برا ہوں نہ میں..... تمہارا جو دل چاہے مجھے سزا دو میں تیار ہوں۔" میں نے لگاوٹ سے کہا۔
"کیسی سزا شریم! جن سے محبت ہوتی ہے وہ کبھی برے نہیں لگتے اور نہ انہیں سزا دی جاتی ہے۔" وہ ہولے سے بولی اور میری روح سرشار ہوگئی۔ یہ عورت میرے لیے میرے رب کا انعام تھی۔ میرے ماں باپ اور بہن کی دعاؤں کا ثمر تھی۔ میرے دل کی ٹھنڈک اور آنکھوں کا نور تھی۔ میری ہر کامیابی کے پیچھے وہی کھڑی تھی۔
"میں مانتا یا نہ مانتا..... لیکن اب کچھ اقرار اس بہترین عورت کا بھی حق تھے۔ وہ چائے بنانے کے لیے اصرار کرتی رہی مگر میں اسے بانہوں کے حلقے میں لیے لاؤنج کے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا اور اسے خود سے لگا کر اس کے کانوں میں رس گھولنے لگا مجھے پتہ ہی نہیں چلا کب ابو لاؤنج میں آ گئے اور انہوں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں کہا۔
"میں نے کچھ نہیں دیکھا۔" ان کے لہجے میں خوشی کی کھنک اور شرارت تھی اور عیشہ گھبرا کر میرے حلقے سے نکل کر بھاگ گئی تھی۔ ابو بہت خوش تھے۔
تھوڑی ہی دیر میں اس نے چائے کے ساتھ کچھ لوازمات بھی تل لیے۔ کباب، ہوم میڈ نگٹس اور رول وغیرہ نمکو اور بسکٹس بھی گھر میں موجود تھے۔ بچوں کی تو عید ہی ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

اسی رات وہ میرے ہاتھ پر سمٹی ہوئی لیٹی تھی۔ خوبصورت تو وہ ہمیشہ سے تھی۔ مگر آج اس کے چہرے پر خوشی کی چمک اور روشنی بھی تھی۔ وہ مجھ سے باتیں کرتے کرتے سو چکی تھی۔ میں نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ میں نے محبت کو مجسم روپ میں اس کے وجود میں دیکھا تھا۔ وہ سراپا رحمت تھی۔
اور میں نے سوچا کتنا غلط تھا میں.....اور کتنا غلط کیا میں نے اس کے ساتھ..... مگر اس نے خود کو تبدیل نہیں کیا..... ویسے ہی محبتیں تقسیم کرتی رہی۔
آج میں دل سے اپنے رب کا شکر گزار ہو رہا تھا کہ اس نے مجھے وہ نہیں دیا جو میں نے اس سے مانگا جس کے لیے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ مجھے وہ دیا جو میرے لیے بہترین تھا۔
ہم لوگ نزاکت کو بڑے عجیب معنوں میں لے لیتے ہیں خواہ مخواہ کام نہ کرنے والی اور پلنگ توڑنے والی لڑکیاں ہمارے لیے نزاکت و نسوانیت کا مرقع ہوتی ہیں اور مردانہ وار کام کرنے والی کو ہم اس کیٹیگری سے نکال دیتے ہیں۔
حالانکہ اصل نسوانیت کا پیکر یہی ہوتی ہیں اور دوسری قسم نازک نہیں ہڈ حرام ہوتی ہے یہ فرق مجھے اب سمجھ آیا تھا کہ یہی پہلی ہی قسم تھی جو گھر کو گھر بناتی ہے۔ رشتوں کو جوڑتی ہے اور یہی وہ عورت ہوتی ہے جو ہر کامیاب مرد کے پیچھے کھڑی ہوتی ہے کیونکہ ہر طرح سے آسودہ مرد ہی اپنی فیلڈ میں کچھ کر دکھانے کے قابل ہوتا ہے۔
میں نے جھک کر اس کی پیشانی چومی اس نے نیند میں کسمسا کر آنکھیں کھولیں اور مسکرا دی اور ساتھ ہی میں بھی مسکرا دیا کہ رات چھٹ چکی تھی اب روشن سویرا ہمارا منتظر تھا۔

☆☆......☆☆

بھیگا موسم

''اماں تمہاری بات سمجھتی ہوں لیکن تہمینہ بیگم اور ایمن بی بی کی عادتیں تم جانتی ہو وہ کس طرح بات بات پر بے عزت کر دیتی ہیں میٹرک کے امتحان کے دوران بھی مجھے شام کو ان کے گھر کام کرنے جانا ہوتا تھا اُس پر بھی اُن کو میرے پڑھنے پر اعتراض تھا اور ہمیشہ......

آسمان کو گھیرے جامنی بادلوں نے کسی دوشیزہ کے آنچل کی طرح اپنے حصار میں لے رکھا تھا ننھی ننھی بوندوں سے بجی رم جھم جل تھل برسات بن گئی تھی۔ اور نور کو اس موسم سے عشق ہے وہ تو بارش کی دیوانی ہے اُسے بارش میں بھیگنا بہت اچھا لگتا ہے وہ تو یہ بھی بھول گئی تھی کہ اُس کی ماں 'ماسی جیبہ' کی کمر مشقت کے بوجھ سے شل ہو کر جھکنے لگی ہے گھروں میں جھوٹے برتن اور گندے کپڑے دھوتے دھوتے اُس کے ہاتھ کھردرے اور سخت ہو گئے ہیں اور اس بھیگے موسم میں ان بیگمات اور ان کے گھر والوں کی زبانیں اور بھی چٹوری ہو جاتی ہیں طرح طرح کے پکوان بناؤ پھر لنچ تیار کرو۔

یہ سب کام تھکن اور درد بن کر جسم میں بیٹھ جاتے ہیں ماسی جیبہ انہی تھکا دینے والے کاموں سے اُلجھتی بارش کے پانی سے بھری کیچڑ والی گلیوں سے گزرتی اپنے گھر پہنچی تو نور گھر کے آنگن میں لگے درخت میں جھولا جھول رہی تھی اور بارش میں پور پور بھیگ چکی تھی۔

''نور! کیا بیمار ہونا ہے پھر ڈاکٹر کے یہاں لے کر بھاگنا پڑے گا۔ گیلے کپڑے بدل کر آؤ میں روٹی پکا رہی ہوں سالن تو بیگم صاحبہ نے دیا ہے جلدی کھانا لگاؤ۔''

''نہیں بالکل نہیں آج میری چھٹی ہے میں کوئی کام نہیں کروں گی صرف بارش انجوائے کروں گی کھیلوں گی ناچوں گی گاؤں گی۔'' نور نے جھولے کی لمبی پینگ لیتے ہوئے کہا۔

''نور بہت ہو گیا کھیل تماشہ اگر کلینک سے آ گئی تھی تو روٹی پکا لیتی اور اب بھی شہزادی کا کام کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔''

''لگاتی ہوں کھانا مائی سوئٹ مما۔'' نور نے اتراتے ہوئے ایک ادا کے ساتھ ماں کے قریب آ کر کہا۔

''یہ مما' شمانہ کہا کر مجھے سیدھی طرح اماں یا امی کہا کر بیگم صاحبہ کے بچوں کی نقل نا کیا کر اُن کی اور اپنی حیثیت پہچان۔''

اماں بلاوجہ ناراض ہو جاتی ہو میں مما کہوں امی یا اماں بیٹی تو تمہاری رہوں گی اور کوئی بھی زبان امیری، غریبی یا حیثیت کی پہچان نہیں ہوتی ہم محنت کش لوگ بھی اپنے ماں باپ کو انگلش میں پیار سے پکار سکتے ہیں اچھے کپڑے اور بہتر کھانا کھا سکتے ہیں۔''

''اچھا زیادہ تقریر نا کر یہ جو تیرے ابا نے تجھے پڑھانے لکھانے کا فیصلہ کیا تھا یہ میرے لیے عذاب بن گیا ہے اتنی مشکل باتیں کرتی ہے کہ میرے دماغ میں شائیں شائیں ہونے لگتی ہے اب جلدی کھانا لگا میں منہ دھو کر آتی ہوں۔''

''تو بھی اماں پوری ہٹلر ہے اپنا ہر آرڈر منواتی ہے میں بھی ذرا ترقی کر کے ہیڈ نرس بن جاؤں پھر دیکھنا کیسی میم بن جاؤں گی پھر مجھ پر کسی کا آرڈر نہیں چلے گا۔''

''بے وقوف ماں باپ کا آرڈر اولاد پر چلتا ہے اور جو اُن کا آرڈر نہیں مانتے وہ اپنی دنیا اور آخرت دونوں خراب کرتے ہیں سمجھی۔''

''جی بالکل سمجھی ذرا آخرت کا مطلب سمجھا دو اماں۔''

''جاہل نہ ہو تو ہیڈ نرس بننے کے خواب اور آخرت کا مطلب معلوم نہیں شاباش یہی تعلیم حاصل کی ہے تُو نے.....''

''کس نے کہا مجھے آخرت کا نہیں معلوم وہ تو میں تمہارا امتحان لے رہی تھی کہ تمہیں کچھ معلوم ہے یا بلاوجہ شور کرتی ہو۔''

''ٹھہر تیرے امتحان کا رزلٹ تو میں دیتی ہوں اب بھاگ کہاں رہی ہے۔'' نور ماں کی مار سے بچنے کے لیے ہنستی ہوئی بھاگی۔

☆......☆......☆

''بیگم صاحبہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے جلدی چھٹی چاہیے۔''

''آج تو بالکل جلدی چھٹی نہیں مل سکتی انصار صاحب کا بھتیجا اسد لندن سے آرہا ہے گھر میں اتنے کام ہیں اور تم کو چھٹی چاہیے تم اپنی بیٹی کو ساتھ لے آیا کرو اُسے تمہارے ساتھ مدد کرنا چاہیے۔''

''نور کلینک جاتی ہے وہ نرس بن گئی ہے کچھ دنوں میں کسی بڑے اسپتال میں نوکری مل جائے گی تو اُس کی طرف سے بھی بےفکر ہو جاؤں گی۔''

''حبیبہ کن چکروں میں پڑی ہو اپنی بیٹی کی شادی کروا اپنا فرض ادا کرو۔''

''ہاں شادی بھی کرنا ہے لیکن نور کے مرحوم باپ کا خواب تھا کہ اُس کی بیٹی پڑھ لکھ کر اپنا مستقبل بنائے کسی پر بوجھ نہ بنے میں نے اُسی خواب کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''ایک تو تم لوگوں کا یہی مسئلہ ہے سونے کے لیے بستر نہیں خواب محلوں کے دیکھتے ہو خیر مجھے کیا تم جانو اور تمہارے کام۔''

تہمینہ بیگم کا غرور اُن کے لفظوں میں گونج اٹھا۔ ماسی حبیبہ کا جسم بخار میں جل رہا تھا لیکن وہ کاموں میں مصروف تھی کیونکہ لندن سے انصار صاحب کا بھتیجا اور ہونے والا داماد اسد جو آرہا تھا۔

''ایمن جلدی تیار ہو جاؤ تمہیں اسد کو ریسیو کرنے ایئرپورٹ جانا ہے۔'' بیگم تہمینہ نے بڑے پیار سے بیٹی کو یاد دلایا۔

''بس میں تیار ہوں پاپا تو بزی ہیں اس لیے میں ہی اسد کو ریسیو کروں گی۔'' ایمن نے خود پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے آئینے میں دیکھا۔

''مما اسد اور میں ڈنر باہر کریں گے ہمارا کھانے پر انتظار مت کیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی لیکن ذرا جلدی آجانا رات کا وقت ہے۔''

''آپ بےفکر ہو جائیں اسد تو میرے ساتھ ہوگا۔'' بیگم تہمینہ کی ہدایت پر ایمن نے جواب دیا۔

''اماں اب تو گھروں میں جا کر کام کرنا چھوڑ دے گھر کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے میں محنت کر رہی ہوں اب تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں اور پھر بھی سارا دن کام کرتی ہو یہ لو سلائس کھاؤ دودھ کے ساتھ۔'' نور نے ناشتے کی ٹرے لگاتے ہوئے پیار سے ماں کو سمجھایا۔

''پھر میں میڈیسن دیتی ہوں اور کچھ دن آرام کرو بلکہ اب یہ کام چھوڑ دو۔''

''نور ہم دونوں کی محنت ہوگی تو کچھ پیسے جمع ہوں گے تو میں تیری شادی کروں گی اب تجھے سسرال خالی ہاتھ تو نہیں بھیجوں گی۔'' حبیبہ نے نور کو اپنی مجبوری بتانے کی کوشش کی۔

''اماں تو بھی..... سسرال کا ذکر لے کر آتی

ہے سارا موڈ خراب ہوگیا۔''

''تیرا موڈ اچھا ہو یا خراب شادی تو ہوگی اور سسرال بھی جانا ہوگا چلو اب سو جاؤ صبح جلدی اٹھنا ہے۔بیگم صاحبہ نے جلدی بلایا ہے۔''

ایک اور دن اپنی مسافت طے کرتا ہوا ختم ہوا سورج دن بھر کی تھکن سمیٹے نیلے آسمان کے پار نامعلوم وادی میں چھپ گیا نور ابھی کلینک جانے کے لیے تیار ہورہی تھی کہ ماں کو دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

''کیا ہوا اماں آج بہت دیر ہوگئی سب خیریت تو ہے کچھ پریشان لگ رہی ہو۔''

''بیٹی پانی پلا ذرا دم لینے دے بتاتی ہوں۔'' حبیبہ نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے سانس بحال کیا نور نے پانی پلایا۔

''بے چاری تہمینہ بیگم پر تو مصیبت آپڑی ہے ایمن بی بی اور اسد صاحب کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے ایمن بی بی کو تو معمولی چوٹیں آئی ہیں لیکن اسد صاحب بے ہوش ہیں اُن کی حالات زیادہ خراب ہے۔''

''اوہ! یہ تو بہت بری خبر ہے بے چاری ایمن بس اللہ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے میں چلتی ہوں تم آرام کرو کھانے کے بعد میڈیسن لے لینا۔''

''حبیبہ! ذرا جلدی آؤ۔'' بیگم تہمینہ کی آواز پر کچن میں مصروف حبیبہ تیز تیز قدم اٹھاتی اُن کے کمرے میں آگئی۔

''جی بیگم صاحبہ!''

''کل تک اسد کو اسپتال سے گھر لے آئیں۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔'' حبیبہ نے خوشی کا اظہار کیا۔

لیکن ابھی وہ کسی کو پہچان نہیں رہا ہے ماں باپ ہیں نہیں ایک بہن وہ بھی کینیڈا میں اب ہم کو ہی اُسے سنبھالنا ہے انصار صاحب کا بھتیجا اور اس گھر کا ہونے والا داماد ہے۔

''جی بالکل صاحب کا تو خون ہے جی آپ مجھے بتایئے کیا کرنا ہے۔'' حبیبہ نے بیگم تہمینہ سے سوال کیا۔

''ہمیں ایک نرس کی ضرورت ہے اسد کے لیے تم نور کو لے آؤ اسد کی دیکھ بھال کے لیے۔''

''ٹھیک ہے میں نور سے بات کروں گی۔''

''بات نہیں کرنا اُسے لے کر آنا ہے اُسے ڈبل تنخواہ دوں گی لیکن رات کو رُکنا ہوگا رات کو اسد زیادہ پریشان کرتا ہے نیند کی دوائیاں لینے کے بعد بھی سو نہیں سکتا۔''

''ٹھیک ہے کل میں نور کو لے آؤں گی۔''

''اماں تمہاری بات سمجھتی ہوں لیکن تہمینہ بیگم اور ایمن بی بی کی عادتیں تم جانتی ہو وہ کس طرح بات بات پر بے عزت کردیتی ہیں میٹرک کے امتحان کے دوران بھی مجھے شام کو اُن کے گھر کام کرنے جانا ہوتا تھا اُس پر بھی اُن کو میرے پڑھنے پر اعتراض تھا اور ہمیشہ جلی کٹی باتیں سناتی تھیں۔

اپنے استعمال شدہ کپڑے جیولری اور کاسمیٹکس سامان دے کر ہزار بار جتاتی تھیں اب پھر میں کلینک کی نوکری چھوڑ کر اُن کی ملازمت کروں سو نخرے ہزار باتیں سنوں۔''

''بھول جا بیٹا اُن کی باتیں وہ تجھے ڈبل تنخواہ دیں گی دو دو کلینک میں محنت کرتی ہے وہ لوگ مشکل میں ہیں اُن کا بھی مسئلہ حل ہوجائے گا تجھے بھی کچھ پیسے مل جائیں گے۔''

''واہ اماں تو بڑی سمجھدار ہوگئی ہے خیر چلو

گی تیرے ساتھ ابھی مجھے جانے دے دیر ہو جائے گی۔''

''ہاں تو جا اللہ حافظ۔''

☆......☆......☆

''مما پلیز کچھ کریں اسد کو میں نہیں سنبھال سکتی میری ساری سوشل لائف ڈسٹرب ہوگئی ہے وہ کسی کو نا تو پہچانتا ہے نا اُسے کچھ یاد ہے دس دن ہوگئے آخر کب تک اس عذاب کو برداشت کروں لگتا ہے اسد کی یادداشت تو کیا واپس آئے گی میں ہی اپنی یادداشت کھو بیٹھوں گی۔'' ایمن نے پانی کا ٹھنڈا گلاس پیتے ہوئے بیگم تہمینہ سے شکوہ کیا۔

''تھوڑا وقت دو میں نے حبیبہ کو کہا ہے اُس کی بیٹی نور نرس ہے وہ اسد کی دیکھ بھال کے لیے آجائے گی پیسے زیادہ دیں گے تو میڈ کا کام بھی کردے گی۔''

''وہ ہے تو 'ماسی' کی بیٹی سفید یونیفارم پہن لینے سے اوقات تھوڑی بدلتی ہے۔'' بیگم تہمینہ نے اپنی جیولری پہن کر آئینہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ دونوں کی اوقات کیا ہے؟'' اسد جو نا معلوم کب سے اُن کی باتیں سن رہا تھا گفتگو میں شامل ہوگیا۔

''ارے اسد بیٹا تم یہاں کیوں آگئے چلو اپنے کمرے میں چلو اور ایسے سوالات نہیں کرتے بری بات ہوتی ہے۔''

''نہیں سوال کرنا بری بات نہیں انسانوں کو حقیر سمجھنا برا ہوتا ہے۔ تمام انسان برابر ہیں ہم سب کی حقیقت اور اوقات مٹی ہے خاک اور صرف خاک ہے۔''

''ایمن پلیز اسے میڈیسن دو یہ آرام کرے گا تو بلاوجہ کی فضول باتیں نہیں کرے گا۔''

''جلدی سے نور آجائے تو مجھے سکون ملے اور میں بے فکر ہو جاؤں۔''

''میری بھولی بیٹی زیادہ بے فکر نہ ہو جانا اسد سے تمہاری شادی ہونا ہے اور یہ بہت ضروری ہے بھائی صاحب کی باقی جائیداد حاصل کرنے کے لیے سمجھیں۔'' بیگم تہمینہ نے ایمن کو نادر مشورہ دیا۔

''مما وہ سب کچھ بھول چکا ہے اُسے تو میرا نام تک یاد نہیں۔''

''تم فکر نہ کرو ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آہستہ آہستہ اسد کو پچھلی باتیں یاد آجائیں گی۔ لیکن اس کے لیے اُسے خوش رکھنا اور توجہ دینا بہت ضروری ہے۔''

''اس کام کے لیے نور آرہی ہے فی الحال میرے پاس فضول وقت نہیں کہ اُس کی گمشدہ یادیں تلاش کروں مجھے ایک پُر مسرت شادی شدہ زندگی گزارنا ہے کسی بیمار کے ساتھ اپنا وقت برباد نہیں کرنا۔''

''ایمن اسد شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گا ڈاکٹر بہت پُر امید ہے اور وہ تمہارے انکل کی پراپرٹی کا مالک ہے۔'' بیگم تہمینہ نے ایمن کو پھر یاددہانی کراتے ہوئے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو آپ پہلے اسد کی شادی کسی اور لڑکی سے کرائیں جب وہ ٹھیک ہو جائے گا تو میں شادی کرلوں گی۔'' ایمن کی فطری چالاکی بول پڑی۔

''میں کوئی لڑکی تلاش کروں پھر اسد کی شادی کراؤں اس سے اور پھر شادی کے بعد اس نے اسے طلاق نا دی یا وہ لڑکی اسد سے علیحدگی پر راضی نہ ہوئی تو کیا کروگی؟'' بیگم تہمینہ خدشات کا اظہار کیا۔

''مما لڑکی تو میں نے دیکھ لی ہے اور پیسے دیں گے تو طلاق بھی لینے پر راضی ہو جائے گی ان چھوٹے اور غریب لوگوں کو پیسے کی ضرورت تو مجبور کر دیتی ہے۔''

''کون ہے وہ لڑکی!'' بیگم تہمینہ ایمن پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''ماسی حبیبہ کی بیٹی نور ہے اُس سے اسد کی شادی کرائیں گے۔ جب اسد ٹھیک ہو جائے گا تو نور کو طلاق کرا دیں گے اور یوں ہو جائے گی نور کی چھٹی۔'' ایمن نے شاطر مسکراہٹ کے ساتھ چٹکی بجاتے ہوئے جواب دیا۔

''دیکھ لو کہیں کوئی پرابلم نہ ہو جائے یہ غریب لوگ ضرورت مند اور لالچی تو ہوتے ہیں لیکن ان میں ضد بھی ہوتی ہے یہ یاد رکھنا۔''

☆......☆......☆

''آپ سوپ لے لیجیے آپ کی صحت کے لیے اچھا ہے۔''

''تم کون ہو اور میرا اتنا خیال کیوں رکھتی ہو؟''

''میں نرس ہوں آپ کا خیال رکھنا میرا کام ہے۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام نور ہے۔''

''نور از گڈ نیم۔'' نور کے معنی روشنی کے ہیں تم واقعی روشنی ہو بالکل چاندنی کی طرح ٹھنڈی اور اُجلی روشنی۔'' اسد نے نور کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

''آپ پلیز یہ میڈیسن لیں اور آرام کریں۔'' نور نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ بتاؤ وہ لڑکی کون ہے جو میرے کمرے میں آ کر تمہیں ڈانٹتی ہے شور کرتی ہے۔''

''وہ ایمن بی بی ہیں آپ کے انصار انکل کی بیٹی اور بہت جلد آپ کی اُن سے شادی ہو جائے گی وہ سامنے فریم میں جو تصویر لگی ہے اُس میں ایمن بی بی آپ کے ساتھ ہیں آپ لوگ سیر و تفریح کے لیے گئے تھے وہاں بنوائی تھی یہ تصویر۔''

''ہٹا دو یہ تصویر یہ لڑکی مجھے اچھی نہیں لگتی۔''

''ٹھیک ہے ہٹا دوں گی یہ تصویر لیکن اِس فریم میں کس کی تصویر لگے گی یہ بھی تو بتایئے؟''

''نور کی یہاں تصویر ہو گی۔'' اسد نے بڑے پیار سے نور کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''اسد صاحب یہاں آپ کی ہونے والی دلہن کی تصویر لگے گی میری نہیں۔ میں ایک نرس ہوں اپنے کام کی تنخواہ لیتی ہوں ایمن بی بی آپ کی دلہن ہیں۔'' نور نے اسد کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''تم غلط کہتی ہو اسد کی دلہن تم ہی ہو بالکل صحیح پسند ہے اسد کی۔''

'' اسد تمہارے دل کی رانی اور ہماری نوکرانی۔'' ایمن نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''خبردار نور کو نوکرانی مت کہنا وہ میری زندگی کا حصہ ہے میری محبت ہے۔'' اسد غصے سے چیخ پڑا۔

''ایمن بی بی اسد صاحب کی حالت پر رحم کریں وہ آپ کے ہونے والے شوہر ہیں اگر یہ حادثہ نہ ہوتا تو آپ دونوں کی شادی ہو جاتی آپ اُن کا رشتہ مجھ سے جوڑ رہی ہیں اُن کا احساسات اور جذبات کا مذاق اڑا رہی ہیں۔''

نور نے ایمن کی بے حسی میں احساس جگانے کی کوشش کی۔

''اس میں غلط کیا ہے؟ ہماری بے کار

استعمال شدہ چیزیں تم استعمال کرتی رہی ہو۔ اسد بھی اپنا ماضی بھولنے کے بعد میرے لیے بے کار ہے۔''

''ایمن جی چیزوں اور انسان میں فرق ہوتا ہے۔ توجہ اور محبت مانگتے ہیں۔''

''اسی لیے تو کہتی ہوں تم اسد سے شادی کرلو محبت اور توجہ کی کمی پوری کردینا اور جب اس کا ماضی اسے یاد آجائے تو اس سے طلاق لے لینا میں شادی کرلوں گی اس سے۔'' ایمن نہایت سرد لہجے میں بولی۔

''بہت خوب آپ صرف اچھے وقت کی ساتھی ہیں قربانی میں دوں اور حق آپ کا۔'' نور نے ایمن کے سامنے کھڑے ہوکر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''تم چھوٹے لوگوں کی یہی اوقات ہے ذرا سا کام پڑ جائے تو اپنی اہمیت جتاتے ہو، قیمت مانگتے ہو...... بے فکر رہو ہم بغیر قیمت کے کوئی کام نہیں لیتے اسد کی صحت یابی اور تمہاری طلاق کے بعد اتنی رقم دیں گے کہ تم ماں بیٹی کو محنت مشقت سے نجات مل جائے گی اگر کہو گی تو تمہاری حیثیت کے کسی گھرانے میں تمہاری شادی بھی کرادیں گے۔''

''ضرور آپ اپنی یہ آفر سنبھال رکھیں ہوسکتا ہے یہ ڈیل ہوجائے ممکن ہے نا بھی ہو مجھے اسد صاحب کو میڈیسن دینا ہے پھر ملاقات ہوگی۔'' نور نے پُراعتماد مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ملاقات مائی فٹ...... معلوم نہیں کیا سمجھتی ہے خود کو یہ معمولی سی نرس اس کے مزاج بھی زمین پر آجائیں گے۔ یہ بازی میرے ہاتھ میں آجائے پھر دیکھتی ہوں اس کو بھی۔'' ایمن نے اپنا غصہ زمین پر پیر پٹختے ہوئے نکالا۔

''اب ہم کو شادی کرلینا چاہیے۔'' اسد نے اپنی بے قراریوں کو زبان دے دی۔

''اس کے لیے تو آپ میری اماں سے بات کریں وہ فیصلہ کریں گی۔'' نور نے ٹیبل پر ناشتہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''اسد صاحب نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے وہ تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' حبیبہ نے نور کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اس میں کیا مشکل ہے اماں تم بھی تو میری شادی کرنا چاہتی ہو۔''

''مشکل یہ ہے کہ وہ بیمار ہیں اپنی پچھلی زندگی کی یادیں بھول چکے ہیں اور پھر تہمینہ بیگم نے اسد صاحب کی صحت یابی کے بعد طلاق کی شرط رکھی ہے۔''

''یہ کوئی مشکل نہیں ہے وہ بیمار بھی نہیں ہیں اور اُن کی یادداشت بھی آہستہ آہستہ بہتر ہوجائے گی اب رہی طلاق والی شرط تو وہ بعد کی بات ہے۔'' نور کا پُراعتماد لہجہ بہت کچھ کہہ گیا۔

''اگر تجھے کوئی اعتراض نہیں تو میں بھی اس شادی کے لیے راضی ہوں۔'' نور کو ماں نے گلے لگا کر دعائیں دیں۔

''ہماری شادی کو چند ہفتے ہوئے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے ہم نے عمریں ساتھ گزاری ہوں۔'' اسد نے محبت سے کہا۔

''مجھے بھی لگتا ہے جیسے ہم ہمیشہ سے ساتھ تھے۔'' نور نے پیار سے اسد کا ہاتھ تھام کر جواب دیا۔

''میرے ماں باپ ایک فضائی حادثے میں اس دنیا سے چلے گئے ہیں میں اور میری بہن بالکل تنہا رہ گئے ایمن کے پاپا انصار انکل نے ہم دونوں کو سنبھالا آپی کی شادی ہوگئی وہ کینیڈا چلی

گئیں میں یہ سمجھتا رہا کہ انکل نے اپنے بھائی کی محبت میں ہماری پرورش کی ہے لیکن جب انہوں نے ڈیڈی کا بزنس ٹیک اوور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب کاروبار کا لالچ تھا لیکن میں اس لیے خاموش رہا کہ انہوں نے ہمیں مشکل وقت میں سنبھالا تھا اور ڈیڈی کے بھائی بھی ہیں میں نے ایم بی اے کرلیا تو انکل نے میرا رشتہ ایمن سے طے کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔

میں اس کو اُن کا خلوص اور پیار سمجھا آنکھیں بند کر کے ایک خواب کے پیچھے بھاگنے لگا۔ جیسے بچے تتلیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں اور ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا سوائے کچے رنگوں کے۔''

اسد نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے بات مکمل کی۔

''آپ کو تو سب کچھ یاد ہے پھر یہ یادداشت کے چلے جانے کی کہانی ہے؟'' نور نے حیرت زدہ ہوکر سوال کیا۔

''کہتے ہیں نا اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے اس ایکسیڈنٹ نے کئی چہروں کو بے نقاب کردیا اُن کی لالچ بے حسی اور خودغرضی کو ایکسپوز کردیا میں اپنے ماضی کی یادیں بھول گیا تھا لیکن صرف چند دن کے لیے اور جب میں نے ایمن اور آنٹی کا بدلتا رویہ دیکھا اور ایمن کو یہ کہتے سنا کہ ''وہ اپنی سوشل لائف میرے لیے خراب نہیں کرسکتی اُس کے پاس فضول وقت نہیں کہ وہ میرے ماضی کی یادیں تلاش کرے اُسے تو ایک پُرمسرت شادی شدہ زندگی گزارنا ہے اُسی دن سے اپنے ماضی کی یادوں کو ایک پوشیدہ راز کی طرح چھپالیا...... پھر مجھے تم مل گئیں ایک مسیحا بن کر اور اب میری ہمدم اور شریک حیات بن گئی ہو۔''

''ویری گڈ خوب ڈرامہ کیا ہے تم نے اور اس گھٹیا نرس نے لیکن میں یہ کھیل ختم کروں گی تم دونوں کو شوٹ کردوں گی۔''

ایمن ناجانے کب سے چھپ کر اُن کی باتیں سن رہی تھی وہ جیسے ہی اپنے پرس سے پسٹل نکالنے لگی نور نے درمیان میں رکھی میز کو پوری قوت سے دھکا دیا اور ایمن میز سے ٹکرا کر خود کو سنبھال نہ سکی اور گر پڑی اُس کے ہاتھ کو اسد نے قابو کیا۔

''واچ مین پولیس کو فون کرو اس لڑکی نے ہم پر قاتلانہ حملے کی کوشش کی ہے اب معلوم ہوگی تمہیں تمہاری اوقات اور حیثیت تم جیسی لالچی لڑکی کی میری زندگی میں کوئی جگہ نہیں اور جو میرے بزنس اور پراپرٹی کے معاملات ہیں وہ اب میرا وکیل انصار صاحب سے عدالت میں طے کرے گا فی الحال تم اپنی اور اپنے باپ کی ضمانت کی فکر کرو کیونکہ تم دونوں پر فراڈ اور دوسرے کئی مقدمات کروں گا۔''

''آیئے انسپکٹر صاحب یہ آپ کی مہمان ہیں انہیں بڑی عزت سے لے جائیں اور ان کو ان کی حیثیت اور اوقات ضرور بتایئے گا کیونکہ انہیں دوسروں کی حیثیت اور اوقات جاننے کا بڑا شوق ہے۔'' اسد نے طنز کا بھرپور وار کیا۔

''آپ فکر نہ کریں وہ ہم بتائیں گے اچھی طرح بتائیں گے۔'' انسپکٹر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور سپاہیوں نے ایمن کو گرفتار کر کے لے گئے۔

''اب ہماری زندگی میں محبت ہوگی بھیگا بھیگا موسم اور دھنک رنگ صبح شام ہوں گے۔'' اسد نے نور پر بھرپور نظر ڈالتے ہوئے شرارت سے کہا اور دونوں کی بھرپور ہنسی فضا میں بکھر گئی۔

☆☆......☆☆

''ٹھیک ہے......'' سارا بے نیازی سے بولی۔

''مجھے اگنور کرنے کے لیے آپ چاول دھودھو کر اُن کی ساری غذائیت ختم کر دیجیے...... میرا کیا ہے مجھے تو کوئی اعتراض نہیں...... لیکن اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ......''

''کیا ظاہر ہوتا ہے؟'' زارا نے پانی بند کر کے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہوں...... تو دھل گئے آپ کے چاول......'' وہ خفگی سے بولی۔

گوشت بھون کر دیگچی کو ڈھک دیا اور زارا کی طرف مڑی۔

''اس سے میرے شک کی تصدیق ہوتی ہے۔''

''دیکھو سارا......'' زارا نے پیار سے ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھے۔

''تم ابھی چھوٹی ہو تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں...... زیب نہیں دیتیں...... اگر امی جان یا بابا جانی تمہیں سن لیں تو سمجھو صدمے سے بے ہوش ہو جائیں۔''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں آپی...... وہ زمانہ نہیں رہا اب کہ نواب محل میں لڑکیاں بارہ دری کی طرف جاتے شرماتے پھونک پھونک کر قدم رکھنے جا رہی ہوں کہ کہیں کوئی دیکھ کر یہ نہ سمجھ لے کہ لڑکی ضرور چھوٹے نواب حکمت علی خان سے ملنے جا رہی ہے۔''

''یہ نواب حکمت علی خان کہاں سے آ گیا......'' زارا حیرت سے بولی۔

''بس ہے کوئی......'' سارا شرارت سے شرماتے ہوئے بولی۔

''بخدا آپی آپ ایسی باتیں تو نہ پوچھیں جن سے ہمیں شرم آئے...... اور یوں بھی آپ نے ہمیں کچھ بتایا ہے جو ہم بتائیں...... بس اتنا بتا سکتے ہیں کہ چھوٹے نواب کی شہزادے سے کسی صورت کم نہیں ہیں...... اگر کم ہیں بھی تو بس تھوڑے سے ہی ہوں چٹکی برابر...... ورنہ کئی نواب تو اُن کے آگے پانی

بھرتے نظر آتے ہیں۔''
''پانی بھرنے پر یاد آیا..... پانی کا بڑا والا تھرماس بھرا ہے یا نہیں..... وہ بھی تو ہمارے ساتھ جائے گا۔'' زارا نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔
''ستیاناس مار دیا سارے رومانس کا..... بہت بور ہیں آپ..... اور یہ بڑا تھرماس کہاں جائے گا..... یہاں تو کسی کو بات کرنے کی اجازت نہیں اور تھرماس کو کس نے اجازت دے دی اپنی محبوبہ سے ملنے کی؟'' سارا باز نہیں آئی۔
''سارا میں تمہیں خبردار کر رہی ہوں ایسے الفاظ نواب طلال مرزا کی پوتی کے منہ سے اچھے نہیں لگتے..... ہمیں ہمیشہ تہذیب کے دائرے میں رہ کر شائستہ الفاظ میں گفتگو کرنی چاہیے۔ یہی ہمارے آباؤ اجداد کا ورثہ ہے اور یہی ہمارے مذہب کا تقاضا ہے۔''
''اُفوہ آپ نے تو لیکچر شروع کر دیا آپی..... آپ کے سامنے تھوڑا سا ہنس بول رہی ہوں..... دل کا بوجھ ہلکا کر رہی ہوں..... ورنہ سب کے سامنے ایسے تھوڑی بولتی ہوں۔'' سارا نے برا سا منہ بنایا۔
''دل کا بوجھ.....؟'' زارا ایک دم فکر مند ہوگئی۔
''کون سا بوجھ ہے تمہارے دل پر..... مجھے بتاؤ میں ایک منٹ میں مسئلہ حل کر دوں گی۔''
''یہ کوئی مسئلہ فیثا غورث نہیں ہے کہ آپ حل کر دیں۔'' سارا خاموش ہوگئی۔
''پھر بھی اگر کسی بات کا کوئی ایسا بوجھ ہے تو تم مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔ میں تمہاری بہن ہی نہیں سہیلی بھی ہوں۔'' زارا واقعی پریشان ہوگئی۔
''آپ نے مجھے اپنا راز بتایا ہے جو میں بتاؤں؟'' وہ لہجے کو غم ناک بناتے ہوئے بولی۔
''سارا..... میری پیاری بہن..... میرا کوئی ایسا راز ہے ہی نہیں جو تمہیں بتاؤں..... لیکن تم اگر کسی وجہ سے پریشان.....''
وہ اتنا ہی بولی تھی کہ سارا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر ہنستے ہنستے اُس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔
زارا اِس کی شرارت سمجھ کر گھور کر اُسے دیکھنے لگی۔
''تمہارا رویہ تمہاری حیثیت کے شایانِ شان نہیں ہے سارا..... تم بڑی بہن کو مذاق بنا رہی ہو.....''
''ارے نہیں آپی..... میں ایسی جرأت کر سکتی ہوں بھلا..... میں تو بس یہ دیکھ رہی تھی کہ میں اچھی اداکاری کر سکتی ہوں یا نہیں..... چھٹیوں کے بعد کالج میں ڈرامہ اسٹیج کیا جائے گا..... جس میں مابدولت کو اہم رول ادا کرنا ہے..... کیسی رہی میری اداکاری؟'' اُس نے اشتیاق سے زارا کی طرف دیکھا۔
''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا سارا۔'' زارا کی جان میں جان آئی۔
''تو اِس کا مطلب ہے آپ نے پاس کر دیا مجھے.....'' وہ پرجوش انداز میں بولی۔
''بڑی بات ہے..... آپ کالج میں بہترین اداکارہ کا ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں..... آپ کی طرف سے قبولیت کی سند بہت بڑا اعزاز ہے میرے لیے..... میں تو نانو کے گھر میں خوب ریہرسل کروں گی۔ مکالمے بھی اچھی طرح یاد کروں گی..... آپ میری مدد کریں گی نا؟''
''کیوں نہیں؟'' زارا نے پیار سے اُسے دیکھا۔
''دیکھ لیجیے گا..... جب ہمارا ڈرامہ کامیاب ہوگا تو سب کہیں گے..... کتنی اچھی اداکاری کی

ہے سارا نے اور کیوں نہ کرتی آخر زارا کی بہن ہے جسے بہترین اداکارہ کا ایوارڈ مل چکا ہے۔''
سارا بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔
''اچھا اب خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آجاؤ اور بتاؤ بریانی کی تہیں میں لگاؤں گی یا تم؟''
''آپ ہی لگا لیجیے...... میں صبح سے بہت زیادہ مصروف ہوں...... ساری پیکنگ میں نے کی ہے کھانا بھی میں نے بنایا ہے...... ایک تو بابا جانی گھر کے کھانے کے علاوہ کچھ بھی کھانا پسند نہیں کرتے...... ورنہ میرا تو دل چاہتا ہے۔ رستے میں رُک کر کسی عالی شان ہوٹل میں مزے سے کھانا کھایا جائے...... پر یہ امی جان اور بابا جانی......''
''ٹھیک ہی تو کہتے ہیں...... باہر گندی مندی جگہوں پر کھانے سے پیٹ بھی تو خراب ہو جائے گا اور پھر نانی حضور کے گھر میں مزہ ہی نہیں آئے گا۔''
''اُف پھر یہ بھاری بھرکم نانی حضور...... آپی آپ صرف نانو نہیں کہہ سکتیں اتنا چھوٹا کیوٹ سا اور پیارا سا لفظ ہے......''
''مجھے اُن کا عتاب سہنے کی ہمت نہیں ہے...... تم ہی ڈانٹ کھایا کرو ہر وقت......''
''یہی تو...... اسی بوجھ کا ذکر کر رہی تھی میں...... ہر وقت رسم و رواج اور روایات کے شکنجے میں قید ہو کر پوز کرنا اتنا مشکل ہوتا ہے۔'' سارا نے برا سا منہ بنایا۔
''تم پوز کیوں کرتی ہو...... عادت بنالو تو ذرا مشکل نہیں لگے گا۔''
''آپ کے لیے کہنا آسان ہے آپی...... آپ میں یہ خصوصیات قدرتی طور پر آئی ہیں...... دادی حضور سے ورثہ میں ملا ہے سب کچھ...... لیکن میں تو ایسی نہیں ہوں...... مجھے ہر وقت فکر رہتی ہے

کہ کہیں میں کوئی غلط لفظ نہ بول دوں...... کوئی غیر شائستہ بات نہ کردوں۔''
''ایسا مت سوچو سارا...... تمہیں پوز کرنے کی ضرورت نہیں ہے...... بس تم ویسے ہی ایکٹ کیا کرو جیسے تم مناسب سمجھو...... بس دل پر بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں اس طرح شخصیت پر برا اثر پڑتا ہے...... اچھا ایسا کرو اب تم جا کر دیکھو شہریار اور بابا جانی تیار ہیں یا نہیں...... میں بریانی دم دے دیتی ہوں...... پھر ہم مل کر سارا سامان گاڑی میں سیٹ کریں گے۔ اور کچھ ہی دیر میں رخصت ہو جائیں گے یہ سوچو نانی حضور کے گھر میں کتنا مزہ آئے گا۔'' زارا نے پیار سے اُس کے بال سنوارے۔
''نانو کے گھر میں......'' سارا زور دے کر بولی۔
''میں تو انہیں نانو ہی کہوں گی۔ کیا ضروری تھا کہ نانو کا تعلق کسی نوابی خاندان سے ہوتا...... اور نانا حضور اپنے گاؤں کے سردار ہوتے؟''
''قسمت سے کون لڑ سکتا ہے یقین کرو۔ اگر خدا نے پیدائش کے سلسلے میں بندے کو انتخاب کی سہولت دی ہوتی تو بہت سے لوگ ہماری جگہ لینے کو تیار ہوتے اس لیے کہتے ہیں ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔''
صفیہ بیگم نے کچن کے دروازے سے اندر جھانکا۔
''تم لوگ باتیں ہی کرتی جا رہی ہو یا کوئی کام بھی ہوا ہے۔''
''دونوں کام ساتھ ساتھ جاری ہیں امی جان......'' سارا نے کہا۔ اور باہر نکل گئی۔
''آپ اِدھر کرسی پر بیٹھ جائیں امی جان...... آج تو آپ بہت خوش ہوں گی۔ کتنے

عرصے بعد نانی حضور سے ملاقات ہو رہی ہے۔''

''ہاں بیٹا...... ابھی میں کمرے میں بیٹھی اپنے بچپن کی یادوں کو ہی تازہ کر رہی تھی۔ کتنی عزیز ہے مجھے وہ حویلی...... اُس کے بڑے بڑے روشن ہوادار کمرے...... بڑے بڑے دالان...... وسیع وعریض باغات اور اُن میں وہ پھل دار درخت...... میرا بچپن بہت ہی خوبصورت گزرا ہے۔ بابا جان اور امی حضور کے ساتھ...... کیا بے فکری کے دن تھے۔''

''اب بھی بے فکری ہی بے فکری ہے امی جان...... بس آپ کسی بات کو دل پر نہ لیا کریں۔ خوش رہنے کی کوشش کیا کریں۔ خدا نے آپ کو اتنی پیاری پیاری بیٹیاں دی ہیں...... اتنا کیوٹ اور ہونہار فرزند عطا کیا ہے اور پھر بابا جانی کتنی محبت کرتے ہیں آپ سے...... ہم سب سے...... میں تو خود کو بہت خوش قسمت تصور کرتی ہوں کہ آپ لوگوں کی اولاد ہوں...... اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں۔''

تبھی شہریار بے صبری سے اندر آیا۔

''کتنی دیر ہے آپی...... ہم تو جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں...... جلدی کیجیے نا اگر بابا جانی کے کوئی شاعر دوست آ گئے تو ہمیں کتنا انتظار کرنا پڑے گا...... جانتی ہیں آپ؟''

''آج ہمارا کوئی دوست نہیں آئے گا...... چھوٹے نواب...... ہم نے سب سے کہہ دیا ہے کہ ہم تعطیل پر جا رہے ہیں...... اپنے بچوں کے ساتھ مزے کرنے جا رہے ہیں۔''

''اب تو خوش؟'' نواب بلال مرزا بھی دروازے پر نمودار ہوئے۔

''شکریہ بابا جانی......''

''لیجیے باتوں باتوں میں بریانی کو دم بھی لگ گیا...... شہری آپ جا کر سب دروازے وغیرہ دوبارہ سے چیک کیجیے...... پھر ہم سامان گاڑی میں سیٹ کرتے ہیں۔''

''آپی ہم دوبارہ دیکھ چکے ہیں...... بابا جانی نے بھی چیک کیا ہے...... آپ کہیں تو سارا آپی سے بھی کہہ دیتا ہوں...... پھر تو یقیناً آپ کی تسلی ہو جائے گی نا؟''

''بہت شریر ہو گئے ہیں ہمارے چھوٹے نواب......'' زارا نے پیار سے اُس کے گال پر چٹکی لی تو اُس نے برا سا منہ بنایا۔

''اب ہم بڑے ہو گئے ہیں آپی...... اب ہمارے گال مت کھینچا کیجیے۔''

''اچھا کتنے بڑے ہو گئے ہیں آپ؟'' سارا اندر آ گئی۔

''بخدا بہت درد ہوتا ہے...... آپ کو شاید یقین نہیں۔''

''نہیں ہمیں آپ کی بات پر پورا یقین ہے پر کیا کریں ہمیں پیار بہت آتا ہے آپ پر۔'' زارا نے محبت سے کہا۔

صفیہ بیگم، نواب بلال مرزا محبت سے اپنی خوبصورت فیملی کو دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں اُن کی بلائیں لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد یہ چھوٹا سا خاندان زارا کی نانی حضور سطوت آراء اور نانا سکندر خان کے گاؤں کی طرف رواں دواں تھے۔

☆......☆......☆

مری کے مضافات میں سفید اور براؤن پتھروں سے بنا وہ بڑا سا گھر پوری آن بان سے کھڑا تھا۔ چاروں طرف سرسبز کھیت اور اونچے درختوں کی ہریالی آنکھوں کو تراوٹ بخش رہی

تھی۔ سرسبز اونچے پرشکوہ پہاڑوں نے جیسے اس خوبصورت گھر کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا تھا۔ اور پہاڑوں پر پوری شان سے کھڑے آسمان کو چھوتے' چیڑ اور صندل و آبنوس کے درخت جیسے خدائے بزرگ و برتر کی حمد میں مصروف تھے۔

ملک آفتاب احمد اس گھر کے مالک تھے اور اپنے تینوں شادی شدہ بیٹوں کے ساتھ یہاں رہتے تھے۔ ملک آفتاب احمد کے بڑے بھائی گلزار احمد بیرون ملک سیٹ ہو چکے تھے اُن کے بھی دو بیٹے تھے۔ جو شادی کے بعد خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔ بڑے بیٹے کی اولادوں میں تین بیٹے شامل تھے جبکہ چھوٹا بیٹا دو بیٹوں کا باپ تھا۔ ملک آفتاب کا بڑا بیٹا شاہ نواز ایم بی اے کرنے کے بعد ایک اچھی کنسٹرکشن کمپنی سے وابستہ تھا۔ جو مری اور گلیات میں ٹورزم کے سلسلے میں مختلف ہوٹلز' ہٹس اور چھوٹے مکان بنا کر بیچتی تھی۔ شاہ نواز کے دو بیٹے تھے عمران اور کامران جو بالترتیب بارہ اور دس سال کے تھے شاہ نواز سے چھوٹے شاہ ایاز بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بڑے بھائی کے ساتھ ہی لگ گئے تھے۔ اور پوری تن دہی سے اُن کی مدد کر رہے تھے اُن کے بھی دو ہی بیٹے تھے جن کی عمریں سات اور پانچ سال تھیں۔ سب سے چھوٹے شاہ زیب تھے۔ جنہوں نے چار سال پہلے ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کی تھی۔ پھر دو سال اسپیشلائزیشن کے لیے ملک سے باہر بھی گئے تھے۔

آج کل وہ اسلام آباد کے ہاسپٹلز میں کام کرتے تھے۔ ملک آفتاب خود بھی تعلیم یافتہ تھے عمدہ شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ وہ مری کے مضافات میں ہی اُن کے لیے تمام سہولیات سے مزین ایک کلینک بنوائیں جہاں شاہ زیب وہاں رہنے والے مستحق لوگوں کو صحت کی سہولتیں دے سکیں۔ جن کے لیے مناسب اور سستا علاج ایک خواب بن کر رہ گیا تھا اور ذرا سی تکلیف کے لیے انہیں مہنگے داموں سفر کر کے اپنی خون پسینے کی کمائی کچھ لالچی ڈاکٹروں کو دے کر اپنا علاج کروانا پڑتا تھا۔ جو ان کے لیے تکلیف دہ تو تھا ہی اُن کی پہنچ سے بھی باہر تھا۔

لیکن شاہ زیب کا خیال تھا کہ انہیں کچھ عرصہ اسلام آباد کے ہاسپٹلز میں کام کر کے یہاں کے طریقہ کار کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ یہاں کے سسٹم کی خوبیوں اور خرابیوں کے بارے میں جان لینا چاہیے۔ لوگوں کی نفسیات کے علاوہ یہاں کی ایڈمنسٹریشن کو سمجھ لینا چاہیے پھر وہ ضرور اُن کی بات مان لیں گے۔

''بیٹا جی آپ ساری عمر یہاں رہے ہیں کیا آپ یہاں کے لوگوں کے مسائل اور اوپر بیٹھے لوگوں کی نفسیات کو نہیں جانتے...... یا پھر دو سال اس ملک سے دور جانے کے بعد سب بھول گئے ہیں؟'' ملک آفتاب کی آنکھوں میں ایک شوخ سی چمک ہوتی۔

''میں نہیں سمجھتا تھا ہمارا سب سے چھوٹا بیٹا سب سے خراب یادداشت کا مالک ہے۔'' شاہ زیب اُن کی شرارت سمجھ کر مسکرائے۔

''یہ بات نہیں ہے بابا جان...... دراصل اُدھر اور اِدھر کے سسٹم میں اتنا فرق ہے کہ میں پہلے اس میں بیلنس قائم کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں میرے سب دوست بھی ہیں جو میرے ساتھ اُن ہی ہاسپٹلز میں کام کرتے ہیں۔ ہم سب مل کر ان خرابیوں کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کو تھوڑا ریلیف دینا چاہتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں مجھے بچپن سے ہی خدمت خلق کا شوق رہا ہے۔ یہاں

کے لوگوں کا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا......'' وہ ایکدم سے افسردہ ہوگئے تو ملک آفتاب کی آنکھوں میں پھر سے شرارتی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

''ہاں تمہاری خدمت خلق کے جذبے کے تو ہم اُس دن سے ہی قائل ہوگئے تھے۔ جب تم پانچ سال کی عمر میں ایک زخمی بلی کو گود میں اٹھائے روتے ہوئے اپنی مرحومہ ماں کے پاس لائے تھے اور اُس کی مرہم پٹی کی تھی۔''

اس وقت پتھروں سے بنے اِس گھر کے خوبصورت لاؤنج میں ایزی چیئر پر بیٹھے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ اتنے سال پیچھے پہنچ گئے۔ آتش دان میں جلتی آگ کے شرارے رقص کررہے تھے۔ کمرہ خوشگوار حرارت سے بھرا تھا۔ سامنے میز پر تازہ اخبار پڑا تھا۔ گلدانوں میں پھولوں کی دلفریب مہک چاروں طرف پھیلی تھی۔ لیکن وہ اس کمرے میں کہاں موجود تھے۔ وہ تو کئی برس پیچھے اُس دن کی اذیت ناک اور روح فرسا تکلیف کے احاطے میں قید تھے جب اُن کی محبوب بیوی قیصر بانو کا جسدِ خاکی سامنے تھا۔ اُن کے تینوں بیٹے اُن کے سامنے غمزدہ بیٹھے تھے۔ قیصر بانو کو کینسر ہوگیا تھا۔ اُن کی طبیعت تو کچھ عرصے سے خراب تھی لیکن یہ کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ انہیں ایسا موذی مرض لگ چکا ہے۔ اور جب پتہ چلا تو بیماری آخری اسٹیج پر تھی۔ پھر انہیں اسلام آباد ہاسپٹل میں لے جانے کے باوجود وہ دنوں میں ہی ختم ہوگئیں۔ شاہ زیب سب سے چھوٹا تھا' اُس وقت اُس کی عمر محض بارہ سال تھی۔ ماں اور باپ دونوں کا لاڈلہ تھا۔ بڑے دونوں بھائی بڑے صبر و ضبط کا مظاہرہ کررہے تھے۔ لیکن شاہ زیب غم سے نڈھال زاروقطار رورہے تھے اور شاید ماں کی اس طرح موت کی وجہ سے ہی انہوں نے ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کیا تھا۔

ملک آفتاب نے ٹھنڈی سانس لے کر اخبار اٹھایا۔ اور بے دلی سے ورق گردانی کرنے لگے۔ تبھی اُن کی بڑی بہو تابندہ اندر داخل ہوئیں اور سیدھی اُن کی طرف آکر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''کیا پڑھ رہے ہیں بابا؟ کوئی خاص خبر ہے؟''

''خبریں تو ساری ہی دل شکن ہیں بیٹا...... بس کوئی خاص نہیں ہے...... تم بتاؤ تمہیں کون سی خبر خاص لگتی ہے...... فیشن کا صفحہ چاہیے یا یہ معلوم کرنا چاہتی ہو آج کل اچھی سیل کہاں لگی ہے؟'' وہ پچھلا غم بھلا کر زندہ دلی سے بولے۔

''نہیں تو بابا...... اگر کھانے کی کوئی ترکیب ہے تو وہ بتائیں...... ہے ایک چٹورہ' پیارا سا شخص جس کے لیے اسپیشل کچھ پکانا چاہتی ہوں...... لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' تابندہ بھی ملک آفتاب کی کمپنی میں رہ کر شرارتی ہوگئی تھی۔ حساب برابر کرنے کی خاطر بولی۔ تو وہ خوش دلی سے مسکرائے۔

''آج کیا کھانا پسند کریں گے بابا؟''

''بھئی بچوں سے پوچھ لیا ہوتا......'' وہ کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے بولے۔

''بچے تو اسکول جاچکے...... اُن کے بابا اور چاچو بھی چلے گئے۔ یوں بھی سب باپ بیٹوں اور پوتوں کی پسند ایک ہی ہے۔ اس لیے آپ ہی بتادیجیے۔''

''چلو اگر تم مجبور کررہی ہو تو ہم بتائے دیتے ہیں......'' انہوں نے اخبار سائیڈ پر رکھ دیا تابندہ ہنستے ہوئے ہمہ تن گوش تھی۔ تبھی چھوٹی بہو عالیہ بھی وہیں آگئی۔

''بھئی عالیہ سے پوچھ لو۔'' آفتاب احمد

جلدی سے بولے۔
"چلو میں ہی بتا دیتی ہوں...... آج ہم بینگن آلو اور مونگ کی دال بنا لیتے ہیں۔" اُس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ لیکن آفتاب احمد نے چہرے سے بالکل مایوسی ظاہر نہیں ہونے دی۔

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں بہو...... ہم تو ٹھہرے بوڑھے مریض ہمارے لیے تو مونگ کی دال والا پرہیزی کھانا چل جائے گا...... آپ اپنے شوہروں کی فکر کریں جو اپنے باپ سے بھی زیادہ چٹورے ہیں یا اپنے نخریلے صاحبزادوں کے بارے میں سوچیں جو دال اور بینگن پر خوب مدح سرائی کریں گے۔"

"اُن کی تو آپ فکر ہی نہ کریں اُن کو ہم آسانی سے ہینڈل کرلیں گے۔ آپ بتائیں آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں......"

"ایک فیصد بھی نہیں۔" وہ بڑی بہادری سے بولے لیکن دل اندر سے بیٹھ گیا۔ کہیں یہ بہادری اور بے نیازی مہنگی نہ پڑ جائے۔ مونگ کی دال اور بینگن تو وہ خواب میں کھانا بھی پسند نہیں کرسکتے تھے۔

دونوں بہوئیں کچن میں چلی گئیں تو انہوں نے ٹی وی لگا کر دل بہلانے کی کوشش کی۔ لیکن دل تو بس مونگ کی دال اور بینگن میں اٹکا رہا۔ گھبرا کر انہوں نے ٹی وی بند کردیا۔ اور باہر کا نظارہ کرنے کے لیے گھر سے باہر چلے آئے۔ دور تک پھیلے سرسبز کھیت دل میں خوشی کی کرنیں بکھیر گئے۔ کھیتوں میں اُن کے ملازمین کام کر رہے تھے۔ مالک کو دیکھ کر ہاتھ اور بھی تیزی سے چلنے لگے۔ آفتاب احمد یہ دیکھ کر مسکرائے۔ فطرتِ انسانی بھی کیا عجیب چیز ہے۔ ایک گورکھ دھندا ہے۔ انہوں نے پُرسوچ نظروں سے دور پہاڑوں کی جانب دیکھا۔

دل بے اختیار خدا کے حضور سجدہ ریز ہوگیا...... پُرشکوہ درازقد درختوں کے سائے پہاڑوں کو کسی طرف سے سرمئی بنا رہے تھے اور سورج کی کرنیں دوسری طرف سے سنہری اور سبز بنا رہی تھیں۔ اُن کے دل میں ڈھیر سارا سکون اتر آیا۔ لمبے لمبے سانس لے کر انہوں نے پھولوں اور فصلوں کی مہک اپنے اندر اُتاری۔

بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اور وہ روزانہ اِس وقت یہاں باہر بیٹھنا پسند کرتے تھے تاکہ اپنے پیارے پوتوں کا استقبال کرسکیں۔ پوتوں کی جان بھی دادا میں تھی۔ بہت محبت کرتے تھے اُن سے...... یہ تو انسانی فطرت ہے محبت کے جواب میں ہمیشہ محبت ہی ملتی ہے۔ وہ ماں باپ کے غصے کے آگے ہمیشہ اُن کے لیے ڈھال بنے تھے اور پھر پیار سے انہیں سمجھایا تھا۔ دادا کی بات وہ آسانی سے سمجھ جاتے تھے۔

"دادا...... دادا جانی...... پیاری پیاری آوازوں پر وہ چونک کر تصوراتی دنیا سے نکل آئے۔ خدا بخش بچوں کو اسکول سے لے کر آ رہا تھا۔ چاروں دوڑ کر اُن سے لپٹ گئے۔ سب سے چھوٹے پانچ سالہ وارث کو انہوں نے گود میں اٹھالیا۔

وہ اسی سال اسکول داخل ہوا تھا۔ اس لیے ابھی تک تھوڑا اپ سیٹ تھا۔ آفتاب احمد ہر وقت اُس کی حوصلہ افزائی اور دل جوئی میں لگے رہتے۔ اب آہستہ آہستہ وہ سنبھلنے لگا تھا۔ سب اندر آئے تو بہوئیں اپنے اپنے بچوں کا منہ دھلواتے اور کپڑے بدلوانے لے گئیں اتنی دیر میں شاہ نواز اور شاہ ایاز بھی اکٹھے داخل ہوئے۔ آفتاب احمد کے دل سے بے اختیار بیٹوں کے لیے دعائیہ کلمات ادا ہوئے۔ گھر قریب ہونے کی وجہ سے وہ دوپہر کا کھانا کھانے گھر آئے تھے۔

فیروزہ بی بی نے ٹیبل سیٹ کر کے کھانا لگا دیا تو سب ہاتھ منہ دھو کر آ گئے۔ شاہ نواز نے سب سے پہلے بابا کو ہیڈ آف دا ٹیبل بٹھایا اور پھر سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

''لیجیے بابا..... پہل کیجیے۔'' شاہ نواز نے ڈونگہ اُن کے سامنے کیا۔ نرگسی کوفتوں کی مزیدار خوشبو نے اُن کے منہ میں پانی بھر دیا۔ لیکن انہوں نے ڈونگے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا' سنجیدگی سے بیٹھے رہے۔ شاہ نواز نے حیرانی سے دیکھا جبکہ تابندہ اور عالیہ اندر ہی اندر مسکرانے لگیں۔

''بابا..... لیجیے نا..... لے کیوں نہیں رہے؟'' شاہ نواز احترام سے بولے۔

''بیٹا یہ تو کوفتے ہیں۔''

''آپ کو بے حد پسند ہیں کوفتے۔'' شاہ ایاز بھی کنفیوز تھا۔

''لیکن بہو نے تو آج میرے لیے مونگ کی دال اور بینگن آلو بنائے ہیں۔ میں وہی کھاؤں گا..... میں اپنی پیاری بہوؤں کو ناراض نہیں کر سکتا..... آخر اُن کے ساتھ رہنا ہے ساری عمر..... ناراض ہو گئیں تو اس غریب کا ٹھکانہ کہاں ہو گا۔''

''بابا..... '' تابندہ بے اختیار اُٹھ کر اُن کے قریب آئیں اور ان کے بازو کے ساتھ لگ گئیں۔

''ایسی باتیں تو نہ کریں بابا..... یہ گھر آپ کا ہے..... یہ بیٹے آپ کے ہیں..... یہ پوتے بھی آپ کے ہیں اور ہم..... ہم بھی تو آپ کی ہیں..... بخدا ہم دونوں مذاق کر رہی تھیں۔ ہمیں آپ کو دیکھتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ آپ دیور جی شاہ زیب کے لیے بہت اُداس ہو رہے ہیں۔ اس لیے مذاق کر کے آپ کا دل بہلانا چاہتے تھے۔ پلیز ناراض نہ ہوں۔''

''دادا جی..... جلدی کریں نا.....'' کامران بے صبری سے بولا۔

''بریانی کی مہک سے ہمارا دل مچلا جا رہا ہے۔''

''ارے میں کہاں ناراض تھا۔ میں بھی تمہارے مذاق میں شامل ہو گیا تھا۔'' وہ خوش دلی سے مسکرائے اور ایک نرگسی کوفتہ پلیٹ میں ڈال دیا۔ تابندہ نے چپاتی اُن کے سامنے کر دی۔

''بریانی منع ہے کیا؟'' وہ شرارت سے بولے۔

''میں سمجھی آپ کوفتے چپاتی کے ساتھ لیں گے.....'' تابندہ نے مسکرا کر کہا تو انہوں نے چپاتی اُس کے ہاتھ سے لے لی اور رغبت سے کھانے لگے۔

کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ بعد میں سب لاؤنج میں آ گئے۔

فیروزہ بی بی قہوہ لے آئیں تو سب اُس کا مزہ لینے لگے۔ شاہ نواز گھونٹ گھونٹ قہوہ پیتے ہوئے پُرسوچ انداز میں بولے۔

''بابا جان اس بار شاہ زیب نے آنے میں زیادہ دیر نہیں کر دی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں نواز چار ماہ تو ہو چلے ہیں۔'' تابندہ بولیں۔

''بابا، آپ بہت زیادہ اُداس ہیں۔ اُس بیوقوف کو اتنا اندازہ تو ہے کہ آپ اتنی دیر تک اُسے نہ دیکھیں تو بے چین ہو جاتے ہیں۔''

آفتاب احمد خاموش رہے۔

''لاڈلے بھی تو بہت ہیں بابا کے..... بہت پیار کرتے ہیں بابا اُن سے۔''

''تو اور کیا.....'' عالیہ شکایتی انداز سے شاہ ایاز کی طرف دیکھنے لگیں۔

''ہمارے شوہر تو ہمیشہ اُن کے بعد ہی آتے ہیں۔''

''بیوقوفی کی باتیں مت کرو عالیہ......'' شاہ ایاز کی آنکھوں میں ہلکی سی سرزنش تھی۔

''ایک باپ کے لیے ساری اولادیں ایک جیسی ہوتی ہیں...... یہ اور بات ہے کہ کسی وقت کسی خاص وجہ سے ایک کی جانب توجہ زیادہ ہو جائے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو ایاز...... اصل میں شاہ زیب امی کی وفات کے وقت سب سے چھوٹے تھے۔ اس لیے سب سے زیادہ اثر لیا...... سب سے زیادہ پریشان تھے۔ اس لیے بابا کو ان پر زیادہ توجہ دینی پڑی ورنہ اور تو کوئی بات نہیں......''

''بہو......'' آفتاب احمد نے عالیہ کی جانب دیکھا۔

''تم حارث سے زیادہ وارث کو زیادہ توجہ کیوں دیتی ہو؟''

''وہ اصل میں چھوٹا ہے نا...... نیا نیا اسکول جانا شروع کیا ہے تو کچھ پریشان رہتا ہے۔ اس لیے میں اُس کا دل بہلانے کے لیے......'' وہ چپ ہوگئی۔ اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو...... میں بھی اس لیے وارث کو زیادہ توجہ دیتا ہوں۔''

''بابا اگر آپ زیادہ اُداس ہیں تو......''

''نہیں بیٹا اگر شاہ زیب خود نہیں آیا تو کیا ہوا...... اُس کا فون تو آتا رہتا ہے میرا اور سب کا حال پوچھتا رہتا ہے...... وہ میرا بیٹا ہے...... ہمیں بھلا تو نہیں سکتا۔''

''پھر بھی اگر آپ چاہیں تو اُس سے ملوانے لے جاؤں اس ویک اینڈ پر۔''

''نہیں بیٹا...... وہ بہت مصروف ہے...... وقت نہیں نکال پا رہا...... جیسے ہی فرصت ملی آ جائے گا...... میں وہاں جا کر اُسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا...... ویسے بھی تم سب ہونا میرے پاس...... میرے پیارے پیارے پوتے ہیں...... کیوں بھئی آپ چاروں اب جا کر تھوڑا آرام کریں پھر اپنے اپنے بیگز لے کر ٹھیک چھ بجے اسی جگہ واپس آ جائیں...... ہوم ورک اور پڑھائی بہت ضروری ہے۔''

''اوکے دادا جان......'' سب آہستہ آہستہ اٹھے اور رہائشی کمروں کی طرف چل دیے۔

آفتاب احمد نے سکون اور اطمینان سے بھری سانس لی۔

''ہم بہت خوش قسمت ہیں۔ خدا نے ہمیں اتنی پیاری نعمتوں سے نوازا ہے جتنا بھی شکر کریں کم ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا جان...... ہم بہت خوش نصیب ہیں...... کس چیز کی کمی ہے ہمارے پاس......''

''کمی تو ہے بیٹا......'' آفتاب احمد کی آنکھوں میں حسرت سی ابھری۔

''کس چیز کی کمی ہے بابا...... میں سمجھا نہیں۔'' شاہ ایاز حیرت سے بولے۔

''ایک بیٹی کی کمی...... ایک پوتی کی حسرت...... خدا کی رحمت کی خواہش......''

''اوہ......'' شاہ نواز مسکرائے۔

''ہم تو اپنا خاندان مکمل کر چکے بابا جان اب یہ خواہش آپ شاہ زیب کے سامنے رکھیں۔''

''اب اُس کی شادی ہو جانی چاہیے...... بہت آزاد رہ لیے۔'' تابندہ مسکرائیں۔

''ہاں بابا جان......'' عالیہ بھی مسکرائیں۔

اب شاہ زیب کے پاؤں میں بیڑیاں پہنانے کا وقت آ چکا ہے۔

''انہیں بھی گھریلو ذمہ داریوں کا مزہ چکھنا چاہیے۔''

''تمہارا مطلب ہے انہیں کی بیویوں کے نازنخرے آٹھانے چاہئیں؟'' شاہ ایاز شرارت سے مسکرائے۔

''نازنخرے تو پھر اٹھانے ہی پڑتے ہیں۔''

تابندہ اور عالیہ بیک وقت مسکرائیں۔

''اور ہوسکتا ہے بابا آپ کی خواہش بھی پوری ہوجائے۔''

''مشکل ہے..... نہ تو ہماری کوئی بہن ہے..... نہ ہماری کوئی پھوپھی اور نہ ہی بیٹی..... ہماری بڑی خواہش تھی گلزار بھائی کی بیٹی ہوتی یا میری بیٹی ہوتی تو ہمارے خاندان جڑے رہتے۔ لیکن یہ حسرت ہی رہی۔ اب تم لوگ بھی ایسا نہیں کرسکو گے۔ لیکن خیر جیسے ہمیں پلی پلائی بیٹیاں مل گئیں.....انہوں نے محبت سے دونوں بہوؤں کی طرف دیکھا۔

''اسی طرح تم لوگوں کو بھی مل جائیں گی.....'' سب ہنس پڑے شاہ نواز اور شاہ ایاز ہنستے ہنستے اٹھ گئے۔

''اچھا بابا ہم چلتے ہیں شام کو ملاقات ہوگی۔''

''خدا حافظ بیٹا..... خدا خیریت سے واپس لائے۔''

جیسے ہی وہ دروازے سے باہر نکلے..... آفتاب احمد بھی آرام کی غرض سے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ گئے۔ تابندہ اور عالیہ بھی بچوں کو دیکھنے اٹھ گئیں۔

☆.....☆.....☆

رات کو شاہ زیب کی باتیں ہورہی تھیں اور یہ شاید ان باتوں کی کشش تھی جو صبح صبح اُسے کشاں کشاں وہاں کھینچ لائی۔ اتوار کا دن تھا۔ سب دیر سے سوکر اٹھے تھے اس لیے ناشتہ بھی دیر سے ہورہا تھا۔ سب سے پہلی نظر اس پر بچوں کی ہی پڑی سب ناشتہ چھوڑ کر اٹھے اور شاہو چاچو' شاہو چاچو کہہ کر اس سے لپٹ گئے اس نے بھی فرداً فرداً سب کو پیار کیا اور پھر وارث کو گود میں اٹھائے ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھا آفتاب احمد کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ محبت سے اُسے دیکھا شاہ زیب نے سر اُن کے سامنے جھکا دیا۔ انہوں نے پیار سے ہاتھ پھیرا اور بوسہ دیا۔

''آج آنا تھا تو کل رات ہی آجاتے بیٹا جی.....''

''ارادہ تو یہی تھا پاپا لیکن نکلنے والا تھا کہ ایک بہت سیریس کیس آگیا..... اُسے نمٹانے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ کیس چونکہ بہت نازک تھا اس لیے ذہنی طور پر بہت تھک گیا تو سوچا چند گھنٹے سوکر فریش ہوجاؤں..... ورنہ بل کھاتی ڈرائیونگ میں کہیں کوئی چوک نہ ہوجائے۔'' انہوں نے دلکشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ بہت اچھا کیا تم نے..... عقلمندی کا ثبوت دیا۔'' دونوں بھائی باری باری پُرجوش انداز میں بغل گیر ہوگئے۔ شاہ زیب کا انداز بھی محبت سے بھرا تھا۔

پھر بھابیاں شوخی پر آمادہ نظر آئیں۔ تابندہ نے معنی خیز مسکراہٹ سے اُس کی طرف دیکھا۔

''بہت اچھا کیا چھوٹے دیور جی جو آپ آگئے..... کل ہم آپ ہی کے بارے میں گفتگو کررہے تھے۔

''کیوں مجھ ناچیز کے بارے میں گفتگو کرنے

کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟'' شاہ زیب مسکرائے۔
''ضرورت ہی تو تھی دیور جی...... '' عالیہ بھی مسکرائیں۔
''اگر کسی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے کا ارادہ بن جائے تو اُس کے بارے میں گفتگو تو کرنی پڑتی ہے۔'' عالیہ کی آنکھوں میں چھپی شرارت دیکھ کر شاہ زیب نے سوالیہ نظروں سے شاہ نواز اور شاہ ایاز کی طرف دیکھا۔ وہ بھی معنی خیز انداز میں شرارت سے مسکرائے۔
''بابا جان کو ایک عدد پوتی کی شدید ترین خواہش ہے...... بہن اور بیٹی کی خواہش کو تو خدا کے حضور قبولیت نصیب نہیں ہوئی تو انہوں نے سوچا شاید پوتی کی صورت میں بات بن جائے۔ وہ ایک عدد پوتی سے والہانہ محبت کے شدید خواہشمند ہیں اور اب تو یہ خواہش جنون اور حسرت بنتی جارہی ہے۔
''اوہ تو یہ بات ہے......'' شاہ زیب کے چہرے پر دلکش شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔
''گستاخی معاف بھائی جان...... لیکن آپ دونوں اپنے باباجان کی شدید خواہش سے اتنے بے نیاز ہوں گے۔ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔''
''اگر ہم بے نیاز ہیں تو یار تم ہی یہ خواہش پوری کردو۔'' شاہ نواز نے جوابی وار کیا۔
''میں......'' وہ حیران ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔
''میں کیسے اُن کی یہ خواہش پوری کرسکتا ہوں۔''
''زیادہ بھولے نہ بنیے دیور جی......'' تابندہ مسکرائیں۔
''آپ تو ڈاکٹر ہیں سب جانتے ہیں......''

عالیہ نے شرارت سے آنکھیں نچائیں۔
''لیکن میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی......'' وہ بے حد معصومیت سے بولا۔
''تو شادی کو کون سا دیر لگتی ہے شاہو......'' شاہ نواز نے بیوی کا ساتھ دیا۔
''آج کل ہم لڑکیاں ڈھونڈ رہے ہیں...... جلد ہی کوئی مل جائے گی۔''
''کیا؟'' شاہ زیب کا چہرہ ایک لمحے کے لیے رنگ بدل گیا۔ لیکن جلد ہی خود پر قابو پا کر سنجیدگی سے سب کی طرف دیکھا۔
''ابھی میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے...... اس لیے پلیز آپ یہ زحمت مت کیجیے۔''
''کیوں بھئی بہت آزاد رہ لیے......'' شاہ ایاز نے غور سے اُسے دیکھا تمہاری عمر میں تو ہم دو بچوں کے باپ بن چکے تھے...... آخر یہ گریز کیوں؟''
''اگر کوئی خاص لڑکی ہے تمہاری نظر میں تو بتاؤ...... ہم اُسے دیکھنے بھی چلے جائیں گے۔''
''نہیں......'' شاہ زیب کے لہجے میں سختی آ گئی۔
''ابھی میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں......''
''تو میاں کیا بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو؟'' شاہ نواز نے چھیڑا تو شاہ زیب نے لب بھینچ لیے۔ چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات تھے۔ آفتاب احمد جو ساری نوک جھونک سن رہے تھے اور ساتھ ساتھ شاہ زیب کا عمیق نظروں سے جائزہ بھی لے رہے تھے۔ فوراً مدد کو پہنچے۔
''بھئی یہ کیا تم نے آتے ہی میرے بیٹے کا گھیراؤ شروع کردیا۔ اُسے فریش ہونے دو ناشتہ کرنے دو...... پھر بات کرنا...... جاؤ بیٹا اپنے کمرے میں جا کر فریش ہوجاؤ۔'' شاہ زیب نے

تشکر سے بابا کی طرف دیکھا اور جلدی سے کوریڈور کی طرف گھوم گئے جہاں رہائشی کمرے تھے۔

تابندہ نے معنی خیز نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔ شاہ نواز اور شاہ ایاز نے بھی خاموش نظروں سے بابا کی طرف دیکھا۔ جبکہ بچے منہ پھلا کر بیٹھ گئے۔

''آپ نے آتے ہی شاہو چاچو کو ناراض کردیا...... اب ہم اُن کے ساتھ وہ سارے مزے بھی نہیں کرسکیں گے...... اُن کا موڈ خراب رہے گا۔'' بابا مسکرائے۔

''میرے بچو ایسی کوئی بات نہیں ہے...... تمہارے شاہو چاچو جتنی جلدی ناراض ہوتے ہیں...... اتنی جلدی مان بھی جاتے ہیں۔ آپ بس دیکھ لینا اُس کا موڈ بہت جلدی ٹھیک ہوجائے گا...... اور وہ سب باتیں بھلا کر آپ سب کے ساتھ خوب مزہ کرے گا۔''

''لیکن بابا حضور مجھے لگتا ہے کوئی بات تو ہے...... شاہو میں تبدیلی نظر آرہی ہے۔'' شاہ نواز پُرسوچ انداز میں بولے۔

''میرا بھی یہی خیال ہے بابا جان...... دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔'' تابندہ بولیں۔

''اور میرا پتہ ہے کیا خیال ہے؟'' شاہ ایاز بھی سنجیدہ تھے۔

''مجھے پتہ ہے...... پوری دال ہی کالی ہے۔'' عالیہ شرارت سے بولیں لیکن کوئی بھی اُس کی بات پر مسکرا بھی نہ سکا۔ بابا ہی پُرخیال انداز میں بولے۔

''لگتا ہے میاں صاحب زادے کو محبت ہوگئی ہے۔ یہ سب حرکتیں اسی بات کی نشان دہی کرتی ہیں...... ہم نے دنیا دیکھی ہے...... ہم غلط نہیں ہوسکتے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے بابا...... وہ ہمیں بتائے تو سہی ہم اُس کی پسند کو دلہن بنا کر اس گھر میں لے آئیں گے اگر وہ اس قابل ہوئی تو......''

''یہی تو نازک پوائنٹ ہے...... اور صاحبزادے اتنی جلدی دل کا حال ہمارے سامنے نہیں اُگلیں گے...... تم دونوں تو جانتے ہو بچپن سے ہی ایسا ہے شاہو...... دل کی بات بتانا کبھی بھی آسان نہیں رہا اُس کے لیے...... ہاں اگر وہ چاہے تو صحیح وقت اور صحیح موقع پر خود ہی بتائے گا...... اگر تم لوگ زور دوگے تو اپنے خول میں سمٹ جائے گا اس لیے اس وزٹ میں اب اُس کی شادی کے بارے میں کوئی بات نہیں ہونی چاہیے...... ایک دو روز کے لیے تو آیا ہے...... اُسے اپنا وزٹ انجوائے کرنے دو...... پھر وہ ہوگا اور وہی کام کا بوجھ اُسے ریلیکس کرنے دو......''

''ٹھیک ہے بابا...... اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو ہم کچھ نہیں کہیں گے...... لیکن ایسا آخر کتنی دیر چلے گا...... شادی تو آخر کرنی ہے نا؟'' شاہ نواز بولے۔

''تم ہمیشہ سے بے صبرے رہے ہو...... اور اپنی اسی عادت کی وجہ سے بہت سے کام خراب کیے ہیں تم نے اپنی زندگی میں...... اور میں دیکھ رہا ہوں تمہاری یہ عادت تمہارے بڑے صاحبزادے کامران میں بڑی حد تک پائی جاتی ہے۔ تمہیں ابھی سے اُسے سمجھا کر اُس میں تحمل اور صبر کی خوبی پیدا کرنی ہوگی۔ اُس پر زیادہ توجہ دیا کرو باقی رہی شاہو کی بات تو وہ ہماری ذمہ داری ہے ہم اُس سے خود ہی نمٹ لیں گے۔ اُس کی شادی کا مسئلہ ہم خود ہی حل کرلیں گے۔ لیکن صبر

کے ساتھ عقل مندی سے ہینڈل کرلیں گے۔''
''کیا ہینڈل کریں گے بابا......'' شاہ زیب نہا کر کپڑے بدل کر مسکراتے ہوئے اندر آئے۔
''دیکھا بچو...... میں نے کہا تھا تمہارے چاچو جلد ہی تمہارے سامنے مزے کرنے آجائیں گے...... اب بیٹا پہلے ناشتے کے بارے میں بتاؤ...... کیا لو گے؟''
''مجھے صرف جوس کا گلاس چاہیے اور اگر فریش فروٹس ہوں تو کیا ہی بات ہے۔''
''کیوں نہیں...... ہمارے اپنے باغات کے پھل موجود ہیں...... بالکل تازہ...... آج ہی درختوں سے اُتار کر لائے گئے ہیں۔''
اتنے سارے خوبصورت پھل دیکھ کر شاہ زیب کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی پھل اُسے بچپن سے ہی مرغوب تھے۔
''دوپہر کے کھانے میں کوئی خاص چیز پکوانا ہو تو بتا دو...... اتنی دیر کے بعد آتے ہو کہ تمہاری فرمائشیں پوری کرنے کی حسرت ہی رہ جاتی ہے تمہاری بھابیوں کے دل میں۔'' بابا نے کہا تو شاہ زیب نے نظریں اٹھا کر محظوظ انداز میں بھابیوں کی طرف دیکھا۔ جنہوں نے فوراً ہی مسکین سی شکل بنالی۔ شاہ زیب بے اختیار مسکرا اٹھے۔
''بڑی بھابی کے ہاتھ کا چکن پلاؤ اور چھوٹی بھابی کے ہاتھ کے کوفتے اور کھٹے آلو۔''
''چاچو ناشتے کے بعد آپ ہمیں مری مال روڈ پر گھمانے لے جائیں گے نا؟ بابا اور بڑے چاچو تو فارغ ہی نہیں ہوتے...... اور دادا جی کو کوئی گاڑی نہیں چلانے دیتا۔''
''کیوں نہیں میرے شیرو...... سب تیار ہو جاؤ آج تم خوب مزے کرو گے۔''
''چاچو کے ساتھ؟'' وہ خوشدلی سے بولا تو تابندہ کو پھر شرارت سوجھی۔
''لیکن چاچو سے ایک فرمائش کرنا نہ بھولنا میرے شیرو۔''
''وہ کیا؟''
''یہی کہ شیروں کو ایک شیرنی بھی چاہیے......''
''بھابی آپ......'' شاہ زیب جز بز ہوا۔
''بھئی اب تین پشتوں کا ریکارڈ ٹوٹ جانا چاہیے...... اس گھر کو ایک پیاری سی گڑیا کی سخت ضرورت ہے...... جو چاروں طرف اپنی پیاری مسکراہٹ اور خوبصورت قہقہے بکھیر سکے۔'' شاہ زیب نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ کہنا تو چاہتے تھے کہ یہ شیرنی آپ ہی پیدا کرلیں لیکن ادب مانع تھا۔ اس لیے خاموش رہے بھابی اُسے مسکراتے ہوئے دیکھتے ہوئے کچن کی طرف مڑ گئیں۔
''لنچ ٹائم تک آجانا...... کہیں یہ شریر بچے وہاں رہنے پر مجبور نہ کردیں۔'' عالیہ بھی کچن کی طرف مڑیں۔ لیکن شرارت کرنا نہ بھولیں۔
''ویسے بھابی کچھ غلط نہیں کہہ رہیں...... بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان تو مکمل ہو چکے اب کوئی نیا فرد نہیں آئے گا...... اور تمہارے بابا جان جنونی حد تک ایک پوتی کے خواہش مند ہیں...... اب تم خود ہی دیکھ لو...... بابا کی محبت میں ہی انہونی کر کے دکھا دو۔'' شاہ زیب نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ حالانکہ اُس کی دنیا میں سوچ کا ایک جہاں آباد تھا۔ اور سوچ نگر کی اس نگری میں کیا کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے بچوں کو گاڑی میں بٹھایا اور دماغ سے ہر بات' ہر سوچ جھٹک کر مری کی جانب گامزن ہو گئے۔

☆......☆......☆

ماہا تین دن سے بخار میں پھنک رہی تھیں۔

اماں کے ہاتھ پاؤں پھولے جارہے تھے۔ ڈاکٹر کئی بار انہیں دیکھ کر جاچکے تھے۔ کئی دوائیاں تجویز ہوئیں۔ کئی ٹیسٹ لیے گئے۔ لیکن ان کا بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ جواد خاقانی اپنے دورے سے واپس آچکے تھے۔ چھٹیاں ہوجانے کی وجہ سے فواد بھی گھر آ گیا تھا۔ اور آتے کے ساتھ ہی ماں کو بخار کی حالت میں دیکھ کر بے حد پریشان تھا۔ یہاں اُس کا ماں کے علاوہ اور تھا ہی کون جو اُس سے گفتگو کرتا..... ایک اماں تھیں یا پھر وہ ملازمین سے تھوڑی بہت گفتگو کرکے دل بہلا لیتا..... زیادہ تر وقت تو ماما سے لاڈ پیار میں گزر جاتا۔

دنیا جہاں کی باتیں ہوتیں..... وہ تو ہر وقت اُس پر صدقے واری جاتیں فواد نے محبت کی بارش سے ایسے سیراب کیا تھا کہ دل میں کوئی حسرت باقی نہیں رہی تھی اپنا کمرہ ہونے کے باوجود زیادہ وقت ماں کے کمرے میں ہی ہوتا.....

ماں کی موجودگی میں اس کا کبھی کسی اور کام میں جی ہی نہیں لگتا تھا۔ جینا باجی کم ہی اُس سے بات کرتی تھیں۔ کبھی کرتی بھی تھیں تو زیادہ تر ڈانٹ اور غصے پر مشتمل ہوتی۔ بابا کو جانے کیوں اُس سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اُسے دیکھتے ہی چہرے پر غصے کی جھلک نمودار ہوجاتی۔ جس سے فواد کی جان جاتی تھی۔ وہ جب بھی اُسے دیکھتے یوں دیکھتے جیسے نظروں میں نگل ہی تو جائیں گے۔

اسی لیے فواد اُن کے سامنے آنے سے بڑی حد تک گریز کرتا تھا۔ بس ڈائننگ ٹیبل پر ہی ملاقات ہوتی..... تب بھی وہ نظریں جھکائے کھانے میں مشغول رہتا اُن کی طرف کبھی نظر اٹھا کر نہ دیکھتا..... سچی بات تو یہ ہے کہ اُسے پاپا بالکل اچھے نہیں لگتے تھے۔ جینا باجی بھی پسند نہیں تھیں۔ اُن کے ماتھے پر بھی اُسے دیکھ کر تیوری چڑھ جاتی۔ بس اُس کی دنیا تو اُس کی ماں ہی تھی۔ دونوں میں پیار کا انوکھا بندھن تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے..... ایک دوسرے کے بغیر تھوڑی دیر بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر بھی ماما نے اسے بورڈنگ اسکول میں داخل کروادیا تھا۔ تو صرف اس لیے کہ اُسے جواد خاقانی کی نفرتوں سے بچا سکے۔ فواد کے دل کو نفرت کا گھر بننے سے روک سکے..... اور وہ سکون سے پڑھ سکے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اسکول قریب ہی تھا۔ وہ روزانہ ہی اُس سے مل لیتی تھی۔ ورکنگ آورز میں دونوں ماں بیٹا اسکول کے لان میں بیٹھ کر خوب باتیں کرتے..... جواد کسی طوطے کی مانند اُسے اسکول کی ایک ایک بات بتاتا تھا۔ اور ماما پوری توجہ سے آنکھوں میں محبت کی چمک لیے اُس کی باتیں سنتی۔

اسکول میں اندرونِ شہر رہنے والے بچوں کو بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کی اجازت تو نہیں تھی کیونکہ بورڈنگ ہاؤس اُن بچوں کے لیے تھا جو شہر سے باہر دور دراز علاقوں سے آتے ہیں۔ لیکن ماما نے ایک بڑی ڈونیشن دے کر درخواست کی تھی کہ اُسے بورڈنگ ہاؤس میں جگہ دی جائے۔

جواد خاقانی حیران تھے۔ اس بار اُن کی لاڈلی بیٹی جینا نے اُس پرجوش انداز میں اُن کا استقبال نہیں کیا تھا جو ہمیشہ سے اُس کا معمول رہا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی اور افسردہ سی تھی۔ سوچوں میں گم تھی اور دل گرفتگی اُس کے چہرے سے ظاہر تھی حالانکہ اُسے مصنوعی بشاشت میں بدلنے کی اُس نے بڑی کوشش کی تھی۔ یہ تو انہیں یقین ہوگیا تھا کہ اُس

کے ساتھ کوئی گھمبیر مسئلہ ہے۔ لیکن کیا مسئلہ ہے..... وہ یہ کیسے جانتے ماہا کو جینا کے معاملات میں دخل اندازی کی انہوں نے کبھی اجازت نہیں دی تھی۔ پھر بھی وہ اُس سے پوچھنا چاہتے تھے کہ اُس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے..... لیکن وہ نیم غنودگی کی حالت میں تھی۔ اُس سے کیسے پوچھتے؟ اماں بری طرح بوکھلائی ہوئی تھیں۔ اس وقت بھی آنکھوں میں آنسو لیے وہ اُس کے پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھیں تھیں۔ نرس نے ٹمپریچر چیک کیا اور مایوسی سے سر ہلایا۔

''بخار ابھی کم نہیں ہوا..... میرا خیال ہے دوبارہ سر پر برف کی پٹیاں رکھنی ہوں گی میں انتظام کرتی ہوں۔'' وہ کمرے سے نکل گئی تو اماں نے دکھی نظروں سے ماہا کی طرف دیکھا۔ اچانک اُس کے لب پھڑپھڑائے..... وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی یہ پہلی بار تھا کہ اُس میں اتنی ہوش آئی تھی کہ کچھ کہہ سکے۔ بے ہوشی کی حالت میں ہی سہی..... نہ چاہتے ہوئے ہی سہی کہ وہ اپنی حالت سے بیگانہ تھی۔ اُس کے لب دوبارہ ہلے تو اماں نے جلدی سے اپنے کان اُس کے لبوں کے قریب کیے۔

''ج..... ج..... جینا..... یہ تم نے کیا کیا؟''

وہ پھر ہوش سے بیگانہ ہوگئی۔ اماں ساکت تھیں۔ آخر جینا نے کیا کیا..... لیکن ساتھ ہی پُر امید بھی تھیں کہ شاید وہ ہوش میں آ رہی ہو..... تبھی فواد اندر داخل ہوا اور ماں کے چہرے پر نظر ڈال کر افسردگی سے نظریں جھکالیں۔

''دادو..... ماما کو کوئی فرق پڑا؟''

''اِدھر آؤ..... میری جان اتنا غم نہ کرو.....''

انہوں نے بے اختیار اُسے سینے سے لگالیا۔

''ماما ٹھیک ہو جائیں گی..... بس کچھ دیر کی بات ہے..... میرا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ بس ہوش میں آنے والی ہیں..... شاید آج شام تک.....''

''سچ دادو.....'' اُس کی معصوم اور افسردہ آنکھیں ایکدم چمک اٹھیں۔

''ہاں..... دادو جھوٹ تھوڑی کہیں گی؟''

انہوں نے اُس کی پیشانی چوم لی..... مرجھایا چہرہ جیسے کھل اٹھا۔ نرس پیشانی پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ رہی تھی۔

''اِدھر آؤ میری جان.....'' انہوں نے فواد کا ہاتھ پکڑا اور ماہا کے ساتھ بٹھادیا۔

''اپنی ماما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لو..... اور اُن سے باتیں کرو..... مجھے پوری امید ہے تمہاری آواز سن کر وہ ہوش میں آجائیں گی..... وہ تم سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ تمہاری آواز سن کر خاموش رہ ہی نہیں سکتیں۔ آخر یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا.....'' اماں نے افسوس سے سوچا۔

ماہا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہی فواد کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت میں بہنے لگے۔ اُس نے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگالیا..... ماہا کا ہاتھ بھیگ گیا۔

''ماما..... ماما پلیز ہوش میں آئیں..... میں آپ کا بیٹا فواد ہاسٹل سے گھر آیا ہوں..... پلیز ماما..... مجھ سے بات کریں..... مجھ سے بات کرنے والا اور کوئی نہیں ہے اور..... اور میں آپ کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔''

ماہا نے بے چینی سے سر کو اِدھر سے اُدھر پٹخا..... کچھ بولنے کی کوشش کی..... لیکن کامیاب نہ ہوسکی۔

''ماما..... پلیز آنکھیں کھولیں..... میں فواد ہوں..... آپ کا بیٹا..... میں گھر آ گیا ہوں ماما..... مجھ سے بات کریں..... آنکھیں

کھولیں...... پلیز آنکھیں کھولیں...... پلیز مجھ سے بات کریں...... آئی لو یو ماما...... آئی لو یو ویری ویری مچ......'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا...... اماں نے اُسے سینے سے لگالیا۔

''مت رو میرے بچے...... تم فکر نہ کرو...... تمہاری ماما نے تمہاری آواز سن لی ہے...... جلد ہی وہ ہوش میں آجائیں گی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں نا دادو......؟'' اُس کی بھیگی آنکھوں میں اُس کے ہزاروں دیے جل رہے تھے۔ اماں نے ابھی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ جواد خاقان کمرے میں داخل ہوئے۔ فواد کی آنکھوں میں خوف کی لہریں نمودار ہوئیں اور وہ غیر محسوس انداز سے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ماہا کا چہرہ دیکھ کر جواد کے دل کو کچھ ہوا۔

محبت کا وہ ننھا سا پودا جو اتنے سالوں میں تناور درخت بن چکا تھا۔ اُس کا فیصلہ تھا کہ سب کچھ ماہا پر نچھاور کردے۔ لیکن انا کی اونچی دیوار جو وقت کے ساتھ ساتھ چھوٹی ہونے لگی تھی۔ آج سے دس برس پہلے گھر سے چلے جانے اور پھر واپسی پر فواد کو گود لینے کی وجہ سے دوبارہ اُسی بلندی پر جا پہنچی تھی اور پھر فواد کے ساتھ اُس کی والہانہ محبت اور بے لوث عشق اُن سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ وہ چاہتے تھے فواد پل بھر میں ہمیشہ کے لیے اُن کی نظروں کے سامنے سے غائب ہوجائے۔ اس گھر سے اس کا وجود مٹ جائے۔ لیکن جہاں وقت کے ساتھ ساتھ ماہا اور فواد کی آپس کی محبت میں اضافہ ہوتا رہا...... اُسی طرح جواد کے دل میں اُس لے پالک لڑکے کے لیے نفرت پیدا ہونے لگی۔

وہ اُس کو ایک نظر دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔

ماہا کو اُس میں گم دیکھ کر انہوں نے کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بہت سے ذاتی کام اُس کے حوالے کردیے تھے۔ وہ کام جن کو پہلے وہ اُسے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے تھے۔ انہوں نے تو یہ عمل بغض کی وجہ سے کیا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ تو ماہا کے لیے عین راحت ہے۔ وہ فواد کو دادی کی گود میں ڈال کر خوشی خوشی پورے دل کے ساتھ یہ کام انجام دیتی۔ جواد سے لاکھ اختلاف سہی اُن سے محبت تو بہرحال تھی اور یہ کام اُس کی محبت کے جذبے کو تسکین دیتے تھے یہ الگ بات ہے کہ اپنی عزتِ نفس پر کبھی آنچ نہیں آنے دی تھی۔ کبھی بھی جواد کے کسی عمل' اُن کی آنکھوں کے پیغام یا کسی اور عمل سے اُس کے جو چند جگنو اُس کی مٹھی میں آتے اُس کے لیے وہی کافی تھے۔ اور اب تو فواد نے اُس کی زندگی میں آکر ایسی روشنی بکھیری تھی کہ سارا اندھیرے اپنے اندر جذب کرلیے تھے فواد کو اُس نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ دل کے سارے جذبوں کی تسکین اُس کے وجود سے حاصل کی تھی۔ اپنی ساری محرومیوں کا ازالہ کیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر جینا سے چھینی ہوئی محبت بھی اُس کے وجود میں سمو دی تھی۔ وہ خوب سیراب ہوئی تھی۔ دل و دماغ کو انوکھی تسکین اور اطمینان ملا تھا۔

''ابھی تک ہوش نہیں آیا اُسے؟'' انہوں نے آہستہ سے نرس سے پوچھا۔

''نہیں سر...... لیکن جب سے وہ لڑکا گیا ہے...... آئی مین آپ کا بیٹا گیا ہے ان کی حالت میں خاطر خواہ امپروومنٹ ہوئی ہے۔ میرا تو خیال ہے آپ اپنے بیٹے کو بلالیں...... وہ یہاں بیٹھا رہے گا...... ان کا ہاتھ تھام کر باتیں کرے گا تو بہت جلدی ہوش میں آجائیں گی آپ کی

مسز......''
ناگواری سے جواد کے لب بھینچ گئے۔ لیکن اپنے تاثرات چھپانے کو انہوں نے رخ موڑ لیا اور بولے۔
''نرس کیا بہتر نہیں ہوگا کہ انہیں ہاسپٹل ایڈمٹ کر دیں۔''
''اب تو ان کی حالت کافی سنبھل گئی ہے...... آخری بار میں نے ٹمپریچر لیا تو وہ پہلے سے کافی کم تھا...... آج شام تک انتظار کریں...... یہاں جیسی کیئر ہو رہی ہے وہی کچھ ہاسپٹل میں ہوگا...... سب انتظام یہاں موجود ہے سر......''
''ٹھیک ہے آپ ذرا باہر جائیں...... مجھے اماں سے بات کرنی ہے۔''
''او کے سر......'' نرس باہر نکل گئی۔ تو جواد درشتگی سے اماں سے بولے۔
''اماں آخر ہوا کیا ہے...... آپ کچھ بتاتی کیوں نہیں...... اُدھر جینا بھی کھوئی کھوئی سی ہے...... آخر میری غیر موجودگی میں گھر میں کچھ تو ہوا ہے جو ماہا اور جینا کی یہ حالت ہے۔''
''تم مجھ سے ہزاروں بار یہ سوال پوچھ چکے ہو اور میں ہزاروں بار جواب دے چکی ہوں کہ میں نہیں جانتی...... تم اپنی اُس سر پھری بیٹی سے کیوں نہیں پوچھتے...... جسے ایک بار بھی توفیق نہیں ہوئی کہ ماں ایسی حالت میں ہے اُسے ایک نظر دیکھ ہی لے...... تم نے اور تمہارے انتقام نے آج یہ دن دکھایا ہے...... تمہارے سلوک نے اور تمہارا ماہا سے جینا کو دور رکھنا ہی یہ وقت لے کر آیا ہے۔''
اماں آبدیدہ ہو کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔ جواد کا سر جھکا تھا۔ انہوں نے پھر ایک نظر ماہا کی طرف دیکھا۔ اُس کے ملیح چہرے پر دکھ کی چھاپ اتنی گہری تھی کہ وہ پچھتاوؤں کا شکار ہونے لگے۔ تبھی اماں کی آواز آئی۔
''میں لاکھ انکار کروں...... قصور تو سارا میرا ہی ہے...... میں نے ہی اس بے جوڑ شادی کے لیے تمہیں مجبور کیا۔ ماں باپ بھی کیا دل رکھتے ہیں۔ اپنی خواہش اپنے ارمانوں کو اپنی اولادوں کے ذریعے پورا کرنا چاہتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اولادیں ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں۔ اُن کی سوچوں کا کوئی سرا بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتا...... بس اپنے بہن بھائیوں اپنے خونی رشتوں کو جڑا دیکھنے کے لیے اولادوں کے ارمانوں بھرے دل توڑ دیتے ہیں۔''
''بس کریں اماں......'' وہ دل گرفتہ ہو کر بولے......
''آپ بھی تو ہزاروں بار کہہ چکی ہیں ٹھیک ہے اُس وقت یہ جوڑ واقعی بے جوڑ تھا...... لیکن ماہا نے محنت کر کے خود کو جس مقام تک پہنچایا...... یہ جوڑ اب بے جوڑ نہیں رہا...... اگر ہے تو اب یہ میری طرف سے ہے میں میری شخصیت اور اُس کی خامیاں ماہا کے قابل نہیں ہیں۔ میری اَنا کا اتنا بڑا پہاڑ...... میری خود ستائشی کی اونچی دیواریں...... اور ماہا...... اور میں...... میں......''
وہ جذبات کی شدت سے کچھ نہ کہہ سکے اور تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔ اماں ہکا بکا حیران پریشان بیٹھی رہ گئیں۔ لیکن دل میں کہیں اطمینان اور سکون کی لہروں نے دھیرے بہت دھیرے سے سر اٹھایا۔

☆......☆......☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ دھیرے دھیرے بہت مشکل سے ماہا نے آنکھیں کھولیں۔

ستی ہوئی بے رونق آنکھیں..... زیرو پاور کے نیلے بلب کی روشنی پورے کمرے میں پھیلی تھی اور ہر سفید چیز پر نیلاہٹ چھوڑ رہی تھی چاہے وہ پردے ہوں یا کارپٹ..... کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے سامنے دیکھتی رہیں۔ انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا بس یوں ایک غیر مبہم سا احساس تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ لاشعور میں بے چینی اور بے کلی کا احساس تھا۔ سامنے کرسی پر سفید یونیفارم میں ملبوس نرس اونگھ رہی تھی۔ وہ بے پناہ کنفیوز ہوگئیں۔

''نرس.....؟ بھلا نرس یہاں کیا کر رہی ہے..... '' وہ حیران تھیں۔ دائیں جانب کسمساہٹ سی محسوس ہوئی تو بڑی مشکل سے سر کو حرکت دے کر اس جانب گھمایا۔

راکنگ چیئر پر گھٹنے پیٹ سے لگائے گول مول ہوکر کوئی سو رہا تھا۔ چہرہ دوسری جانب تھا لیکن وہ بغیر چہرہ دیکھے ہی جان سکتی تھیں کہ یہ کون ہے۔ دل بے اختیار محبت کے نرم گرم جذبات سے بھر گیا۔ دل چاہا اٹھیں اور اُسے گود میں اٹھا کر اپنے ساتھ ہی لٹا لیں' بے آرام ہو رہا ہوگا۔ لیکن وہ یہاں کیوں سو رہا تھا۔ اپنے کمرے میں کیوں نہیں تھا۔ فواد کا کمرہ اُن کے کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ بیچ میں چھوٹا دروازہ تھا۔ وہ اکثر رات کو اُس دروازے کے راستے اندر آتا اور ان سے لپٹ کر سو جاتا۔ وہ محبت سے مسکرائیں اور جذبات کی پوری گرمی دل میں محسوس کی۔

''لیکن نرس.....؟ نرس یہاں کیوں تھی؟ کیا فواد بیمار تھا۔ وہ بے چین ہوگئیں۔ نہیں اگر وہ بیمار ہوتا تو کرسی پر نہ ہوتا..... اپنے بستر پر ہوتا اپنے کمرے میں ہوتا۔'' انہوں نے اٹھنے کے لیے ہلنا چاہا تو نقاہت نے ایسا نہ کرنے دیا۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ بیمار وہ خود ہیں..... اور نرس اُن کے لیے ہے۔'' وہ حیران پریشان نرس کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک نظر پھر فواد کو دیکھا تو اچانک جینا کا خیال آگیا۔ اور جینا کا خیال آیا تھا یا قیامت..... اُن کے سوئے ذہن نے قیامت خیز انگڑائی لی..... قیامت..... قیامت۔

انہیں آہستہ آہستہ یاد آنے لگا۔ جینا تین مہینوں سے چپ چپ اور پریشان تھی۔ جواد ملک سے باہر تھے۔ اس بار اُن کا ٹور لمبا ہوگیا تھا۔ اس لیے اماں کا خیال تھا وہ باپ کی لمبی جدائی کی وجہ سے پریشان ہے۔ چپ چپ ہے لیکن ماما کی چھٹی حس لگاتار گھنٹیاں بجا رہی تھی۔ خطرے کی گھنٹیاں..... رانی کہتی تھی وہ کمرے میں بند پڑھتی رہتی ہے..... پھر امتحانوں کے دن آئے تو وہ روزانہ پیپر دینے بھی جاتی تھی۔ لیکن جلد ہی واپس آجاتی تھی دادو حیران ہوتیں تو رکھائی سے کہہ دیتی۔

دادو آپ کو پتہ ہے میں اتنی برائٹ نہیں ہوں..... جتنا آتا ہے لکھ کر آجاتی ہوں.....'' ماما یہ سب سن کر پریشان ہوتی۔ جواد نے تو اُس سے کتنی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ پھر امتحان بھی ختم ہوگئے۔ لیکن جینا کی روش نہ بدلی۔ اُس کی ہنسی تو جیسے اُس سے روٹھ ہی گئی تھی۔

کھانا کھانے بھی باہر نہ آتی۔ کمرے سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ ایک دو بار ماما نے اُس سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ بہت روڈ ہوگئی۔ اُس روز جانے کیوں ماما پچھلے دنوں سے کئی گنا زیادہ مضطرب تھی۔ کسی کل چین نہیں آرہا تھا۔ اسی وقت جینا کی بیسٹ فرینڈ آگئی۔ ماما اُس سے پتہ پوچھتے پوچھتے رک گئی۔ اگر جینا کو پتہ چلا تو بہت

برا مانے گی۔ اُسے فوراً اُس کے کمرے میں بھیج دیا۔ پھر خود بھی جا کر لیٹنے کا ارادہ کیا لیکن بے کلی اتنی زیادہ تھی کہ سوچا تھوڑی دیر لان میں ٹھنڈی ہوا میں چہل قدمی کرے۔ اور یہ چہل قدمی قیامت کا پیش خیمہ بن گئی۔ جینا کی کھڑکی سے آتی آوازیں بلند تھیں جیسے وہ اپنے حواسوں میں نہ ہو..... اور ان آوازوں نے جو اذیت ناک راز منکشف کیا اُس نے ماما کی ساری ہستی کو ہلا کر رکھ دیا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

ٹانگوں میں جان نہ رہی تو وہیں گھاس پر بیٹھ گئی۔ جینا کی فرینڈ چلی بھی گئی لیکن وہ وہاں سے ہل نہ سکی۔ وہ تو پودے کی آڑ میں تھی اس لیے جاتے جاتے اُسے دیکھ نہ سکی پھر جانے کیسے وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے میں آئی اور کس طرح بستر پر پہنچی۔ اُسے کچھ علم نہ تھا..... کیونکہ اُسے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔

آنسوؤں کا سیلاب تھا کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا..... پتہ نہیں وہ کب بے ہوش ہوئی..... کتنی دیر ہوش وخرد سے بیگانہ رہی۔

''اوہ جینا یہ تم نے کیا کر دیا..... تم نے..... تم نے اُس باپ کے بارے میں بھی نہ سوچا جو تم پر جان نچھاور کرتا ہے۔ اُس کی عزت کے بارے میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سوچا..... اوہ خدایا..... اب کیا ہوگا؟ اب..... اب تو دنیا کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے ہم..... اماں کو معلوم ہوتا تو کیا ہوگا اور جواد..... جواد کو معلوم ہوا تو.....؟

اور اس تو کے بارے میں سوچ کر ہی وہ کانپ گئی۔ خود کا دل ٹکڑے ہو جائے گا..... وہ دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے..... وہ بیٹی..... وہ لاڈلی نازوں سے پالی ہوئی بیٹی..... جس کی ذرا سی تکلیف پر وہ بے چین ہو جاتے تھے۔ اُسی بیٹی نے اُن کی عزت مٹی میں رول دی..... وہ کیسے برداشت کریں گے؟ کیسے سہہ سکیں گے؟''

''اور میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں ایسے نازک وقت میں انہیں تسلی بھی نہیں دے سکتی اب بھی شاید..... اس چیز کا قصوروار مجھے ہی گردانا جائے..... لیکن اس وقت یہ ایک چھوٹی بات تھی۔ اس سے کہیں زیادہ بڑی یہ بات تھی کہ خاندان کی عزت سٹیک پر تھی۔

''جواد..... اوہ جواد میں کیسے آپ کو سب کچھ بتاؤں گی..... میری زبان کیسے کھلے گی۔ میں آپ کو سر جھکاتے ہوئے کیسے دیکھوں گی؟'' اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ تڑپ تڑپ کر روئے۔ لیکن رات کی اس خاموشی میں اپنے کمرے میں موجود دو نفوس کی موجودگی میں وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

''پانی..... پانی.....'' وہ نقاہت زدہ آواز میں بولی تو نرس ہڑبڑا کر اٹھی اور جوس کا گلاس اُس کے لبوں سے لگا دیا۔

''خدا کا شکر ہے مسز جواد آپ ہوش میں آ گئیں..... آپ نہیں جانتیں سب آپ کے لیے پریشان تھے۔ اسپیشلی یہ بابا لوگ..... کیا نام ہے ہاں فواد بابا تو بہت پریشان تھے۔ جس دن چھٹیاں ہوئیں یہ ٹرپ پر دوستوں کے ساتھ چلے گئے تھے۔ ایک ہفتے بعد آئے تو آپ کو اس حالت میں دیکھا..... اماں اور مسٹر جواد بھی بہت پریشان ہیں۔''

''مسٹر جواد.....؟'' وہ حیرانی سے کمزور آواز میں بولی۔

''وہ واپس آ گئے؟''

''یس میم.....'' اماں نے اُسی روز انہیں خبر کر دی تھی۔ وہ نیکسٹ فلائٹ سے پہنچ گئے تھے۔ کتنے ڈاکٹرز کو دکھایا لیکن کسی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

کہ آپ کو کیا ہوا ہے...... سب کا خیال تھا آپ کو ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔''

نرس نے جوس پلا کر اُس کے تکیے سیدھے کیے...... چادر ٹھیک سے اس کے اوپر دی۔

''کیا آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟''

''یہ ڈرپ...... یہ اُتار سکتی ہیں آپ؟''

''نو نو......'' وہ جلدی سے بولی۔

''ابھی نہیں میم...... ابھی آپ بہت کمزور ہیں۔ چار دن بے ہوش رہی ہیں آپ...... ابھی ڈاکٹرز اس کے لیے تیار نہیں ہو سکتے...... ابھی آپ آرام سے سو جائیں۔ آپ کا بخار اتر گیا۔ آپ کی بے ہوشی ختم ہوگئی۔ یہ خوش آئند بات ہے...... تھوڑی دیر بعد آپ جاگیں گی تو آپ کو سوپ دیا جائے گا۔ اور کچھ دوائیں بھی...... اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں اور سو جائیں۔''

''لیکن نرس...... میرا بیٹا...... بہت بے آرامی سے سو رہا ہے۔ اس طرح مجھے نیند نہیں آئے گی۔''

''آپ فکر نہ کریں مسز جواد اگر آپ کہیں تو میں بابا کو اُس کے بیڈ پر لٹا آؤں؟''

''یہ بہت اچھی بات ہوگی...... تھینک یو نرس......''

''نو پرابلم......''

جب تک نرس اُسے کمرے میں لٹا کر آئی ماہا دوبارہ نیند کی وادیوں میں پہنچ چکی تھی۔ لیکن اس کا چہرہ چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا کہ وہ بہت بے چین اور بے سکون ہے۔

☆......☆......☆

صبح اٹھنے کے احساس کے ساتھ ہی اذیت ناک حقیقت نے دل اور دماغ کو پوری قوت سے ہٹ کیا۔ دل میں درد کا ایک طوفان تھا جس میں اُس کا کمزور وجود ہچکولے کھا رہا تھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا وہ اس طوفان میں بہہ جائے گی۔ بند آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر گالوں کو بھگونے لگے۔

کاش جواد نے جینا کو مجھ سے یوں دور نہ رکھا ہوتا...... اُس کی تربیت میں کچھ تو میرا ہاتھ ہوتا...... جواد کی بے رخی کے باوجود اُس نے کتنی دفعہ اُس کی منتیں کی تھیں کہ خدارا اُسے اتنی آزادی نہ دیں۔ لڑکوں کے ساتھ اُس کے میل جول اور دوستیوں پر پابندی لگائیں۔ رات کو دیر تک اکیلے گھر سے باہر نہ رہنے دیں۔ لیکن جواب میں جواد ناگواری سے اُسے پینڈو اور بیک ورڈ ہونے کا طعنہ دیتے۔

''تم کتنا بھی پڑھ لکھ جاؤ...... تمہارا دل اور دماغ گاؤں کی اُس سیلن زدہ کوٹھری سے نہیں نکل سکتا۔ اور میں تمہیں کتنی بار سمجھاؤں کہ جینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے اُس کی اچھائی اور برائی کے بارے میں سوچنے کی تمہیں قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اُسے اس دنیا کی روشن خیال لڑکی بنانا چاہتا ہوں۔ زمانے اور وقت کی ضرورت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے والی...... عورت ہو یا مرد ہر کسی کی کمپنی میں خود اعتمادی سے بات کرنے والی...... اپنے فیصلے خود لینے والی...... تمہارے جیسی عورت نہیں بننا اُسے۔''

''تو کرلیا نا اُس نے خود ہی اپنا فیصلہ...... لیکن تم کبھی اس فیصلے سے خوش نہیں ہوسکو گے تمہارا چین اور قرار لٹ جائے گا۔ تمہاری عزت تار تار ہو جائے گی۔ اب اُس زمانے کو کیا منہ دکھاؤ گے جس کے قدم کے ساتھ قدم ملانے کی تمہیں ہمیشہ حسرت رہی ہے۔''

درد اتنا بڑا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اُسے خبر نہیں تھی کہ کمرے میں کوئی موجود ہے ورنہ شاید وہ خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتی۔

''کیا ہوا میم......؟ نرس فوراً بیڈ کے پاس آئی۔

''کہیں درد ہو رہا ہے کہیں کوئی تکلیف تو نہیں؟'' اُس کے آنسو وہیں رُک گئے۔ ساتھ ہی کرسی پر بیٹھی اماں نے اٹھ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پیشانی چوم لی۔

''خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میری بچی کو ہوش آ گیا... تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا اور فواد اتنا پریشان اور خاموش ہے۔ جب سے آیا ہے تمہارا ساتھ نہیں چھوڑا اُس نے' کھانے پینے تک کا ہوش نہیں اُس کو......''

ماہا بے قرار ہو کر اٹھنے لگی۔ لیکن نقاہت نے کوشش ناکام بنا دی۔

''کہاں ہے وہ؟ اماں اُسے میرے پاس لائیں... میں اُسے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''بیٹا ابھی تو سو رہا ہے......اُسے بے آرام نہ کرو۔'' اماں پیار سے بولیں۔

''میم رات فواد بابا ادھر ہی تو تھے......اس کرسی پر وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئے۔ آپ کو یاد نہیں آپ کو ہوش آیا تھا تو آپ کے اس طرح بیٹھے بیٹھے سونے پر پریشان ہوگئی تھیں پھر آپ کے کہنے سے میں اُسے اُٹھا کر اُس کے بیڈ پر لٹا کر آئی تھی۔''

ماہا نے پُرتشکر نظروں سے نرس کی طرف دیکھا۔

''میں ابھی آپ کا منہ ہاتھ دھلوا کر آپ کے لیے ناشتہ لاتی ہوں۔''

''تم منہ ہاتھ دھلواؤ......میں خانساماں سے کہتی ہوں ناشتہ تیار کرے......کیا دنیا ہے اسے؟'' اماں اٹھ کر باہر جانے لگیں۔

''میں نے اُسے ہدایات دے دی تھیں آپ بس اُسے کہیں کہ تیار کر کے لے آئے۔'' تھوڑی دیر بعد ہی ناشتے کی ٹرے پہنچ گئی۔ سوپ اور دلیہ تھا۔

نرس نے ڈھیروں تکیے رکھ کر بیٹھنے میں اُس کی مدد کی......اور پھر چمچ سے سوپ اُس کے منہ میں ڈالنے لگی۔

''نرس تم بیڈ ٹرے میں میرے سامنے رکھ دو......میں خود ہی پیوں گی۔''

''بہت مشکل ہوگا میم......آپ کو اپنی کمزوری کا اندازہ نہیں......آپ خود سے نہیں پی سکیں گی۔'' ماہا کو اندازہ تھا وہ سچ کہہ رہی ہے۔

''سوپ تو ٹھیک ہے نرس......لیکن میں دلیہ نہیں کھاؤں گی۔''

''دلیہ آپ کے لیے بہت ضروری ہے میم......اگر نہیں کھائیں گی تو طاقت کیسے آئے گی......کیا آپ کا لمبا پروگرام ہے بستر پر لیٹے رہنے کا؟'' وہ مسکرائی۔

''نہیں نرس......مجھے جلد از جلد اس کمرے سے نکلنا ہے۔''

''پھر میں جو کہوں گی اُس پر عمل کرنا پڑے گا۔ میں جو کھانے کو دوں گی کھانا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے......'' وہ بہت دھیمی آواز میں بولی۔ آنکھوں کے سامنے پھر وہی سفاک حقیقت ناگ کی طرح پھن پھیلائے آ کھڑی ہوئی تو آنکھیں بھیگ گئیں۔

''ابھی تو اُس نے دلیہ ختم کیا تھا کہ فواد آنکھیں ملتا دروازے سے نمودار ہوا۔ اُسے یوں بیٹھا دیکھ کر خوشی سے بھاگتا ہوا آیا اور اُس سے لپٹ گیا۔ ماہا نے محبت کی تمام تر گرمی کے ساتھ

اُسے بانہوں میں بھر کر سینے سے لگالیا..... اور بے تحاشا اُس کے بالوں کو چومنے لگی۔

''اوہ ماما..... آپ کو ہوش آ گیا..... میں اتنا پریشان تھا' اتنا اُداس تھا۔ آپ کیوں بیمار ہوگئی تھیں۔ آپ جانتی ہیں میں کتنا اکیلا تھا' کتنا اداس تھا؟'' وہ آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

''نہیں..... میری جان..... رونا نہیں..... تم جانتے ہو میں سب کچھ برداشت کرسکتی ہوں..... لیکن تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی۔ اب تو میں ٹھیک ہوگئی ہوں..... اب ہم دونوں ڈھیروں باتیں کریں گے۔ خوب مزے کریں گے ٹھیک؟'' ماما نے اُس کے گال پر پیار کیا۔

''ٹھیک..... لیکن مجھ سے وعدہ کریں اب آپ بیمار نہیں ہوں گی۔''

سینے سے نکلنے والی بے اختیار آہ اُس نے سینے میں ہی دبالی..... پھر وہی اذیت ناک خیال کہ وہ کیوں بیمار پڑی تھی پوری سفاکی سے دل و دماغ پر چھا گیا۔ آنسو بے تاب تھے آنکھوں سے بہنے کو لیکن اپنے پیارے بیٹے کی خاطر انہیں دل پر گرالیا آنکھوں میں نہیں آنے دیا۔

''ماما وعدہ کریں نا.....'' فواد نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ اُس کے سامنے پھیلا دیا تو اُس کے روشن مسکراتے چہرے کو دیکھتے ہوئے ماما نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اب آپ جلدی سے ٹھیک ہوجائیں..... آئی مین خوب کھائیں پئیں..... تاکہ آپ کی صحت اچھی ہوجائے..... ان چھٹیوں میں بہت سے کام کرنے ہیں.....''

''ہاں.....'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''ان چھٹیوں میں بہت سے کام کرنے ہیں۔'' ہر بات اور ہر سوچ کی تان جینا پر آ کر ٹوٹتی تھی اور دل بیٹھ جاتا تھا۔

تبھی دروازے پر ہلکی دستک کے ساتھ کوئی اندر آ گیا۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' بھاری آواز پر ماہا نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ اور حیران رہ گئی۔ جواد سلیپنگ سوٹ پر گاؤن پہنے کھڑے تھے۔ کتنے ہی لمحے ماہا اُن کی طرف خالی نظروں سے دیکھتی رہی' پھر اچانک ہی اُس کا رنگ اُڑ گیا۔

''آپ؟ آپ کب آئے؟'' ماہا نے فواد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جو بہت غیر محسوس طریقے سے دھیرے دھیرے اپنے کمرے کی طرف جارہا تھا اور پھر جواد کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر وہ غرور اور تکبر نہیں تھا۔ آواز میں وہ تلخی اور دبدبہ بھی نہیں تھا جو ماہا سے بات کرتے خود بخود اُن کے لہجے میں پیدا ہوجاتا تھا۔

''دو دن ہوگئے.....'' وہ آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

''آتے ہی اک شاک سا لگا آخر تمہیں کیا ہوا ہے..... اتنے دن بے ہوش کیوں رہیں..... اتنا تیز بخار کیوں تھا..... ڈاکٹر کہہ رہا تھا..... کسی ذہنی صدمے کا نتیجہ ہے..... کیا میں پوچھ سکتا ہوں تمہیں کیا صدمہ پہنچا ہے؟''

انہوں نے بہت غور سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بے اختیار ہی ماہا کی آنکھیں جھک گئیں۔

''کیا آپ کو اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟''

''شاید.....'' وہ ابھی تک پُرسوچ نظروں سے اُس کے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ جیسے اُس میں کچھ پڑھنے کی کوشش کررہے ہوں۔ ماہا کو اُن نظروں سے بے چینی ہورہی تھی۔ تبھی انہیں

کمرے میں نرس کی موجودگی کا احساس ہوا۔
''نرس ماہا کے لیے گرم دودھ بھجوادو......اور لاؤنج میں انتظار کرو۔''
''یس سر...'' نرس مودب انداز میں سر کو خم دے کر چلی گئی اور ماہا کو یوں لگا اُس کی روح اس دنیا سے پرواز کر جائے گی۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ جواد نے اُس کا بازو تھام لیا۔
''پلیز ریلیکس... ڈونٹ تھنک اینی تھنگ... میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا... اور ...اور...'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔
''ابھی میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔''
ماہا نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ بہت نرمی سے بول رہے تھے۔ اچانک ہی اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔
کیا یہ نرمی... یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے... اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں... پھر بھی دو آنسو دھوکہ دے کر گالوں پر لڑھک آئے اور وہ اُس وقت حیرت سے تقریباً بے ہوش ہونے والی تھی جب جواد کی انگلیوں کی پوروں نے دونوں آنسو اپنی ہتھیلی پر لے لیے۔
''کمزور اور بے بس عورت...'' کیا کمزور اور بے بس عورت ہی جواد کی کمزوری کا باعث ہے۔ ان کو اپنی مردانگی کا احساس دلاتی ہے۔ تحفظ فراہم کرنے کی خواہش اجاگر کرتی ہے۔
''جینا بھی چپ چپ اور خاموش ہے... کھوئی کھوئی سی ہے۔ جیسے اندر ہی اندر اُسے کوئی غم کھائے جا رہا ہو۔ میرے آنے پر بھی ویسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ جو ہمیشہ کرتی تھی۔ شاید اب وہ بڑی ہوگئی ہے۔ یا اُس کے ساتھ کوئی حادثہ ہوگیا ہے... کیا تمہیں معلوم ہے اُسے کیا غم ہے؟'' ماہا نے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''کیا آپ نے مجھے اُس کے اتنے قریب جانے دیا ہے... کیا آپ نے ہم دونوں میں نفرت کے علاوہ کوئی اور رشتہ قائم ہونے دیا ہے جو آج میں جان سکوں کہ اُسے کیا غم ہے؟'' جواد نے مضطرب ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔
''سارا قصور میرا ہی سہی... لیکن کیا تمہیں کسی بات کا علم ہے...؟''
''جواد مجھے دیکھتے ہی یا تو وہ منہ پھیر لیتی ہے... یا خود کو ایک خاص خول میں سمیٹ لیتی ہے۔ میری کوئی بات سننا اُسے پسند نہیں... میری کسی بات کا جواب دینا اُسے پسند نہیں۔ میرا سمجھانا، نصیحت کرنا اُسے پسند نہیں... وہ میری اولاد کہاں ہے... میں نے تو اُسے صرف جنم دیا ہے۔ اُس کی ماں نہیں ہوں میں... اُس کی ماں اور باپ دونوں آپ ہیں۔ اُس کے بارے میں مجھ سے بہتر آپ جان سکتے ہیں۔''
ماہا نے سب کچھ کہہ تو دیا۔ لیکن جواد سے آنکھ ملا کر بات نہیں کی۔ جواد بے چین اور بے قرار ہو کر اٹھے۔ چند منٹ کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہلتے رہے۔ اس دوران ماہا کے چہرے پر بھی ایک نظر ڈال دیتے۔ اُن کے دیکھتے ہی وہ نظر چرا لیتی... پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئے اور ماہا ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆......☆......☆

ایک ہفتہ گزرا تو ماہا کی صحت میں نمایاں فرق آیا۔ نرس کو فارغ کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ہر دوسرے روز آتے اور اُس کا معائنہ کر کے اپنی تسلی کا اظہار کرتے... کھانے پینے کا چارج اماں نے سنبھال لیا تھا۔ وہ خاص طور پر اُس کے لیے ایسی چیزیں تیار کرواتی تھیں۔ جن میں غذائیت بھی ہو اور وہ صحت بخش بھی ہوں۔

اس سارے عرصے میں وہ اُس کا گہری نظر سے جائزہ بھی لے رہی تھیں۔ اُس کی حالت دیکھتے ہی انہوں نے اور اُن کی جہاندیدہ نظروں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کوئی بہت ہی گھمبیر بات ہے۔ جس نے ماہا کو اس قدر دل گرفتہ اور غم سے نڈھال کر دیا تھا اور انہیں یہ اندازہ بھی تھا کہ اس بات کا تعلق جینا سے ہے۔ نیم بیہوشی اور غنودگی میں ماہا کے لبوں سے جو لفظ نکلے تھے۔ اُن کا دل بھی اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ لیکن انہوں نے اُس سے ایک لفظ نہیں پوچھا۔ اُس کی صحت یابی کے عمل میں وہ رخنہ نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ جب وہ صحت مند ہو جائے گی۔ اور غم کو تھوڑا سنبھالا ملے گا تو وہ خود ہی بتا دے گی۔

جواد خاقانی کے رویے میں بھی وہ نمایاں تبدیلی دیکھ رہی تھیں۔ اب وہ ماہا سے خواہ مخواہ جھگڑے کی راہیں نہیں تلاش کرتے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے انہیں دیکھ کر شعلے یا چنگاریاں نہیں نکلتی تھیں۔ روزانہ ایک بار تو اُس کا حال پوچھنے اُس کے کمرے میں ضرور جاتے تھے۔ اور اماں محسوس کر رہی تھیں کہ وہ خاموش بیٹھے جانے کیا سوچا کرتے۔ لمبی راہداریوں میں بے قراری سے ٹہلتے اور مضطرب انداز میں اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے۔

جینا نے تو جیسے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ کھانا کھانے بھی باہر نہ آتی خوراک بہت کم ہوگئی تھی۔ باپ کے آنے کے بعد جیسے تتلی بن کر اُن کے گرد منڈلاتی تھی۔ وہ بھی ختم ہو گیا تھا اور شاید جواد کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ یہی بات تھی۔ وہ بیٹی جس کو انہوں نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ جس کی محبت انہوں نے اُس کی ماں سے بھی شیئر نہیں کی تھی۔ وہ مسلسل انہیں نظر انداز کیے ہوئے تھی۔ اُن سے بچتی پھر رہی تھی۔ اُن کا سامنا کرنے سے کتراتی تھی اور اگر سامنا ہوتا تو نظریں چرا لیتی رنگ زرد پڑ جاتا۔

اماں کی راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ اس گھر میں کچھ غلط تھا بہت غلط...... لیکن سب اپنے اپنے خول میں سمٹے ہوئے تھے۔ کوئی کسی سے بات کرنے یا معاملے کو ڈسکس کرنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ بات چیت سے معاملے کو ڈسکس کرنے یا سلجھانے کا طریقہ ہی اس گھر میں رائج نہیں تھا۔ آج تک سب اپنی اپنی زندگی جی رہے تھے۔

آج ماہا کچھ زیادہ ہی بے چین تھی۔ وقت آ گیا تھا کہ وہ جینا سے اس مسئلے پر بات کرتیں...... اُس سے جواب طلب کرتیں۔ اب وہ خاموش نہیں رہ سکتی تھیں۔ ساری زندگی جواد کے آگے ہار مان کر انہیں کیا مل گیا تھا۔ عمر بھر کی رسوائی، بیٹی کی خود سری اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ سامنے آ گیا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد اماں اُس کے پاس ضرور بیٹھتی تھیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُس کا دل بہلاتیں۔ ساتھ فواد بھی شامل ہو جاتا...... اُس کی پیاری اور معصوم باتوں سے دل کو سکون ملتا...... لیکن آج کھانے کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئیں۔

''بیٹا...... ماما کو آج بہت سخت نیند آ رہی ہے...... آپ بھی اپنے کمرے میں جا کر یا تو کوئی بک پڑھ لیں یا پھر ٹی وی پر کوئی کارٹون مووی آ رہی ہو تو دیکھ لیں۔'' فواد مایوس نظر آ رہا تھا۔

''میرا دل تو چاہ رہا تھا آپ سے باتیں کروں...... لیکن آپ کو نیند آ رہی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔'' ماہا نے اُسے پیشانی چوم کر گڈ نائٹ کہا اور وہ اپنے کمرے میں چلا گیا...... ماہا نے

معذرت خواہانہ نظروں سے اماں کی طرف دیکھا۔
''میں بھی سوچ رہی ہوں آج جلدی نماز پڑھ کر لیٹ جاؤں...... مجھے بھی آج نیند زیادہ آرہی ہے کہیں خانساماں نے آج کھانے میں افیم تو نہیں ملا دی۔'' وہ اٹھیں اور اُسے پیار کر کے باہر نکل گئیں جاتے ہوئے لائٹ بند کرنا نہیں بھولیں۔
ماہا نے آدھے گھنٹے تک انتظار کیا اور جب اماں کے کمرے کی لائٹ بھی آف ہوئی تو فواد کے کمرے میں جھانکا۔ وہ بیڈ پر لیٹا کتاب ہاتھ میں لیے سو رہا تھا۔ ماہا نے کمبل ٹھیک سے اوڑھایا اور لائٹ آف کر کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اُس کا رخ جینا کے کمرے کی طرف تھا۔ ہیجان اور فکر میں اُسے یہ اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ کوئی سایہ دھیرے دھیرے اُس کے پیچھے آرہا ہے۔
ہلکی سی دستک پر کافی دیر بعد جینا نے دروازہ کھولا...... لیکن ماہا کو دیکھ کر جلدی سے بند کرنا چاہا...... لیکن ماہا کو اُس سے یہی توقع تھی۔ اور وہ اس کے لیے تیار بھی تھی۔ زبردستی دروازے کو پرے دھکیل کر اندر داخل ہوئی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ ماہا کمرے کے وسط میں پہنچ گئی تو پہلے تو جینا نے حیرانی سے اُس جرأت کو دیکھا پھر تیز قدموں سے چلتی عین اُس کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔
''کس کی اجازت سے آئی ہیں آپ؟ پلیز فوراً چلی جائیں ورنہ......'' ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ ماہا کا ہاتھ اٹھا اور پوری قوت سے جینا کے دائیں گال پر نشان چھوڑ گیا۔ چند لمحے تو وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ماہا کی طرف دیکھتی رہی پھر زخمی شیرنی کی طرح غرائی۔
''آپ کو جرأت کیسے ہوئی مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی...... میں ڈیڈی سے......'' وہ پھر بات پوری نہ کر سکی ماہا کا دوسرا زبردست تھپڑ اُس کے دوسرے گال پر پڑا۔
''جن بیٹیوں کے کرتوت تمہارے جیسے ہوں...... انہیں اس طرح کی گفتگو کرنے سے پہلے سو بار سوچ لینا چاہیے۔''
''ک...... کیا مطلب؟'' وہ پہلی بار تھوڑی خوف زدہ ہوئی۔
''مطلب بھی مجھ سے پوچھو گی...... اور ڈیڈی کو یہ بتاؤ گی......'' ماہا پورے جلال سے بولی۔
''یہی کہ میں آپ کی عزت کا جنازہ نکال کے آئی ہوں...... اپنا منہ کالا کرنے کی تیاری کر لیں...... اسی دن کے لیے تمہارے باپ نے تم سے دیوانوں کی طرح محبت کی تھی۔ تمہاری ہر جائز ناجائز خواہش کو پورا کیا۔ تاکہ تم اُن کی آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے پوری دنیا کے سامنے جھکا دو۔ وہ کسی کے سامنے اپنا سر نہ اٹھا سکیں۔ بولو...... جواب دو...... کیوں کیا تم نے ایسا...... کیوں کیا؟'' ماہا کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ پہلی بار جینا کی نظریں جھک گئیں۔ وہ اُس عورت سے نظر نہ ملا سکی جسے بھی رتی برابر اہمیت نہ دی تھی۔ اُس کا اڑا ہوا رنگ ماہا کے دل پر تیر برسا رہا تھا۔ یا خدا یہ دن بھی آنا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
''جس دن سے تمہارے ڈیڈی آئے ہیں...... تمہارے گریز کی وجہ سے پریشان ہیں۔ تم سمجھ سکتی ہو اُن کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی...... اور تم اتنی احسان فراموش ہو کہ دکھاوے کی خاطر ہی اُن کا دل رکھنے کو اُن سے دو باتیں نہیں کر سکیں...... کیا تمہیں اُن پر ذرا سا ترس بھی نہیں آیا...... یا پھر تم خود ترسی کا شکار ہو اور تمہیں کسی اور

کے غم اور کنسرن سے کوئی سروکار نہیں...... تم واقعی جواد کی بیٹی ہو...... خود غرض اور خود پرست...... اپنے سوا تمہیں کسی کا احساس نہیں ہے...... اور اب جس صورت حال میں تم نے خود کو ڈال لیا ہے اُس سے نکلنے کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟''

اُس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

''کون ہے وہ...... جس کا دیا ہو بوجھ تمہیں اکیلے اٹھانا پڑ رہا ہے؟''

جینا نے ہراساں نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میں کچھ پوچھ رہی ہوں تم سے؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''نام کیا ہے اُس کا؟ کہاں رہتا ہے؟ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟'' ماہا نے ایک ساتھ سارے سوال کر دیے۔

''میں کچھ نہیں جانتی...... مجھے اُس کا نام نہیں معلوم...... لوگ اُسے ہینڈسم کہہ کر بلاتے ہیں...... اور وہ کہاں رہتا ہے کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے...... میں نے کبھی پوچھا ہی نہیں اُس سے...... جینا اچانک کارپٹ پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماہا حیران نظروں سے اُسے دیکھ کر رہ گئی۔

''تم اُس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں...... اور اتنی دور تک کیسے نکل گئیں؟''

''میں کچھ نہیں جانتی......'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میں نے اُس سے بے پناہ محبت کی ہے...... اب بھی کرتی ہوں۔'' اُس کی ہچکیاں ماہا کا دل چیر رہی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

''تو اس کا مطلب ہے...... تمہارا مستقبل غیر یقینی ہے...... جب تمہیں اس کے باپ کے بارے میں کچھ علم نہیں تو کل ہی میرے ساتھ جا کر اس جھنجھٹ سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔'' ماہا نے یہ کہہ کر غور سے اُسے دیکھا۔

''نہیں......'' وہ ایکدم خوفزدہ ہو گئی۔

''نہیں میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں ہرگز ایسا نہیں کروں گی۔ آپ جو بھی کہیں...... ڈیڈی جو بھی کہیں...... دنیا کچھ بھی سوچے میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں یہ قتل نہیں کروں گی۔''

ماہا کچھ کہنے ہی والی تھی کہ باہر زور سے کچھ گرنے کی آواز آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کسی انہونی کے خوف سے ماہا نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور بے اختیار چیخ اٹھی۔

''اماں...... اماں...... اور خدایا...... اماں آخر یہاں کیا کر رہی تھیں۔ اماں...... اماں......''

اُس نے اماں کے چہرے کو اِدھر اُدھر ہلایا۔ لیکن وہ بے ہوش تھیں۔ ماہا نے گھبراہٹ میں ملازمین کو آوازیں دیں۔ لیکن سب اس وقت اپنے کوارٹرز میں تھے۔ وہ جواد کے کمرے کی طرف بھاگی۔ اور زور زور سے دروازہ بجایا...... دروازہ کھل گیا۔ لیکن جواد کمرے میں نہیں تھے۔ اُس نے جلدی سے ہاسپٹل میں ایمبولینس کے لیے فون کیا۔ تبھی جواد بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اُن کا چہرہ بے رنگ ہو رہا تھا جیسے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو...... ماہا کا دل دہل گیا۔

''آ...... آپ کہاں تھے؟'' انہوں نے بڑی عجیب زخمی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میں باہر لان میں چہل قدمی کر رہا تھا۔'' وہ بمشکل بول سکے۔ تو وہ سب سن چکے ہیں۔

''اماں...... اماں کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں نے ہاسپٹل فون کر دیا ہے...... ایمبولینس آتی

ہی ہو گی۔‘‘

جواد اماں کے قریب دوزانو بیٹھ گئے۔ جینا دروازے کے پاس حیران پریشان کھڑی تھی۔ جواد نے نظر اٹھا کر اُس کی طرف نہ دیکھا۔ لیکن اُن کے چہرے پر پھیلے کرب اور اذیت سے ماہا اور جینا دونوں سمجھ چکی تھیں کہ وہ سب سن چکے ہیں۔

☆......☆......☆

اماں نے رات کی تاریکی اور خاموشی میں جینا کے کمرے سے آتی آوازوں سے جو کچھ اخذ کیا...... اُس سے پچھلے دنوں کی ٹینشن...... ماہا کی بیماری...... جینا کا بدلا انداز اور جواد کی اضطرابی کیفیت سب سمجھ میں آ گئی۔ لیکن اس عمر میں سہہ نہ سکیں۔

اُن کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ماہا آج ضرور جینا کے کمرے میں جائے گی۔ جس انداز میں جلدی سونے کا بہانہ بنایا۔ فواد کو اور انہیں کمرے سے بھیجا...... اُس سے ہی انہیں شک ہوا تھا۔ تبھی انہوں نے اُس کا پیچھا کیا۔ لیکن اُن کے کانوں میں جو پگھلا ہوا سیسہ جینا نے انڈیلا وہ اُسے برداشت نہ کر سکیں۔ انہیں دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اور اس وقت موت وحیات کی کشمکش میں تھیں جبکہ ماہا' جینا اور جواد کوریڈور میں تین مختلف بینچوں پر بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

ماہا خود کو قصور وار سمجھ رہی تھی۔ اگر وہ جینا سے گفتگو کرنے نہ آتی تو اماں نہ سنتیں اور انہیں اتنا دکھ نہ ہوتا جو ہارٹ اٹیک کا موجب بنتا۔

جینا خود کو قصور وار سمجھ رہی تھی۔ اگر اُس نے خود کو اس گورکھ دھندے میں نہ الجھایا ہوتا کہ جس سے سب کے سر شرم سے جھک گئے ہیں تو دادو کو ہارٹ اٹیک نہ ہوتا۔

جواد خود کو قصور وار سمجھ رہے تھے کہ اگر انہوں نے جینا کو بے جا آزادی نہ دی ہوتی ماہا سے دور نہ رکھا ہوتا۔ اُس وقت اُس کی باتیں سنجیدگی سے سنی ہوتیں جب وہ منتیں کرتی تھی کہ جینا کو اتنی آزادی نہ دیں۔ بلا جھجک لڑکوں سے میل جول اور دوستیوں پر پابندی لگائیں۔ رات کو اتنی دیر اکیلے گھر سے باہر نہ رہنے دیں۔ تو شاید...... شاید آج یہ سب نہ دیکھنا پڑتا۔ لیکن اُن کی یہ 'انا' یہ ضد اور ماہا سے انتقام لینے کی شدید خواہش نے انہیں اندھا کر دیا تھا۔

آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ بھلا کبھی بچے کو بھی ماں سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ ماں اور بچے کا رشتہ تو فطرت کے عین مطابق ہے۔ ماں کی گود تو بچے کی پہلی درسگاہ ہے۔ تربیت کی وہ بھٹی ہے جہاں سے سونا کندن بن کر نکلتا ہے۔ شخصیت کو نکھار دیتا ہے۔ برائیوں کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے اور اچھائیوں کو اجاگر کرتا ہے۔ خدا نے ماں کے قدموں کے نیچے جنت رکھی ہے۔ اور میں نے اپنی عزیز ترین شے کو اس جنت سے محروم رکھا صرف اور صرف اپنی ضد کی وجہ سے...... اپنی نام نہاد انا کی وجہ سے اور آج......

اُن کے دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی۔ آج تینوں الگ الگ بینچوں میں بیٹھے تھے تینوں ایک فیملی تھے۔ لیکن تینوں میں سے کسی میں ہمت نہیں تھی کہ ایک دوسرے کو تسلی دے سکیں۔ تینوں ہی ایک دوسرے کا دکھ بانٹنے سے قاصر تھے۔ دکھ جو ایک ہی تھا۔ درد جو ایک ہی تھا۔ آج تینوں ایک دوسرے سے کتنے دور تھے۔

وہ کبھی ایک فیملی تو بنے ہی نہیں تھے۔ تھوڑی دیر بعد اُن کا ملازم فواد کو لے کر آ گیا۔ فواد سہمی نظروں سے جواد کی طرف دیکھتا ہوا ماہا کے پاس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بیٹھ گیا۔ ماہا نے اُس کے گرد بازو لپیٹ کر اُسے خود سے قریب کرلیا۔ جینا نے یہ منظر دیکھا آج پہلی بار دل میں ہوک سی اٹھی۔ ماں اور بچے کے پیار کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ ورنہ پہلے وہ جب بھی ماہا کو فواد سے پیار کرتے دیکھتی اُسے ماہا کے ساتھ ساتھ فواد سے بھی نفرت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن آج وہ سوچ رہی تھی شاید اس پیار سے دوری نے اُس کی زندگی میں ایسا خلا پیدا کردیا تھا۔ جیسے اُس کا لاشعور تو محسوس کرتا تھا لیکن شعوری طور پر وہ ہمیشہ اُس سے انکاری رہی تھی۔

''ماما دادو ٹھیک ہو جائیں گی نا؟'' فواد نے معصومیت سے اُسے دیکھا۔

''دعا کرو بیٹا...... دعا میں بڑی طاقت ہے۔''

آج پہلی بار فواد کے دادو کہنے پر اسے غصہ نہیں آیا...... ورنہ پہلے تو اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔

''مت کہو انہیں دادو...... وہ تمہاری دادو نہیں ہیں۔''

''کیوں میری دادو کیوں نہیں ہیں؟'' وہ معصومیت سے پوچھتا۔

''بس نہیں ہیں...... اس لیے کہ ایڈاپٹڈ ہو۔''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''تمہارا سر ہوتا ہے......'' وہ چڑ کر بولتی۔

''بس تم انہیں دادو مت کہا کرو۔''

''پھر کیا کہوں؟'' وہ معصومیت سے بولا۔

''ماما نے تو کہا تھا وہ میری دادو ہیں۔''

جینا غصے میں کہنے لگی تھی کہ وہ تمہاری ماما بھی نہیں ہیں۔ وہ صرف میری ممی ہیں۔'' پھر حیرت سے گنگ رہ گئی۔ آج پہلی بار اُس نے ایسا سوچا تھا۔ تو کیا وہ ننھے فواد سے جیلس ہے۔ ہاں یہ تو صحیح تھا کہ اُسے ماما کا فواد سے یوں والہانہ پیار اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ اُسے سینے سے لگا تیں۔

تو اُس کے دل کو کچھ ہوتا تھا۔ کوئی احساس محرومی تھا جو سر اٹھانے کی کوشش کرتا' لیکن وہ پوری قوت سے اُس احساس کو دبا دیتی۔ اُسے بھلا ممی کی کیا ضرورت ہے۔ اُس کے پاس ڈیڈی ہیں نا...... صرف اُس کے ڈیڈی ہیں وہ۔ اُس پر جان چھڑکتے ہیں۔

اُس سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ اُسے اور کوئی نہیں چاہیے...... کیا ہوا جو ممی فواد سے والہانہ پیار کرتی ہیں۔ فواد کے پاس بھی تو ڈیڈی کا پیار نہیں ہے نا اُسے تو اتنا بھی نہیں پتہ اُس کا باپ کون ہے۔ ایسی ہی باتوں سے وہ خود کو تسلی دے لیا کرتی تھی۔ اور پھر سب کچھ بھول کر اپنی زندگی میں مگن ہو جاتی۔ ماہا نے ملازم کو کینٹین سے تین کپ چائے لانے کے لیے کہا۔ وہ لے آیا تو وہ خود ہی ایک کپ جواد کے پاس لے آئی۔

''پلیز چائے پی لیں جواد...... آپ کو اس کی سخت ضرورت ہے۔'' وہ بے حد نرمی اور لجاجت سے بولی تو جواد نے ایک نظر اُس کی طرف دیکھ کر کپ لے لیا...... پھر وہ جینا کی طرف بڑھی......

جینا نے ایک نظر ماہا کی طرف دیکھا اور منہ پھیرلیا۔

''چائے پی لو بیٹا...... تم نے کافی دیر سے کچھ کھایا بھی نہیں...... اگر تم کہو تو کینٹین سے کچھ منگوا دوں...... ایسی حالت میں......'' وہ ایکدم چپ ہوگئی۔ جیسے اگلے الفاظ بولنے کی ہمت نہ ہو...... اور تیزی سے واپس پلٹی۔

''ممی......'' چلتے چلتے اُس کے قدم جیسے زمین میں جم گئے۔ آج زندگی میں پہلی بار...... پہلی بار اُس کے منہ سے اپنے لیے یہ کانوں میں

ہر گھونٹ نے وہ... لفظ سنا تھا۔ لیکن تقدیر کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اسپتال کے کوریڈور میں اس نازک اور گھمبیر صورت حال میں وہ خوشی کی خبر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بھیگی آنکھوں سے مڑ کر اس کے قریب گئی۔

"مجھے بھوک تو نہیں ہے... لیکن میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔" وہ جھجک کر بولی۔

"میں تمہارے لیے جوس اور سینڈوچ منگوا دیتی ہوں۔" وہ سنجیدہ چہرے لیے مڑیں۔ ملازم کو آرڈر دیا اور پھر فواد کے پاس بیٹھ کر اسے خود سے قریب کر لیا۔ جینا نے بوجھل دل کے ساتھ یہ سب دیکھا اور بے اختیار منہ موڑ لیا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ تبھی ملازم جوس اور سینڈوچ لے کے دے گیا۔ وہ آہستہ آہستہ سینڈوچ کترنے لگی۔ جوس پینے سے دل کو قرار آیا۔ طاقت سی محسوس ہوئی۔ سینڈوچ ختم ہوتے تو اس کی پُرسوچ نظریں ایک بار پھر ماہا کی طرف اٹھیں ماہا فواد کے گال اور پیشانی پر بوسہ دے رہی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس منظر کو دیکھے گئی۔

تبھی ایک ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے باہر آیا۔ تینوں ہی اس کی طرف بڑھے۔

"مریضہ کی حالت بڑی مشکل سے ذرا کنٹرول میں آئی ہے۔ لیکن ابھی خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آگئی ہیں۔ آپ باری باری انہیں اندر جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن زیادہ بات نہیں کرنی۔ وہ بولنے سے گریز کریں تو اچھا ہے۔"

"آپ پہلے ہو آئیں۔" ماہا نے جواد سے کہا۔ تو وہ دھیرے دھیرے اندر گئے۔

انہیں اس حالت میں دیکھ کر دل کو کچھ ہوا لیکن ایک لفظ نہ کہہ سکے۔ یوں بھی اماں کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر ہی باہر آگئے۔

"جینا... بیٹا تم جانا چاہتی ہو۔" جینا کی نظریں جھک گئیں۔ وہ اپنا وجود لیے کر داور کے سامنے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"نہیں... میں باہر سے ہی دیکھ لوں گی۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

"چلو ٹھیک ہے... فواد بیٹا تم بھی باہر سے ہی دیکھ لینا... میں اندر جاتی ہوں۔"

اماں کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ اسٹول پر بیٹھ کر اس نے دھیرے سے اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اماں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا دو آنسو ڈھلک کر آنکھوں سے نکلے۔

"اماں حوصلہ کریں... آپ تو بہت مضبوط ہیں... میرا حوصلہ... میری طاقت ہیں... آج تک میں آپ کی وجہ سے تو زندہ ہوں... آپ نے مجھے جینا سکھایا۔ حالات کا مقابلہ کرنا سکھایا۔ برے حالات میں بھی ہمت نہ ہارنا سکھایا۔ اب آپ ہمت نہ ہاریں۔ زندگی میں چھاؤں کے ساتھ دھوپ بھی آتی ہے... اور اس کڑی دھوپ میں آپ کو میں ایک ایسی بات بتانا چاہتی ہوں... جو آپ کے لیے بے انتہا خوشی کا باعث ہوگی اور شاید اسی خبر سے آپ خود میں حوصلہ پیدا کریں اور جلد سے جلد تندرست ہو کر گھر واپس لوٹیں۔"

اماں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ اٹھی اور اماں کے کان کے پاس منہ لا کر دھیرے دھیرے کچھ کہنے لگی۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوئی۔ اماں کی آنکھوں میں مسرت کی روشن کرن چمکی۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ماہا نے لبوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

(جاری ہے)

جون 2017

افسانہ

ماہین حسن

دھوپ چھاؤں سی زندگی

''بابا آج آپ ماما کو بتا دیں گے ناں اس بڑے سرپرائز کا جو انہیں دینے والے ہیں۔ بلکہ شاہ ویز بھیا بھی یونیورسٹی سے آگئے ہیں۔ بس کیک کاٹتے ہیں اور آپ ماما کو بہانے سے لے کر ... آئیں۔'' ... بے حد خوشی تھی۔ ...

''نہیں سرمد ابھی اور گھومیں گے اور خریداری کریں گے اور پھر آپ مجھے باہر کھانا بھی کھلائیں گے اور جی ہاں آئس کریم بھی ......اوکے......''
''اوکے جناب بالکل آپ کے حکم کی تعمیل''

ہو گی۔'' سرمد نے ہنستے ہوئے کہا۔
''کشف او کشف......!'' ماں کی آواز پر کشف کی آنکھ کھلی جو چند لمحے پہلے محوِ خواب تھی اور اپنے شوہر سرمد کے ساتھ وہ حسین وقت گزار رہی تھی جو حقیقت میں ناممکنات میں سے تھا۔
ہڑبڑا کر اماں کے پاس گئی۔
''جی اماں میں بس سب کام کر کے نہا کر لیٹی تو......''
''ارے ہاں یہی تو چونچلے ہوتے ہیں نئی نویلیوں کے...... ہونہہ جہاں وقت ملا آرام کرنے کو چلیں۔'' شکیلہ بیگم جو سرمد کی اماں تھیں اور کشف کی ساس چند ہفتوں کی بہو کو اکثر ایسے جملوں اور باتوں سے نوازتیں کشف نے ان چند دنوں میں گھر کو سنبھال لیا اور دل و جان سے ان کی خدمت میں لگ گئی اور یہاں تھا کون ابا کشف کے سسر رفیق صاحب جو سال بھر پہلے سیدھے ہاتھ اور پاؤں میں فالج ہونے کے باعث بستر پر تھے۔ اُس کی ساس شکیلہ بیگم' سرمد اور ایک چھوٹی نند جو شادی کر کے چار مہینے پہلے شوہر کے ساتھ دوسرے شہر جا بسی۔ سرمد ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھا۔
محنتی تھا اور اچھا کما بھی لیتا تھا جس کے باعث شکیلہ بیگم نے اُس کی منگنی دو سال پہلے جاننے والوں میں کر دی تھی۔ مگر چند دن بعد ہی پتہ لگا کچھ اور جاننے والوں سے لڑکی یہ شادی نہیں کرنا چاہتی کہیں اور انٹرسٹڈ ہے جس وہاں سے رشتہ ختم تو سرمد میاں کا دل بہت خراب ہوا کیونکہ وہ کسی حد تک منگنی سے خوش تھے مگر اُس کے بعد سے کافی تلخ مزاج ہو گئے اور بڑی مشکل سے کشف کے رشتے پر راضی ہوئے۔ اور کشف گھومنا پھرنا چاہتی تھی جیسا کہ ہر لڑکی شادی کے شروع میں چاہتی ہے رشتوں کو سمجھنا چاہتی ہے۔ سرمد کے ساتھ اچھا وقت گزارنا چاہتی اور جب سرمد سے تھوڑا شرم و لحاظ میں بولتی تو اُن کا ٹکا سا جواب ہوتا۔
''سرمد میں نے سب کچھ کر لیا ابا کا پرہیزی کھانا بھی بنا لیا ہے اور سب کام بھی، آپ آ گئے امی بابا سے مل کر آ جائیں شادی کے بعد بس ایک ہی دن گئی تھی اب مہینہ ہونے والا ہے۔ بہت دل چاہ رہا ہے۔''
''کوئی ضرورت نہیں ہے فی الحال تم اس گھر کو سمجھو اور وقت دو اور یہ مجھے ہر دو دن بعد میکے جانے کی گردان پسند نہیں۔'' سرمد بولا۔
اور کشف سرمد کی شکل ہی دیکھتی رہی کہ اُس نے تو بس بولا گردان اور ضد تو نہیں کی آخر اُس کا میکہ ہے ماں باپ ہیں اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سرمد نے دیکھا اور سرسری لہجے میں کہا۔
''ٹھیک ہے دیکھیں گے کسی دن۔''
ابا میاں بھی اکثر بیگم سے اور بیٹے کو بھی بولتے۔
''نیک بخت دونوں بچوں کو گھومنے پھرنے بھیجا کرو رشتے داروں سے ملا لاؤ یہی دن ہیں پھر تو زندگی پڑی ہے ذمہ داری اٹھانے اور کام کرنے کے لیے۔''
''اے لو جی میں کہاں روکتی ہوں بہو کی مرضی ہے اور سرمد چاہے ہم ہیں کتنے لوگ ذرا سا جاتے ہیں دونوں تو گھر عجیب لگنے لگتا ہے سامعہ بھی لاہور چلی گئی میری بچی۔'' شکیلہ بیگم بولیں۔
''تو بیگم یہی تو بول رہا ہوں مت اُلجھا' بچی کو فوراً کاموں میں شوہر کے ساتھ آئے جائے گی گھر میں اپنے شوق سے کام کرے گی محبت سے رہو۔''

''ہونہہ! ساری بات میں کروں میں سوچوں ارے سب بیاہی لڑکیوں کے بھی فرائض ہوتے ہیں کچھ۔'' اور رفیق صاحب سر پکڑ کر رہ گئے کہ ان سے بحث بیکار ہے۔

کشف ایک دن روٹیاں بناتے ہوئے ریڈیو سن رہی تھی جو اُس کا شادی سے پہلے بھی پڑھائی کے علاوہ ایک شوق تھا سرمد کمرے سے نکلے اور حیران ہوئے۔

''کشف یہ کیا روٹیاں بنا رہی ہو یا بزم طلبہ سن رہی ہو؟''

''ارے سرمد آپ! بس روٹیاں لا رہی ہوں اور ساتھ ریڈیو پر اپنا پسندیدہ پروگرام سن رہی تھی آپ بھی.....''

''ارے یار بس بھی کرو تم گھر کے کام کاج کرو گی یہ عجیب فضول شوق پورے کرو گی بند کرو اس ڈبے کو اور پلیز جلدی بنالاؤ روٹیاں آدمی تھکا ہارا آئے تو کھانے کے انتظار میں رہے۔'' غصے سے بولتے ہوئے کمرے میں چلے گئے کشف کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ وقت یاد آیا جب وہ اور بابا جان گھنٹوں باتیں کرتے اور وہ بولتی۔

''بہت سارا پڑھوں گی ابھی گریجویشن میں ہوں ماسٹرز پھر پی ایچ ڈی بھی کروں گی اور اچھی جاب کر کے اماں اور آپ کو پوری دنیا گھماؤں گی۔'' اور بابا خوب ہنستے کہتے۔

''بھئی میری بیٹی کے بہت سارے خواب ہیں میرا بچہ اللہ تمہارے خوابوں کی تکمیل کرے آمین۔''

دن یونہی بے کیف سے گزر رہے تھے کہ سامعہ چلی آئی کراچی ڈلیوری کے لیے اس پر بھی اکثر اماں کشف اور سرمد کو دیکھ کر بولتیں۔

''آہ پتہ نہیں میرے سرمد یہ خوشی کب آئے گی ایک ہی بیٹا ہے میرا۔'' کشف دل پر جبر کر کے سنتی اور بس دعا کرتی کہ اللہ اُس پر بھی اپنا کرم کرے اور ماتھے پر بل لائے بغیر نند کے سب کام کرتی چھٹی سوا مہینہ تقریباً دو ماہ بعد سامعہ بچے سمیت گھر واپس گئی۔ بابا جان اور اماں سے بھی بہت کم ملنے جانا ہوتا کشف جاتی اور آجاتی سرمد جاتے بھی تو سب سے لیے دیے رہتے۔ کچھ عرصے بعد واقعی اللہ نے کشف کی سن لی اور دو صحت مند جڑواں بیٹوں سے نوازا سب بے حد خوش تھے سرمد سمیت اماں نے بھی پہلی بار کشف کو پیار کیا دعا دی صدقہ خیرات دی بابا جان' اماں اور دونوں بھائی بھی بچوں کو دیکھنے آئے مگر بچوں کی پیدائش سے پہلے وہ اماں کے ہاں نہیں گئی مگر اب بابا جان نے بولا تو دو ہفتے اماں کے ہاں گزار کے آئی واپسی میں سرمد کا موڈ حسبِ معمول خراب تھا۔ بہرحال اماں ابا بے حد خوش تھے پوتوں سے عطرش اور شاہ ویز میں سب کی جان تھی سرمد بھلے کشف سے سرد رویہ روا رکھتے مگر اپنے بچوں کے لیے اچھے باپ ثابت ہوئے دنیا جہاں کی چیزیں ڈھیر کر دیتے پھر ماہ و سال گزرے ابا گزر گئے کشف اُن کے جانے سے اُداس تھی کیونکہ سسرال میں ابا صحیح معنوں میں چھاؤں کی حیثیت رکھتے تھے پھر چار سال بعد ایشل کشف کی گود میں آ گئی اماں بھی اب بیمار رہنے لگیں کشف اُن کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑتی اماں اکثر اُس کا ہاتھ پکڑ کر روتیں دعا دیتیں۔

بچے اسکول میں تھے کہ اچانک بابا جان کی طبیعت خرابی کا فون آیا اور کشف کو بھائی نے اسپتال آنے کا کہا بتایا کہ بابا رات سے اسپتال میں ایڈمٹ ہیں وینٹی لیٹر پر ہیں بس آجاؤ۔'' کشف نے سرمد کو فون کیا اور ساری صورتحال بتائی۔ سرمد نے لاپرواہی

کی انتہا کرتے ہوئے کہا۔ ارے بھئی شام میں چلے جائیں گے ابھی بچے بھی آنے والے ہیں اماں نے بھی خلافِ توقع سرمد کو جلدی آنے کا کہا مگر وہ سرمد ہی تھے کہ جن پر کشف کی بات کا اثر ہو وہ اکیلے نکلنے والی تھی کہ چھوٹا بھائی اثیر جو جاب کے سلسلے میں حیدر آباد میں تھا کشف کو لینے آ گیا بھائی جان اسپتال میں اُس کے ساتھ تھے ورنہ وہ کشف کو لینے پہلے ہی آ جاتے ایثر نے آتے ہی بچوں اور کشف کو ساتھ لیا اور اسپتال پہنچ گیا اور جیسے ہی یہ لوگ اسپتال پہنچے تو کشف کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ اُس کے پیارے بابا جان اُس کا انتظار کرتے کرتے چلے گئے تھے کشف ایسے روئی کہ اسپتال کا عملہ اور موجود لوگ بھی افسوس سے دیکھ رہے تھے۔

شام میں سرمد اماں کے ساتھ تدفین سے پہلے آ گئے تھے کشف نے سرمد کے آتے ہی اُٹھ کر غصے میں اُن کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

''آپ کی وجہ سے آخری وقت میں اپنے باپ کے پاس نہ آ سکی کیوں کہ ظالم آدمی ہیں آپ بابا جان مجھے بلاتے رہے مگر آپ کو تو اپنی انا عزیز ہے معاف نہیں کروں گی۔'' اور روتے ہوئے نڈھال ہوگئی۔ سرمد تو مانو جھینپتے ہوئے چپ اور شاید شرمندہ تھے بہرحال وقت کا کام گزرنا ہے سو گزرتا گیا اب کشف نے اپنی زندگی گھر کی ذمہ داری اور اپنے تینوں بچوں تک محدود کر لی تاکہ بچوں کو کسی اچھے مقام پر دیکھ سکے زندگی کے اور رنگ رعنائیاں شریکِ حیات کے ساتھ بچوں کے ساتھ اپنی خوشی اور مرضی سے زندگی گزارنے کی خواہش کہیں پیچھے رہ گئی۔

بڑا بیٹا ایرو ناٹیکل انجینئر بن کر ایک سال پہلے لندن چلا گیا دوسرا میڈیکل کے آخری سال میں تھا جبکہ بیٹی فرسٹ ایئر میں آ گئی حالات بھی بدل گئے اور سرمد کا مزاج بھی بچوں کے لیے تو پُرشفیق باپ تھے ہی مگر اب کشف سے بھی اچھے اور نرم طریقے سے بات کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر کشف نے اپنے اوپر اب سنجیدگی خول چڑھا لیا تھا اور اس بات کو بچے بھی محسوس کرتے تھے اور آج سرمد اور کشف کی شادی کی سالگرہ تھی پچیسویں اور ان کے بچے' سمرہ اور شاہ ویز دونوں پلان بنائے بیٹھے تھے کسی سرپرائز کا بڑے بیٹے عطرش کا بھی فون آیا حتی کہ سرمد پُرجوش نظر آ رہے تھے مگر ظاہر نہیں کر پا رہے تھے کشف محسوس کر رہی تھی مگر یہ سب اُس کے لیے بیکار تھا سمرہ باپ سے بولی۔

''بابا آج آپ ماما کو بتا دیں گے ناں اُس بڑے سرپرائز کا جو انہیں دینے والے ہیں۔ بلکہ شاہ ویز بھیا بھی یونیورسٹی سے آ گئے ہیں۔ بس کیک کاٹتے ہیں اور آپ ماما کو بہانے سے لے کر باہر لان میں لے آئیں۔'' سمرہ بے حد خوش تھی۔ بہرحال سرمد کشف کو کمرے سے بلانے گئے اور لان میں آ گئے جہاں دونوں بچے پہلے سے کیک دوسرے لوازمات اور تحائف کے ساتھ تیار بیٹھے تھے کہ کشف بھی لان میں آ گئی اور حیرانی سے دیکھنے لگی کیونکہ ہر سال یہ دن گزر جاتا تھا ایسے ہی مگر جب سرمد نے کشف کا ہاتھ پکڑ کر کیک کاٹنا چاہا تو وہ ہکا بکا حیران سی انہیں دیکھنے لگی اور ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہوگئی۔

''سمرہ شاہ ویز! کیا ہے یہ سب؟'' وہ غصے سے بولی۔ تو دونوں گھبرا گئے۔

''اس سب کی کوئی ضرورت نہیں ان چیزوں کا کوئی شوق نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیے مجھے اب کیوں؟'' اور روتے ہوئے کمرے میں چلی گئی سب پریشان اور سرمد افسردہ اور شرمندہ ہو گئے کچھ دیر بعد کشف کے پاس کمرے میں گئے جہاں وہ دبی آواز

خاموش احتجاج

مجھے برمنگھم شہر کے فٹ پاتھ پر کھڑی اس بزرگ گوری نے احتجاج کا ایک نیا طریقہ سکھا دیا۔ میں نے سوچا، کاش ہم لوگ اس عورت کی پیروی کریں۔ ہم آج سے انفرادی سطح پر یہ فیصلہ کرلیں، ہم جب بھی کسی ظلم، کسی زیادتی سے متاثر ہوں گے جب بھی ہمارا دل ٹوٹے گا تو ہم ایک پلے کارڈ لیں گے اس پر ''مجھے یہ فیصلہ منظور نہیں۔'' یا ''میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔'' یا ''یہ زیادتی بند کریں۔'' جیسے الفاظ لکھیں گے اور ایک آدھ گھنٹے کے لیے باہر فٹ پاتھ پر کھڑے ہوجائیں گے ہم منہ سے کچھ نہیں بولیں گے، کوئی نعرہ نہیں لگائیں گے، کوئی گالی نہیں دیں گے ہم کوئی پتھر نہیں پھینکیں گے اور ہم کسی کو دھمکی نہیں دیں گے بس ایک آدھا گھنٹہ پلے کارڈ تھامے رکھیں گے اور واپس چلے جائیں گے۔ مجھے یقین ہے ہمارا یہ خاموش احتجاج ظلم کی بنیادیں تک ہلا دے گا۔ یقین کیجیے، جو کام دس لاکھ بد دعائیں مل کر نہیں کرسکتیں، وہ کام ایک پلے کارڈ ایک گھنٹے میں سرانجام دے دیتا ہے۔

جاوید چوہدری کی کتاب ''زیرو پوائنٹ 3'' سے افشاں چوہدری۔U.K کا منتخب کردہ ایک اقتباس

رو رہی تھی سرمد آہستگی سے بیٹھے اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر بولنے لگے۔

''کشف میں کن الفاظ میں معافی مانگوں کیا بولوں جن خوشی کے لمحات اور وقت کی تم حقدار تھیں اس وقت پر میں نے اپنی انا اور زعم میں تمہیں دباتے ہوئے اپنی مرضی چلائی تمہاری بے ضرر خواہشات کا گلا گھونٹا اور اس محبت کے رشتے کو سمجھتے سمجھتے اتنے سال لگا دیے اور اب جب دل میں ان چیزوں کا احساس ہونے لگا تو تم دور ہوگئیں مجھ ناچیز خودغرض انا پرست کو معاف کردو ماما میں ایک قدر کرنے والا شوہر ثابت نہ ہوسکا مگر اس کا احساس اور شدید ہوا جب ہماری سمرہ نے یہ دوری محسوس کی اور بولی۔

''بابا ماما کے ایسے رویے کے ذمہ دار بہت حد تک آپ ہیں اگر آپ ماما کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو سمجھتے تو ایسا نہ ہوتا اور اگر ایسا کوئی میرے ساتھ Rude Behaviour جیسا اکثر ماما کے ساتھ آپ کر جاتے تھے ہوتا تو آپ کو کیسا لگے گا؟''

''بس کشف اُس دن اور بھی زیادہ شدت سے احساس ہوا۔''

سرمد کی آنکھوں میں آنسو تھے جو شدید شرمندگی اور ندامت کے تھے۔ کشف یہ دیکھ کر گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔

''پلیز سرمد ایسے مت کریں مجھے اندازہ ہے کہ آپ کو اب احساس ہوگیا ہے۔''

''تو بس تم اب تیاری کرلو ہم انشاءاللہ ایک ہفتے بعد بچوں کے ساتھ عمرے کی ادائیگی کے لیے جارہے ہیں اور عطرش بھی وہیں آرہا ہے اور اُس کے بعد جب تک زندگی ہے ہر لمحہ اُن گزرے دنوں کا ازالہ کروں گا جس سے میری کشف ہمیشہ خوش رہے آمین۔ دونوں نے ساتھ کہا اور مسکرا دیے۔

☆☆......☆☆

قسمت مہربان ہوگئی

''آپ کی سب باتیں ٹھیک امی جان! سب شکوے سرآنکھوں پر مگر اس بار مجھے صرف چھ ماہ کا وقت دیں بس۔ یقین کریں اس کے بعد آپ جو اور جیسے کہیں گی وہ ویسے کروں گا۔ میں کل سے ہی ساتھ والے امین صاحب سے بات کرتا ہوں وہ اپنی ملازمہ کو......

چائے پینے سے درد سے پھٹتے دماغ کو کچھ سکون ملا تھا اس نے ادھورا کام مکمل کرنے کی ٹھانی اس سے پہلے کہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوتی شاہ میر کاغذات کے پلندے کے ہمراہ اس کے کیبن میں داخل ہوا۔

''یہ لیں میڈم! پچھلے سال کے اکاؤنٹس کی وہ تمام تفصیلات جو آڈٹ کے لیے درکار تھیں اور جن کے بارے میں سوچ سوچ کر آپ کے سر میں درد شروع ہوگیا تھا۔ اب لگے ہاتھوں یہ جا کر سر کو پکڑاؤ اور ہاف لیو لے کر گھر جاؤ اس سے پہلے کہ وہ تمہارے لیے کوئی اور کام نکال بیٹھیں۔''

بعض اوقات آپ کے دل میں دوسروں کے لیے جو جذبات واحساسات ہوتے ہیں۔ آپ اس کو کوئی نام نہیں دے سکتے اور نہ ہی زبان..... اس پل رامین کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ اس سے لاکھ دامن بچانے کی کوشش کرتی تھی بہت دفعہ بے رخی سے بھی کام لے جاتی اور بے نیاز تو شروع سے تھی ہی' مگر اس کا ہر قسم کا رویہ شاہ میر کو اس کا خیال رکھنے سے نہ روک سکا تھا نہ ہی اسے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں جو چمک ابھرتی تھی وہ کبھی ماند پڑی تھی۔ اور جب جب ایسا ہوتا کوئی ملال رامین کے اندر جاگ جاتے اور وہ اپنا سارا غصہ شاہ میر پر انڈیل دیتی مگر کمال شخص تھا وہ بھی' اس کے ہر رویے کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا مسکرا دیتا۔

''شکریہ شاہ میر صاحب! خواہ مخواہ تکلیف کی آپ نے، میں کر لیتی خود ہی۔'' دل میں اگرچہ اس کے لیے شکر گزاری کے جذبات پیدا ہوئے تھے مگر اس نے ان پر قابو پاتے خاصے روکھے لہجے میں کہا۔ جواب میں شاہ میر کی بے ساختہ مسکراہٹ اُس کو مزید غصہ دلا گئی۔

''لطیفہ نہیں سنایا میں نے آپ کو.....'' وہ چڑ کر بولی۔

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے لیکن میرا مشورہ اب بھی یہی ہے کہ لیو لے کر گھر چلی جائیں۔'' اُس کا موڈ دیکھ کر وہ ہاتھ اُٹھا کر بولا اور کیبن سے باہر نکل گیا۔

رامین نے کاغذات اپنی طرف کھسکائے۔ یقیناً اس کا' میں اُس کا بہت وقت صرف ہوا تھا کیونکہ پورے سال کا ریکارڈ نکالنا اور جمع تفریق کرنا خاصی عرق ریزی کا کام تھا۔ آج بینک پہنچتے ہی اسے یہ کام ملا ہوا تھا مگر رات کی بے آرامی سر درد کی صورت سامنے آئی اور اُسے کنپٹیاں دباتے دیکھ کر اپنے کیبن کی طرف جاتا شاہ میر واپس پلٹ آیا تھا۔ پھر اس نے مختصراً ہی اپنے سر درد کا بتایا تھا اور خود کو مصروف ظاہر کرتے ہوئے کمپیوٹر آن کر کے اس پر نظریں جمالی تھیں۔ دس منٹ بعد پیون چائے اور دو سر درد کی ٹیبلیٹس دے کے گیا تھا جو کہ شاہ میر نے بھجوائی تھیں اور اب ڈیڑھ گھنٹہ بعد وہ اس کے کام کو مکمل کر کے پھر حاضر ہوا تھا۔ اس نجی بینک میں وہ آپریشن منیجر کی پوسٹ پر جبکہ شاہ میر برانچ منیجر کی پوسٹ پر تعینات تھا۔ چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں ہی اس نے شاہ میر کا اپنے لیے ایک الگ انداز محسوس کیا تھا مگر اچھی فطرت' عادات اور خاندان کے حوالے سے کسی بھی قسم کی کمی نہ پا کر بھی وہ اُس کی پذیرائی کرنے سے قاصر تھی۔ اگرچہ شاہ میر نے کبھی زبان سے کچھ بھی نہیں کہا تھا مگر جذبوں کی ایک اپنی زبان ہوتی ہے جو بے حد طاقتور ہوتی ہے اور عورت چاہے کسی بھی خطے' عمر یا نسل کی ہو مرد کی آنکھوں کی زبان کو سب سے پہلے پڑھتی ہے۔ ہاف لیو لے کر گھر آنے پر اُسے اپنے کمرے میں بچوں کا ایک طوفان بدتمیزی ملا تھا۔ ڈانٹ کر اُن کو کمرے سے باہر بھگایا اور دروازہ بند کر کے جو سوئی تو شام کی خبر لائی تھی۔

☆......☆......☆

سیٹی پر شوخ دھن بجاتا وہ اندر داخل ہوا تھا۔ آپی کے دونوں ولی عہد شاہ ماموں آ گئے کا نعرہ لگائے اس سے چمٹ گئے۔ وہ بھی دونوں کے پیار کا بھرپور جواب دیتے آپی اور امی کی طرف آ گیا۔ معمول کی علیک سلیک کے بعد امی کا اشارہ پاتے ہی آپی نے اس کی کلاس لینا شروع کی۔

''بس بہت ہو گیا شاہ! بہت ٹائم دے دیا تمہیں' اب میں نے اپنی کرنی ہے۔ غضب خدا کا! امی کی حالت دیکھو۔ جوڑوں کے درد نے کہیں کا نہیں رکھا۔ ویسے تو کوشش کرتی ہوں ہفتے کے تین چار سالن بنا کر فریز کرتی جاؤں۔ مگر پچھلے ہفتے میری اپنی ساس بیمار تھیں۔ بہت کوشش کے باوجود یہاں نہیں آ سکی میں۔ دل امی کی طرف ہی اٹکا رہا اور دیکھ لو بازاری کھانے کھا کھا کے کیا حالت ہو گئی ہے اُن کی...... تمہیں تو خیال ہی نہیں ہے بس میں آج ہی لڑکی دیکھنے کا سلسلہ شروع کر رہی ہوں۔ دو ماہ کے اندر اندر مجھے تمہاری شادی کرنی ہے۔'' بولتے بولتے آپی کا سانس پھول گیا تھا۔

''باپ رے...... تمہاری ماما تو سخت غصے میں ہیں یار......'' سر کھجاتے اُس نے بھانجے کو کہا۔

''مذاق میں مت ٹالو بات کو شاہ...... ابھی بھی کوئی لڑکی پسند ہے تو بتا دو نہیں تو لڑکیاں میری نگاہ میں ہیں دو تین...... انہی میں سے کسی کو فائنل کرتی ہوں میں۔ کیونکہ گھر گھر جا کر لڑکی دیکھنے کے نام پر بچیوں کی تذلیل مجھے پسند نہیں ہے۔ جو پسند کروں گی لڑکی بس ایک دفعہ جا کے بات پکی کر کے آؤں گی دوسرے تمہارے اس آئیڈیل کے چکر میں میں نے مزید نہ تو تمہاری باتوں میں آنا ہے نہ اور وقت ضائع کرنا ہے بس......'' شاہ میر نے بے بسی سے آپی کا قطعی انداز اور امی کا بھی تائیدی انداز دیکھا۔ ان دونوں کے انداز صاف صاف کہہ رہے تھے کہ وہ بخشنے کے موڈ میں نہیں

ہیں۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنی اُلجھن آپی اور امی سے بیان کرنے کا فیصلہ کیا مبادا وہ دونوں بیچ میں ہی کسی سے اس کی بات پکی کر کے آ جائیں۔

''ایک لڑکی ہے تو سہی آپی...... بہت اچھی ہے۔ مجھے بہت پسند بھی ہے۔ میرے ساتھ آفس میں کام کرتی ہے۔''

''ہاں تو پھر ٹھیک ہے...... مجھے ایڈریس دو اُس کا...... میں آج ہی جاتی ہوں اس کے گھر...... میرے ہیرا سے بھائی کے لیے بھلا کون انکار کرسکتا ہے۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' آپی خاصے پُر جوش انداز میں بولیں۔

''اوہو بات تو سن لیں پوری۔'' وہ جھنجلایا۔

''کتنے دن تو میں نے یہ سوچنے میں گزار دیے کہ یہ وقتی پسندیدگی تو نہیں ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی عادات، شخصیت اور کردار نے مجھے مزید متاثر کیا اور جب میں آپ سے بات کر کے گرین سگنل دینا ہی چاہتا تھا کہ یہی ہے وہ لڑکی پھر سوچا...... پہلے اُس کی رائے تو پتہ کر لی جائے۔ وہ مجھے پسند ہے تو ضروری نہیں ہے کہ میں بھی اُسے پسند ہوں۔''

''اُس کا جواب ضرور ہاں میں ہوگا' بلکہ وہ تو خوش ہوگئی ہوگی۔ میرے ہیرے جیسے بھائی کو بھلا کوئی لڑکی انکار کرسکتی ہے۔'' آپی کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی اب کے نگہت بیگم نے انہیں ٹوک دیا۔

''صبا تم چپ کرو اور اس کو اپنی بات مکمل کرنے دو۔''

''اس کو میں پسند ہوں یا نہیں آپی...... یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ پہلے تو وہ بگڑ گئی کہ وہ جاب کرنے نکلی ہے اپنے لیے رشتے تلاش کرنے نہیں۔ شاید کوئی فلرٹ قسم کا نوجوان سمجھی تھی مجھے...... مگر دو تین ماہ بعد جب میں نے دوبارہ سنجیدگی سے اسے بتایا کہ مجھے کوئی ایسا ویسا دل پھینک نوجوان مت سمجھیں۔ میں اس سے شادی کا خواہاں ہوں۔ تو اس نے جواب دیا کہ ان کے ہاں ذات برادری سے باہر رشتے نہیں ہوتے دوسرے وہ اپنے چچازاد بھائی سے انگیجڈ ہے۔''

شاہ میر کا لہجہ خاصی افسردگی لیے ہوئے تھا۔

نگہت بیگم نے اشارے سے آپی کو کچھ بولنے سے روکا جو بولنے کے لیے پر تول رہی تھیں۔

''خدا گواہ ہے شاہ میر! میں نے زندگی کے کسی بھی معاملے میں اپنی اولاد پر زبردستی نہیں کی نہ ہی آئندہ کروں گی اور شادی جیسے اہم معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔ جہاں کہو گے وہیں پر رشتہ لے جانے کو تیار ہوں۔ مگر بیٹا......'' وہ رُکیں۔

''بیماری نے مجھے گھر کی ذمہ داری کے قابل نہیں رکھا۔ صبا کب تک آ کر ہمارا گھر سنبھالے گی پھر گھر کی ذمہ داری میں صرف کھانا پکانا تو نہیں ہے ناں۔ میں جلد از جلد تمہاری شادی کر دینا چاہتی ہوں۔ تمہیں جو لڑکی پسند آئی وہ کسی اور سے منسوب ہے تو کوئی بات نہیں بچے! وہ تمہارے نصیب میں نہیں ہوگی۔ صبا نے جو بچیاں دیکھ رکھی ہیں وہ بھی خوبصورت ہیں۔ اچھے گھرانوں کی شریف لڑکیاں ہیں اور پڑھی لکھی بھی ہیں۔ نکاح کے بولوں میں اللہ نے بہت طاقت اور برکت رکھی ہے خود بخود ہی ایک خوبصورت اور مضبوط رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی کے مابین بھلے وہ پہلے ایک دوسرے سے ناواقف کیوں نہ ہوں۔ پھر میں خود بھی ایک ایسی بہو کے حق میں نہیں ہوں جو نوکری کرتی ہو۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ میاں کی معاشی مدد

کرنا اچھی بات ہے مگراس حد تک جہاں گھر متاثر نہ ہوتا ہواور اس گھر کی حالت کا تمہیں پتہ ہی ہے جہاں ایک گھریلو لڑکی کی اشد ضرورت ہے۔'' نگہت بیگم نے رسان سے سمجھایا۔

شاہ میر اضطراری انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا اور بالوں میں انگلیاں پھنسائیں۔ اس کے صاف انکار' روکھے رویے اور بے رخی کے باوجود دل اس سے دستبردار ہونے کو تیار کہاں تھا۔

''آپ کی سب باتیں ٹھیک امی جان! سب شو ق سے سر آنکھوں پر مگراس بار مجھے صرف چھ ماہ کا وقت دیں بس۔ یقین کریں اس کے بعد آپ جو اور جیسے کہیں گی وہ ویسے کروں گا۔ میں کل سے ہی ساتھ والے امین صاحب سے بات کرتا ہوں وہ اپنی ملازمہ کو بھیج دیں گے یہاں...... پلیز امی...... پلیز......'' اس نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر لجاجت سے کہا۔

''لو بھلا! دیکھو اس لڑکے کو...... کیسی باؤلوں جیسی باتیں کر رہا ہے...... ایک ملازمہ جو پہلے آرہی ہے۔ جیسے الٹے سیدھے ہاتھ مار کر صفائی کے کپڑے برتن کر کے جاتی ہے۔ اس کا کام دیکھ کر بس کڑھتی رہتی ہوں۔ یہ ایک اور ملازمہ کس لیے بھئی۔'' نگہت بیگم نے صبا کو دیکھ کر اس کے ہاتھ جھٹکے۔

''اچھا ٹھیک ہے امی! اس کی شرط مان لیتے ہیں ہم نے جہاں ڈیڑھ سال دیکھ لیے وہاں چھ ماہ اور بھی دیکھ لیں گے مگر ایک شرط پر کہ منگنی ابھی کرلیں گے اور چھ ماہ بعد شادی......''

آپی کی بے تکی شرط پر وہ جھنجلا گیا۔

''افوہ! میں کہیں بھاگا جارہا ہوں یا مکر رہا ہوں اپنی بات سے جو ایسی ویسی شرائط لاگو کررہی ہیں آپ! بس میں نے کہہ دیا کہ آپ سے' ایسا کوئی سلسلہ شروع نہیں کریں گی آپ اور امی آپ بھی سن لیں۔'' اس نے کوفت سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

''اچھا امی! آپ فکر نہ کریں۔ شکر کریں وہ مان تو گیا ہے ناں۔ ورنہ تو پسند کی لڑکی...... پسند کی لڑکی کہہ کر پیچھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتا تھا۔ چھ ماہ ایسے چٹکیوں میں گزر جائیں گے۔ آپ یہ بتائیں کہ میری ساس......'' آپی نے نگہت بیگم کا دل بہلانے کے لیے ان کا دھیان بٹا دیا۔

☆......☆......☆

''بینک سے ہفتہ وار تعطیل کے سبب وہ آج گھر پر تھی سو اپنے کمرے کی اچھی طرح صفائی کر کے وہ صحن میں آگئی۔ دسمبر کی ہلکی دھوپ جسم کو بھلی معلوم ہورہی تھی۔ بھابی صاحبہ اپنی اولاد سمیت میکے سدھاری تھیں جبھی گھر میں سکون تھا امی کی اپنی ہی مصروفیات تھیں۔ وہ چھت پر اسٹور کی صفائی میں مصروف تھیں۔ ملازمہ کو ساتھ لگایا ہوا تھا۔ رامین چائے بنا کر دونوں کو اوپر دے آئی تھی اور اپنا کپ لے کر وہیں برآمدے کی سیڑھی پر ہی بیٹھ گئی۔ ذہن کی پرواز نے اڑان بھری اور شاہ میر تک جا کر رُک گئی۔ جب سے اس نے اُس کے کہیں انگیجڈ ہونے کی بابت دریافت کیا تھا۔ خاموش ہو گیا تھا۔

''شکر خدا کا! آج میڈم رامین کا دیدار بھی نصیب ہو ہی گیا ہمیں......'' عادی کی آواز پر وہ چونکی اور خالی کپ نیچے رکھ دیا۔

''کیا ہے یار! تم سے لڑائی کا منصوبہ بنا کر گھر سے نکلا تھا اور یہاں تمہاری شکل پر نظر پڑتے ہی سب کچھ بھول گیا۔'' وہ اُس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی کہ رامین سے مسکرایا بھی نہیں گیا۔

''جب ایک بار میں نے کہہ دیا کہ جب تک تم سنجیدہ ہو کر کوئی جاب نہیں کرو گے میں نے شادی نہیں کرنی۔ پھر ہر دوسرے دن تائی اماں کس خوشی میں شادی کی تاریخ مانگنے آ پہنچتی ہیں۔'' رات جب امی نے تائی کی آمد کا بتایا تھا وہ تو اسی وقت عادی کو کال کر کے اس کی کلاس لینا چاہتی تھی مگر اُس کا سیل آف ملا تھا اس وقت......

''کیا ہے یار! اب نہیں ملتی میرے مطلب کی نوکری تو چھین کے لے آؤں کیا؟'' وہ جھنجلایا۔

ابا کی دکانوں سے اچھا خاصا کرایہ آ جاتا ہے۔ زمینداری بھی ہے گاؤں میں، ریل پیل نہ سہی دولت کی مگر اتنی کی بھی نہیں ہے کہ اچھا گزارا نہ ہو سکے۔ دونوں بھائیوں کی اپنی اپنی فیملیز ہیں۔ ایسے میں میں رولنگ اسٹون کی طرح کبھی ایک کے ہاں تو کبھی دوسرے بھائی کے ہاں لڑھکتا رہتا ہوں۔ اماں بزرگ ہیں، کمزور ہو گئی ہیں۔ جلد از جلد میرے سر پر سہرا دیکھنے کی خواہاں ہیں۔ میں بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھا ہوا۔ تلاش کر رہا ہوں جاب میرے مطلب کی ملے تب ناں۔''

''عادی قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے کم پر قناعت تم کرتے نہیں ہو اور ہمارے ملک میں ایسے وسائل کہاں ہیں کہ ہر بے روزگار کو اُس کی من پسند نوکری پہلی ہی کوشش میں مل جائے۔ میں نے تمہیں کہا تھا وہ پرائیویٹ کمپنی میں جو سول انجینئر کی سیٹ تھی اُس پر اپلائی کر دو۔ مگر تمہاری ضد تھی نہیں کمپیوٹر کی ڈگری ہے تو سیٹ بھی یہی لوں گا۔ دو سال ہو گئے تمہیں تلاش کرتے ہوئے ملی جاب...... نہیں ناں اور مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے تم کوشش بھی ترک کر چکے ہو جاب کے لیے......''

''اچھا بھئی مینا! قسمت سے تو اکیلی ملتی ہو۔ کچھ اپنی باتیں کریں کچھ اپنے فیوچر کی...... یہ باتیں تو سنتے ہی رہتے ہیں...... یہ بتاؤ جاب کیسی جا رہی ہے تمہاری اور تمہیں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ تم اس بار میرا برتھ ڈے گفٹ بھول گئی، مجھے وش بھی نہیں کیا۔ میں چار دن ناراض رہ رہ کر خود ہی من بھی گیا۔''

''میں بھی خفا تھی تم سے...... جب پتہ چلا تھا کہ جس جاب کے لیے میں تمہیں اپلائی کرنے کا کہہ رہی تھی تم نے سرے سے نوٹس ہی نہیں لیا اُس کا حالانکہ ہمارے سینئر منیجر صاحب جن کے بھائی کی فیکٹری ہے انہوں نے یقین دلایا تھا کہ اگر لڑکا قابل ہوا تو ان کا بھرپور ووٹ تمہارے ساتھ ہوگا۔'' وہ بھی پھولے ہوئے منہ سے بولی۔

''کیا کروں عادی...... اسی ماحول میں رہتے ہوئے بھی میں اس لائف اسٹائل کی عادی نہیں ہو پائی آج تک...... اپنے گھر میں جب سے آنکھ کھولی یہی کچھ دیکھا۔ نوکری کر کر کے پائی پائی جوڑتی میری اماں، اور اللے تللوں میں اڑاتے ابا...... میں عورت کی جاب کے خلاف نہیں ہوں۔ سخت برا لگتا ہے مجھے جب بھی مردوں کی اس قسم کو دیکھتی ہوں جو بیویوں کو غم دوراں کے جھمیلوں میں دھکیل کر خود ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے ہیں......'' گہرے دکھ میں گھری وہ کئی بار کی کہی ہوئی باتیں پھر دہرا رہی تھی۔

''اور معاف کرنا...... صرف میرے گھر کا نہیں میں نے تو تمہارے گھر بھی یہی قدر مشترک دیکھی ہے، تایا ابا ساری زندگی نوکری یا کمانے جیسے جھمیلے سے آزاد رہے مگر زندگی آرام سے گزر گئی کہ باپ دادا کی کمائی زمین جائیدادیں کام آ گئیں۔ پھر وہی وطیرا تمہارے بھائیوں نے اپنایا، اماں تمہاری ڈھونڈ ڈھانڈ کے کماؤ بہوئیں

لے آئیں۔ ایک لیکچرار ہے تو دوسری کا چلتا ہوا پرائیویٹ اسکول ہے۔ بس جی بھائی تمہارے ہوگئے ریلیکس اور گھر کا بوجھ عورتوں کے سر...... اب...... اب مجھے ڈر ہے کہ تمہاری لاپرواہی مجھے بھی مستقبل کا کوئی اچھا نقشہ نہیں دکھا رہی۔'' وہ اب بھی افسردہ تھی۔ عادی نے بےزاری سے سر جھٹکا۔

''تم بھی ناں مینا...... بے وجہ کے وہم سے اتنا خوبصورت وقت بے معنی باتوں میں ضائع کر رہی ہو ہمارے گھر کا یہ لائف اسٹائل ہے تو سب راضی برضا ہیں یار اس سے میری بھابیوں کو جب کوئی ایشو نہیں ہے تو تم کا ہے کی ٹینشن لیتی ہو۔ اور ڈونٹ وری میری میرے بھائیوں جیسی سوچ نہیں ہے' تم بے شک شادی کے بعد نوکری چھوڑ کر صرف بچے پالنا گھر بیٹھ کے......''

''ہاں اور ایسا تب ہوگا جب تم کمانے باہر جاؤ گے اور مہربانی کر کے اپنی اماں محترمہ کو بھی منع کردینا کہ فی الحال یہ شادی کا شوشہ ہر دوسرے روز نہ چھوڑا کریں۔''

''ٹھیک ہے یار کہہ دوں گا اور تم بھی مہربانی کرکے جو بھی شکوہ ہو مجھ سے کرلیا کرو۔ ان کے سامنے ہی شروع ہو جاتی ہو۔ اتنا تو خیال کرلیا کرو کہ تمہاری ہونے والی ساس ہیں وہ...... پتہ نہیں یہ گھریلو ٹراکیٹیں میں کب تک نہیں بتاتا رہوں گا۔'' معمول کی یہ نوک جھونک نجانے کتنی دیر چلتی کہ امی کے آنے سے فی الحال یہ موضوع ختم ہوگیا تھا۔

رات کو وہ دونوں ماں بیٹی اپنے کمرے میں موجود تھیں جب کامران اپنے چھوٹے بیٹے کو گود میں اٹھائے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ سسرال سے غالباً ابھی ابھی واپسی ہوئی تھی اس لیے باہر بڑے بچوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

''اماں کتنے دن ہوگئے آپ سے کہا تھا کچھ پیسوں کا بندوبست کردیں۔ کچھ میرے پاس ہیں پیسے' منے کا عقیقہ کرنا ہے دھوم دھام سے...... آپ بھول گئی ہیں غالباً...... میں نے کہا یاد دلادوں آپ کو تاکہ پیسوں کا بندوبست ہوجائے تو اس جمعہ کو یہ مبارک تقریب رکھ دیتے ہیں۔'' رامین نے بینکنگ سے متعلق کتاب کو ٹھک سے بند کیا اور بھائی کی طرف متوجہ ہوئی جس نے آج تک اپنی کسی ذمہ داری کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ اُس کی شادی سے پہلے اماں کی پنشن اور رامین کی ٹیوشنز پر گزارا تھا۔ اِس کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ پیسے کس مشکل سے کمائے جاتے ہیں۔ اس نے ماں کا سر کھا کے زیرو میٹر بائیک خریدی تھی جس کے لیے اس کی ماں کو پورے سال کی بیسی کی قربانی دینی پڑی تھی اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ہر روز پیٹرول کی ٹنکی فل چاہیے ہوتی اور موبائل فون کے لیے الگ خرچ درکار تھا۔ پھر امی نے سوچا کہ شادی کردینے سے شاید اس میں عقل آجائے اور احساس ذمہ داری پیدا ہوجائے مگر بعد میں یہ خیال بھی دیوانے کا خواب ثابت ہوا۔ امی نے پنشن سے حاصل ہونے والی عمر بھر کی جمع پونجی سے دو دفعہ اس کو مختلف نوعیت کے چھوٹے پیمانے پر کاروبار شروع کردیے مگر وہ بھی اُس کی شاہ خرچیوں کی نذر ہوگئے تھے۔ بلکہ رامین کی بینک میں جاب کے بعد زیادہ تر بھائی اور اس کے خاندان کا خرچ اُس کے نازک کندھوں پر آگیا تھا۔ ساری زندگی باپ کو اسی طرز کی اور پھر بھائی کو اسی طرح کی زندگی گزارتے اور ان کی معاشی ذمہ داریوں کے بوجھ اٹھانے کے بعد اب اگر اُس کی خواہش یہ تھی کہ اُس کی زندگی میں اُس

کے خاوند کے طور پر شامل ہونے والا مرد اُس کے باپ اور بھائی جیسا نہ ہو تو عبث کیا تھا۔ بھائی کی تیز آواز پر وہ اپنے خیالوں سے لوٹی جو امی سے پیسوں کے لیے کسی حد تک گستاخی سے پیش آ رہا تھا۔

''عقیقہ اگر آپ نے کرنا ہی ہے بھائی تو ایک سادہ سی تقریب رکھ کے شرعی طریقہ سے کر دیں۔ زیادہ دھوم دھڑ کے کی ضرورت ہی کیا ہے ویسے ہی انسان کو ہر کام اپنی اوقات اور اپنی جیب دیکھ کر ہی کرنا چاہیے......'' بے حد غصہ پر قابو پا کر اس نے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی مگر کامران تو بھڑک ہی اٹھا اس کی بات سن کر۔

''تم تو چپ ہی کرو...... پتہ نہیں کیسی بہن ہو...... ساری دنیا کی بہنیں اپنے بھائیوں پر جان قربان کرتی ہیں مگر تم سے کچھ روپیہ نہیں خرچ ہوتا بھائی یا اس کے خاندان پر ...... چالیس ہزار تمہاری تنخواہ ہے...... چھبیس ہزار امی کی پنشن ...... اتنی رقم کا آخر تم لوگ کرتے کیا ہو۔ فقیروں کی طرح ہر سیزن کے شہلا اور بچوں کے دو دو سوٹ دلا دینا اور بس...... اگر اسی طرح ترسا ترسا کے رکھنا تھا تو شادی نہیں کرنی تھی میری...... ہر چیز کے لیے سوال کرنا پڑتا ہے' ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے' تب جا کے ضروریات زندگی ملتی ہیں۔ منے کا پرسوں سے دودھ ختم تھا۔ سارا دن بچہ روتا رہا۔ کل امی کو یاد کرایا تو دودھ کا ڈبہ آیا۔ کرتی تو ویسے ہیں امی مگر خدارا اس طرح ہماری عزت نفس کو ختم مت کیا کریں۔ مہینے کے شروع میں ہی کچھ رقم شہلا کے ہاتھ میں پکڑا دیا کریں جب پنشن لے کر آئیں تا کہ کسی ضرورت کے وقت میں یا میری بیوی محتاج تو نہ ہوتے پھریں......'' یہ ایک دن کا پڑھایا سبق نہیں تھا یقیناً بہت محنت کی گئی تھی اس کے دماغ پر...... امی تو بس سفید چہرے کے ساتھ اکلوتے لاڈلے کا منہ تکے جا رہی تھیں جس کی فرمائش انہوں نے ہمیشہ منہ سے نکلنے سے پہلے پوری کی جوان کی عمر بھر کی پونجی جو کہ لاکھوں میں تھی اللوں تللوں میں اڑا چکا تھا اور شادی کے بعد تو کچھ زیادہ ہی آرام طلب ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی اور تین بچوں کی مکمل ذمہ داری کو وہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتی آئی تھیں اس کا یہ صلہ دے رہا تھا۔ رامین نے غصے اور تاسف کی ملی جلی کیفیت میں بھائی کو دیکھا۔

''اگر امی اور میں آپ کے اور آپ کی فیملی کو سپورٹ کر رہے ہیں تو یہ بات ذہن میں رکھا کریں بھائی یہ ہمارا احسان ہے آپ پر...... فرض ہرگز نہیں ہے' بلکہ یہ فرض تو آپ کا ہے کہ اپنے خاندان کے ساتھ ساتھ ہم ماں بیٹی کی بھی ذمہ داری اٹھائیں۔ پڑھے لکھے ہیں' جوان ہیں ماشاء اللہ مگر بیٹھ کر کھانے کی لت جو پڑ گئی ہے وہ اتنی آسانی سے کہاں چھوٹے گی۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''دیکھ لیں امی...... ابھی بھی آپ کہتی ہیں کہ زیادتی ہمیشہ میری طرف سے ہوتی ہے۔'' سچ بات سن کر کامران کو آگ ہی لگ گئی۔

''تم چپ کرو رامین! اور تم جاؤ کامران اپنے کمرے میں' منے کے عقیقے کی تیاری کرو۔ ایک دو دن میں پیسوں کا بندوبست ہو جائے گا۔'' امی نے ڈھیلے سے انداز میں کہا تو رامین جو کچھ کہنے کے لیے پر تول رہی تھی سر جھٹک کر چپ کر گئی جبکہ کامران ہونہہ کہہ کر بچے کو اٹھائے اٹھائے باہر نکل گیا۔

''کہاں سے ہو جائے گا بندوبست رقم کا...... کوئی درخت اُگا رکھا ہے آپ نے جس پر سے پیسے توڑ کر ان خودغرض لوگوں کو دیتی جائیں گے۔

ارے کھا جائیں گے یہ لوگ ہمیں ...... اس مہینے کی دوائی نہیں آسکی آپ کی اس بار ...... یہ پتہ نہیں آپ کے بیٹے کو بیٹا دودھ کے لیے روتا رہ گیا یہ یاد ہے اُسے۔'' وہ رو ہی پڑی تھی۔

''مت رو بیٹا ...... وہ آزماتا ہے ہر انسان کو یہ اُس کا وعدہ ہے ہم انسانوں سے ...... کسی کو جان کے خوف سے کسی کو مال سے اور کسی کو اولاد سے مجھے وہ ایسے آزما رہا ہے تو دعا کرو کہ میں اس کی آزمائش میں پوری اتروں اور میری اولاد کو بھی ہدایت کی راہ نصیب ہو ......'' وہ جیسے تھک کر بولی تھیں۔

وہ ماں کو بس دیکھ کر رہ گئی تھی۔ صبح وہ بے حد پژمردہ سی آفس گئی تھی۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ اُسے لگا تھا جیسے شاہ میر اُسے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر وہ ہمیشہ والا نو لفٹ کا بورڈ لگائے اپنے کام میں مصروف رہی تھی۔ پھر چھٹی ٹائم باہر نکلنے پر معلوم ہوا تھا کہ کسی ہنگامے کے سبب شہر کے حالات اچانک ہی خراب تھے ایسا ہونا اگرچہ اب روز کی روٹین تھی پھر بھی ہر بار ایک نئی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ موبائل نکال کر پہلی کال اُس نے عادی کو کی تھی۔ اُس کا نمبر بند تھا۔ پھر اس نے کامران کو فون کیا تھا مگر دوسری جانب اُس کا جواب اُس کی آنکھوں میں آنسو لے آیا۔

''یہ تو اب روز کی بات ہے رامین! آجاؤ کسی نہ کسی طرح یا میں عادی کا پتہ کر کے بتاتا ہوں تمہیں وہ تو بالکل مخالف روٹ ہو جاتا ہے ہمارے گھر سے بائیک میں پیٹرول نہیں ہے اور میری ویسے بھی صبح سے طبیعت کافی خراب ہے۔''

ابھی وہ مزید کچھ اور بھی بول رہا تھا جب اس نے ڈھیلے ہاتھوں سے کال کاٹ دی تھی۔ یہ اس کا ماں جایا تھا اُس کا سائبان جس کو کئی سالوں سے کما کما کر کھلا رہی تھی۔ اپنا خون جگر پلا رہی تھی گویا۔

''ارے ...... ارے رُکیں کدھر منہ اٹھائے جا رہی ہیں اس طرح ...... بندہ کسی سے کچھ پوچھ یا سن ہی لیتا ہے ...... آگے تو حالات بہت خراب ہیں۔ سنا ہے فائرنگ بھی ہوئی ہے۔ میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔'' شاہ میر نے بائیک اُس کے بالکل قریب لا کر روکی۔ وہ کچھ دیر خالی نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔

''میں چلی جاؤں گی ......'' اس نے میکانکی انداز میں کہا اور ایک بار پھر چلنے لگی۔

''آپ تو چلی ہی جائیں گی ...... مجھے پتہ ہے لیکن مجھے اس طرح آپ کو اکیلا چھوڑ کر جانے کے لیے نہ میرا دل مان رہا ہے نہ ہی ضمیر ...... جلدی سے بیٹھ جائیں۔ باقی سب جا چکے ہیں۔''

وہ دھونس سے بولا تو رامین کا دل کیا کہ وہ زور زور سے رونے لگے۔ مگر اپنے اردگرد شام کے بڑھتے سائے دیکھ کر وہ سنبھل کر بائیک پر بیٹھ گئی۔ پھر پتہ نہیں کن کن راستوں سے گزار کے وہ اُسے گھر تک لایا تھا۔ روزانہ ایک گھنٹے میں طے ہونے والا فاصلہ آج دو گھنٹے میں طے ہوا تھا۔ وہ اُسے اُتار کر گھر جانے کے لیے پر تولنے لگا جب رامین نے شکریے کے ساتھ اُسے گھر آنے کی دعوت دی۔

''نہیں بہت شکریہ! میری اماں ذرا وہمی قسم کی خاتون ہیں اپنے ٹائم سے لیٹ ہو جاؤں تو پریشان ہو جاتی ہیں۔ اور ایک اور بات کہنا تھی آپ سے ......'' وہ ذرا رُک کے گویا ہوا۔ رامین نے سوالیہ انداز میں اُسے دیکھا۔

''آفس میں تو آپ پھولن دیوی کا ورژن نو دکھائی دیتی ہیں ورنہ میں تو بات کے لیے اچھی جگہ اور موقع کی تلاش میں تھا ...... مگر ...... کیا ہے کہ

......'' اُس کو دیکھ کر اس نے سر کھجایا۔ اس وقت وہ مین روڈ سے ہٹ کر ذیلی سڑک پر موجود تھے جس پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ نیچے اُتر کر اگلی گلی میں اُس کا گھر تھا۔

''اماں اور آپی نے جینا حرام کر رکھا ہے کہ لڑکی بتاؤ رشتہ لے کر جانا ہے...... آپ کی انگیجمنٹ کا آپ کی زبانی سن کر بہت شاک لگا تھا کہ جس لڑکی کو دل و نظر نے پہلی نظر میں او کے کر دیا تھا وہ کسی اور کا نصیب کیسی بن سکتی ہے...... گزشتہ چھ ماہ سے اللہ سے دعا مانگ رہا ہوں کہ یا تو وہ آپ کا دل میری طرف پھیر دے یا پھر میرا دل آپ سے اُٹھ جائے مگر ہر دعا کی قبولیت کا وقت مقرر ہوتا ہے اس لیے دونوں میں سے ایک بھی دعا مقبولیت کے درجے تک نہیں پہنچ پا رہی۔ بہت بھولنے کی کوشش کے باوجود آپ حواسوں پر پہلے دن کی طرح سوار ہیں۔ اور آپ کو بہت چاہنے کے باوجود اپنا اعتبار نہیں دلا پایا جبھی آپ کا رویہ دن بدن خراب تر ہوتا جا رہا ہے میرے ساتھ۔'' سنجیدگی سے بولتے اس شخص کو رامین بس حیرت سے سن رہی تھی۔

''اب آپ سے اتنی درخواست ہے کہ یا تو میرے حق میں ہو جائیں یا پھر میرے دل کے پھر جانے کی ہی دعا کر کے خدارا مجھے اس مشکل سے نکال لیں جس کا میں کئی دنوں سے شکار ہونے کے باوجود نہ حل ڈھونڈ پایا ہوں نہ ماں بہن کو مطمئن کر سکا ہوں۔ ہوسکتا ہے آپ ہی کی نظر میں کوئی تدبیر نکل آئے۔ چلتا ہوں، اپنا خیال رکھیے گا......'' بے بسی سے اپنی بات مکمل کرتا وہ بائیک اس کے پاس سے نکال لے گیا۔ رامین پتہ نہیں کیسے گھر تک پہنچی تھی جہاں امی بے تابی سے اس کے انتظار میں گیٹ کے پاس ہی ٹہل رہی تھیں۔

''کہاں رہ گئی تھیں رامین! کامران نے بتایا تھا ہڑتال ہے۔ تو عادی کو بھیجا تو ہے میں نے...... اب اُس کی کال آئی تھی کہ رامین کا نمبر آف ہے اور اُن کا آفس بند ہو چکا ہے، اب میں کیا کروں؟'' میں نے اُسے واپس آنے کا کہہ دیا۔ اب خود ٹھہر کر دعائیں کر رہی تھی کہ میری بچی بخیر و عافیت گھر پہنچ جائے۔'' امی بولتے بولتے اس کے ساتھ کمرے میں ہی آ گئیں۔

''کیسے آئی تم...... عادی نے بتایا کہ راستے تقریباً بند ہیں اور لوکل ٹرانسپورٹ بھی نہیں چل رہی۔''

''آفس کے ایک کولیگ نے چھوڑا ہے امی...... آپ کے سپوت کو کال کی تھی کہ آ کر لے جائے مجھے مگر اس نے تو صاف انکار کر دیا۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''تمہیں پتہ تو ہے اس کی عادت کا...... پھر بھی دل برا کرتی ہو......'' امی نے ساتھ چلتے چلتے اسے بہلایا۔

''باپ بھائی تو سائبان ہوتے ہیں ناں امی...... ہر مشکل میں ماؤں بیٹیوں کے آگے ڈھال بن جانے والے...... میں نے تو ایسا صرف کتابوں میں پڑھا ہے بس داخلہ جمع کروانے کے لیے بینک میں گھنٹوں قطار میں کھڑا ہونا تھا یا بیماری کی صورت میں ڈاکٹر کے پاس باری کا انتظار کرتے ہوئے...... ایسے ہر مرحلے پر اپنے ساتھ والی ہر عورت کے ساتھ کبھی باپ دیکھا، کبھی بھائی تو کبھی شوہر...... سوائے اپنے......'' جوتے اُتار کر بیڈ پر بیٹھتے اُس کے انداز میں تھکن نمایاں تھی۔ اور ماں سے یہ نہ کہہ سکی کہ آئندہ آنے والی زندگی میں انہوں نے اس کا جو زندگی کا ساتھی چنا تھا وہ بھی اُس کی

زندگی میں آنے والے باقی مردوں سے ہرگز مختلف نہ تھا۔ عادی شروع سے ہی شاہانہ زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ ماں باپ نے خرچ کرنے کے لیے ہمیشہ کھلا خرچ دیا تھا۔ کسی بھی قسم کا احساس ذمہ داری دلائے بغیر سو وہ بھی اپنے دونوں بھائیوں کی طرح بیٹھ کر کھانے کا عادی ہوگیا تھا۔ شومئی قسمت اُس کی زندگی میں بھی پڑھی لکھی اور کمانے والی ایسی لڑکی آنے والی تھی جو اس کو تمام عمر بٹھا کر کھلا سکتی تھی سو انجینئرنگ کی ڈگری لینے کے باوجود اُس کا نوکری کے لیے دھکے کھانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ زندگی گزارنے کے لیے باپ دادا کی زمینیں ہی ابھی تک کام آرہی تھیں جو زرعی ہونے کے باعث بے حد قیمتی بھی تھیں سو بڑے اور اہم خرچوں کے وقت اُن میں سے تھوڑی بہت اراضی بیچ کر وہ وقت گزار لیا جاتا جیسا کہ دونوں بھائیوں اور دونوں بہنوں کی شادیوں پر عادی کے ابا نے اپنی زمین بیچ کر شاہانہ طریقے سے شادیاں کی تھیں۔

اب تو کچھ عرصہ سے عادی رامین سے بھی ضرورت کے وقت بھی جتنی رقم ضرورت ہوتی لے لیا کرتا تھا اور رامین کو کبھی اعتراض بھی نہ ہوا تھا مگر کچھ عرصہ سے بھائی کی بے حسی اور کاہلی کے ساتھ ساتھ وہ عادی کی کچھ عادتوں سے بھی خار کھانے لگی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس نے شرط رکھی تھی کہ جب تک عادی نوکری کر کے کمانے نہیں لگتا اُس کی شادی کا نام بھی نہ لیا جائے۔ اُسے عادی کا نام بچپن سے اپنے ساتھ سن سن کر ایک فطری لگاؤ تو تھا جس کے تحت وہ اُس کی بہت سی عادتیں جو اُس کی ناپسندیدہ تھیں برداشت کر جاتی تھی مگر اس سب کے باوجود عمر بھر کے لیے اُسے بٹھا کر کما کر کھلانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ آج آفس میں جب عادی نے اُسے کال کی تھی کہ اُسے دس ہزار روپوں کی اشد ضرورت ہے جو وہ جلدی لوٹا دے گا کہ ایسا دعویٰ وہ ہر بار رقم کے تقاضے کے ساتھ کرتا تھا مگر کبھی واپسی کی نوبت تک نہیں آئی تھی اور آج زندگی میں پہلی بار رامین نے جھوٹ بول دیا تھا کہ مہینے کا آخر ہے اور اس کے پاس صرف چند روپے ہی بچے ہیں۔ ایسا کر کے اگرچہ اُسے افسوس ہو رہا تھا مگر اس نے سوچا تھا کہ اپنے گھر کے مردوں کو کاہل بنانے میں بہت حد تک ہاتھ گھر کی عورتوں کا بھی تھا۔ ان کے اپنے گھر امی کے پاس پیسے ہوتے تھے یا نہیں۔ ابا کی جیب اس نے بے روزگار ہونے کے باوجود بھری دیکھی تھی بعض دفعہ اسکول جاتے ہوئے امی کرایہ تک ابا سے مانگ کر لے جاتی تھیں۔ اسی طرح عادی کے گھر کا اصول تھا۔

اُس کو کوئی غرض نہیں تھی کہ پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ماں باپ تک فرمائش پہنچا دی جاتی تھی۔ جیسے بھی کریں، اب تو گزشتہ دس سال سے تایا جی نے پرائز بانڈ اور انعامی پرچی کا جو کاروبار شروع کیا تھا وہ عروج پر تھا پیسے ناجائز طریقے سے گھر میں آرہے تھے اِس سے ہر کوئی انجان تھا، خوشی اس بات کی تھی کہ کمی نہیں تھی۔ رامین کی بھابی بھی تایا کی بیٹی تھی وہ اپنے باپ کے گھر والا طرزِ زندگی شوہر کے گھر بھی چاہتی تھی اور شوہر اس کی ہر فرمائش پوری کرنا جی جان سے اپنا فرض سمجھتا مگر ماں اور بہن کے بل بوتے پر......

عادی اگر موقع بہ موقع رامین سے پیسے بٹورتا تھا تو جب اُس کے پاس پیسے وافر ہوتے تب وہ رامین کو مہنگے مہنگے تحائف بھی دیا کرتا تھا مگر وہ بھی اپنے ابا کے بل پر...... سو ایسے میں رامین اس ماحول اور طرزِ زندگی کو بدل دینا چاہتی تھی۔

اگرچہ وہ گھر کے ہر فرد کی زندگی اور طرز زندگی بدلنے پر قادر نہیں تھی تب بھی اتنی خواہش ضرور تھی اس کی کہ وہ ویسی زندگی نہ گزارے جیسی اُس کی ماں نے گزاری تھی۔ شاہ میر کے واضح اظہار کے بعد نجانے کیوں دل ہمک ہمک کر ایسے شخص کی ہمراہی چاہ رہا تھا جو احساس ذمہ داری کے جذبے سے آشنا ہو۔ حالات کی تلخی اور تند لہروں میں اپنی شریک سفر کا ساتھ چھوڑ دینے کی بجائے اس سے ایک قدم آگے کھڑا ہو۔

دو سال کی سرد مہری اور خاموشی کو توڑتے ہوئے اب وہ اُس کے سلام کا جواب بھی دے دیا کرتی تھی اور کبھی خود بڑھ کر سلام بھی کرلیا کرتی تھی اور وہ درویش شخص اُسی میں بے حد خوش تھا۔

اس دن وہ بریک میں اپنا لنچ بکس کھولے بیٹھی تھی جب وہ بھی بڑی بے تکلفی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''آہا بریانی...... آپ بھی سوچیں گے کہ کیسا ندیدہ شخص ہے مگر کیا کروں کہ بریانی دیکھ کر خود کو روک نہیں پاتا ہوں۔ اماں تو عرصہ ہوا جوڑوں کے درد کی وجہ سے کھانا پکانے سے ریٹائرڈ ہوچکی ہیں۔ آپی کا احسان ہے کہ ہفتہ کے ہفتہ آکر دو تین قسم کے سالن بنا کے فریز کر جاتی ہیں۔ تین ماہ پہلے کھائی تھی ان کے ہاتھ کی بریانی......'' بڑی بے تکلفی سے اس نے ہاتھ سے ہی اس کے بکس میں سے دو تین نوالے لیے۔ رامین نے مسکرا کر ٹفن اس کے سامنے رکھ دیا۔ ٹشو سے چمچ صاف کر کے وہ بھی اُس کی طرف بڑھایا۔

''آپ نے کیوں چھوڑ دیا کھانا...... کھائیں ناں...... میں نے ایسے بھی نہیں کہا کھاتے کھاتے وہ رُکا۔'' رامین ایک بار پھر مسکرائی۔

''میں کھانے کی بہت چور واقع ہوئی ہوں شاہ میر صاحب...... یہ تو ایک دو دفعہ امی سے زبردست سی جھاڑ کے بعد اس ٹائم کچھ لے لیتی ہوں جو وہ بڑی محنت سے بنا کر رکھ دیتی ہیں ورنہ تو شام کو ہی جا کے کھانا کھاتی ہوں۔ ابھی یہ آپ کے حصہ کا رزق ہے آپ ہی کھائیں۔'' زندگی میں پہلی بار اُس نے عام سے انداز میں اس سے بات کی تھی۔ ورنہ تو بہت دوٹوک اور ناگوار لہجہ ہی ہوتا تھا اُس کا۔

''ہوں...... آپ کی صحت سے بھی لگ رہا ہے کہ آپ صرف سونگھتی ہی ہوں گی اور مجھ سے صرف آرام سے بات کرلیا کریں۔ اتنا ہی کافی ہے میرے لیے کھانے کی آفر نہ ہی کریں تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ گھر کے کھانے کو ترسا میں یہ قیمتی اور نادر پیشکش ٹھکرا نہیں پاؤں گا۔'' جب وہ شکریہ کر کے اُٹھ رہا تھا تو رامین نے کہا تھا کہ اُس کی امی بہت اچھی کوکنگ کرتی ہیں۔ وہ اس میں سے روزانہ اُس کی پلیٹ بھجوا دیا کرے گی۔ تب شاہ نے خوشگوار سی حیرت سے کہا تھا۔

''میں نے یہ آفر ٹھکرانے کے لیے نہیں دی۔ میری امی روزانہ خالی لنچ بکس دیکھ کر خوش ہوجائیں گی اور میں روز والی ان مادرانہ صلواتوں سے بچ جاؤں گی جو ایسی صورت حال میں ماؤں سے سننے کو ملتی ہیں۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتی دوبارہ سے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہورہی تھی کہ آفس میں باہر جانے والے لوگ واپس آنا شروع ہوچکے تھے اور وہ اپنی جو ساکھ شروع سے بنا چکی تھی اسی کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ شاہ میر بھی اس کا گریز سمجھ کر اپنے کیبن میں آ گیا۔ آج وہ بے حد خوش تھا۔

☆......☆......☆

اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر

رُکی۔ بھابی اُس کی وارڈ روب کھولے کھڑی تھیں اور رامین کے کپڑے نکال نکال کر خود کے ساتھ لگا کر دیکھتیں جو پسند نہ آتا وہ سوٹ بیڈ پر پھینکتی جا رہی تھیں۔ آئے روز یہ منظر دیکھ دیکھ کر بھی رامین کو ہر بار نئے سرے سے کوفت ہوتی تھی۔

''کیا ہوا بھابی! کیا دیکھ رہی ہیں۔'' اپنی بیزاری چھپاتی وہ اندر داخل ہوئی۔

''ہاں..... تم کب آئی..... کتنی بوڑھی روح ہو تم رامین..... تمہاری عمر کی لڑکیاں کتنے برائٹ کلرز استعمال کرتی ہیں اور تمہارے ڈریسز میں ایک سے ایک پھیکا رنگ بھرا پڑا ہے۔

ہمیشہ کی طرح دوسرے کے احساسات جانے بغیر بے لاگ تبصرہ حاضر تھا۔

''خیر..... باجی کے بیٹے کی سالگرہ پر پہننے کے لیے کوئی سوٹ دیکھ رہی تھی۔ ایک سوٹ پچھ بہتر لگا ہے مجھے..... اس کے ساتھ کی میچنگ جیولری ہے پڑی میرے پاس، تم کون سا سوٹ پہنو گی؟'' خود ہی سوال جواب کے مراحل طے کرتی بھابی صاحبہ نے پوچھا۔

''میں کہاں جاتی ہوں بھابی کہیں بھی..... امی ہی جائیں گی اگر جانا ہوا..... تھک گئی ہوں بہت۔'' وہ نیم دراز ہوتی ہوئی بولی۔ امی ٹرے میں کھانا گرم کر کے لے آئی تھیں۔

''امی باجی کے بیٹے کی سالگرہ پر کچھ دینا دلانا بھی تو ہوگا۔ کامران سے کہا تو انہوں نے کہا کہ ''گفٹ لینے کا تو ٹائم نہیں ہے۔ امی سے پیسے لے لینا.....'' اب بھابی امی کے ضبط کا امتحان لے رہی تھیں۔ رامین غصے کے گھونٹ پیتی اٹھ بیٹھی اور کھانا زہر مار کرنا شروع کیا کہ امی کی سختی سے تاکید تھی کہ وہ آئندہ ان معاملوں میں بات کر کے بھائی بھابی کا دل برا نہ کیا کرے کیونکہ

جس قسم کے حالات تھے پوری تو انہوں نے ہی کرنی تھی۔ امی نے صرف بھابی کو ہی نہیں گفٹ کے پیسے دیے تھے بلکہ اپنی طرف کا بھی لفافہ دیا تھا بھابی کو کہ آج ان کی طبیعت بہتر نہیں ہے سو وہ سالگرہ پر نہیں جاسکیں گی سو شام گہری ہونے کے قریب بھائی کی پوری فیملی سالگرہ کے فنکشن کے لیے چلے گئے جب شاہ میر کی امی اور بہن ان کے ہاں تشریف لائی تھیں اور بڑی محبت اور عاجزی سے رامین کے لیے دست سوال کیا تھا۔

''شاہ میر رامین کے ساتھ ہی کام کرتا ہے بینک میں۔ بچی کے اخلاق اور کردار سے بہت متاثر ہوا۔ دو سال ہو گئے شادی کرلو..... شادی کرلو کا راگ الاپتے مگر صاحبزادے کو کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آتی تھی اور جب ہم نے زبردستی کرنے کی کوشش کی تو بالآخر رامین کا نام لے دیا۔ وہ بھی اس خبر کے ساتھ کہ وہ منگنی شدہ ہے۔ میں تو اسی روز ہی آنے کو تیار تھی جب سے اس نے بہن کو رامین کے بارے میں بتایا مگر یہ منع کرتا رہا کہ رامین نے سختی سے منع کر دیا ہے۔ اس دن سے بہت پریشان دیکھا ہے اپنے بچے کو..... اب مزید اپنے ہمہ وقت ہنستے مسکراتے بچے کو اُداس دیکھنا میرے بس میں نہیں رہا تو اس کی بہن کو لے آئی ہوں آپ کے پاس کہ خدارا کوئی تدبیر ہو تو بتائیں۔ میں حکم دوں تو شاید وہ مان بھی جائے گا شادی کے لیے مگر خوش نہیں رہ پائے گا۔'' وہ ماں اپنی اولاد کی محبت میں مجبور ہو کر بے بسی سے بول رہی تھیں جبکہ آپی ویسے ہی خاموش بیٹھی تھیں۔

''آپ بہت اچھے اور وضع دار لوگ ہیں بہن اور آپ کا بیٹا یقیناً ہی وہ اوصاف رکھتا ہوگا جیسے آپ بتا رہی ہیں مگر ہمارے بچوں کی زندگی کے فیصلے ان کے بچپن میں ہی کر دیے جاتے ہیں اور

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان میں وٹہ سٹہ کی شادیاں ہوتی ہیں۔ رامین کی چچازاد میری بہو ہے اور رامین نے رخصت ہو کر اپنے چچا کے گھر جانا ہے۔ بچے اس عمر میں وقتی پسندیدگی پال لیتے ہیں مگر جب عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے تو ان باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ عادی ماشاء اللہ سلجھا ہوا پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ انجینئرنگ کی ڈگری لی ہے ابھی حال ہی میں، بس نوکری ملتے ہی رامین کو رخصت کر دیں گے۔'' امی سبھاؤ سے سمجھا کر اب رامین کی سسرال کی خصوصیات گنوا رہی تھیں۔ شاہ میر کی امی نے حسرت سے اپنے سامنے میز پر تواضع کے لوازمات رکھتی رامین کو دیکھا۔ وہ واقعی دیکھنے میں اور انداز و اطوار میں ایک سلجھی ہوئی خوش شکل لڑکی تھی۔ ان کے بیٹے کو مشکل سے ہی کچھ پسند آتا تھا مگر وہ اسے حاصل کیے بنا چین سے نہیں بیٹھتا تھا اور اگر اس کی پسند کی چیز اُسے نہ مل پاتی تو ہفتوں، مہینوں اداس پھرتا تھا۔ یہاں اس کی زندگی سے جڑی کوئی پسند کی چیز نہیں تھی بلکہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی۔

کیا وہ اسے آسانی سے بھول پائے گا؟

واپسی کے سفر میں انہوں نے سوچا مگر جواب ناں میں آیا تھا۔ اس کی بہن نے کئی لڑکیوں کی تصویریں لا کر دکھائی تھیں۔ مگر اس نے انہیں دیکھے بغیر ایک سائیڈ میں ڈال دیا تھا اور خود باہر نکل گیا تھا۔ اب بھی دونوں ماں بیٹیاں شاہ میر کو بتائے بغیر آئی تھیں رشتہ لے کر اور ناکام و نامراد لوٹی تھیں۔

''کیسا لڑکا ہے شاہ میر! اُس کی ماں اور بہن تو بہت اچھی لگیں مجھے......'' امی نے سرسری سا پوچھا تھا۔ رامین نظریں چرا کے رخ موڑ گئی۔ کیسے بتا دیتی کہ اپنی فطرت عادات و کردار کی بدولت وہ اس کے دل میں تیزی سے جگہ بنا رہا تھا۔ جب جب اس پر نظر پڑتی نجانے کیوں وہ اُس کا موازنہ عادی سے کرنے بیٹھ جاتی مگر امی کو رُخ موڑے موڑے اس نے صرف اچھا ہے امی...... کہا تھا۔

''تم عادی کی نوکری والی ضد چھوڑ دو بیٹا! وہ ڈھونڈ تو رہا ہے مل جائے گی نوکری بھی، میں اپنی زندگی میں ہی تمہیں اپنے گھر کا کر دینا چاہتی ہوں۔ اپنے بھائی کی حالت تو دیکھ ہی چکی ہو تم...... تمہاری تائی بھی پچھلی دفعہ خوب ناراض ہو کے گئی کہ اتنے گئے گزرے نہیں ہیں ہم کہ عادی کی نوکری کو دیکھیں گے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے گھر میں۔'' امی کی بات پر اُس نے دکھ سے امی کو دیکھا۔

''ایسے ہی حیلوں سے آپ کی ساس بیاہ کے لے گئی تھیں آپ کو...... ابا نے ساری زندگی نوکری کا نام لینا بھی گوارا نہیں کیا۔ مان لیں امی عادی بھی ابا کا ہی بھتیجا ہے...... زمین، جائیداد، زیور، مکان...... کسی چیز کی خواہش کی میں نے...... کسی بھی چیز کی نہیں مجھے صرف یہی خواہش ہے کہ میری زندگی کا ساتھی میری ضروریات زندگی کے لیے اپنی ماں، بہن یا بیوی کا محتاج نہ ہو۔ مجھے اپنے زور بازو سے دو وقت کی روٹی کما کر کھلائے بس......'' وہ روہانسی ہوگئی۔ عادی نے بہت دن ہوئے چکر نہیں لگایا تھا نہ فون پر رابطہ کیا تھا۔ شاید اس کے پیسے نہ دینے والی بات سے ناراض تھا۔ اگلے دن اُس کی حیرت کی حد نہ رہی جب ایک طرحدار سی لڑکی کو بڑے استحقاق سے عادی کے ساتھ بائیک پر دیکھا۔ دونوں کے انداز آپس کی بے تکلفی کو اچھی طرح آشکار کر رہے تھے۔ آفس پہنچ کر اس نے پہلی کال اُسے ہی کی تھی۔

خیریت دریافت کرنے کے بعد پہلا سوال اُس لڑکی کی بابت ہی کیا تھا اُس نے......

''آپا کی نند تھی یار...... کل سے ہمارے گھر ہی تھی آپا کے ساتھ...... صبح صبح آپا نے آرڈر دیا کہ اُسے گھر چھوڑ آیا جائے خود اُن کا مزید دو دن رہنے کا پروگرام بن گیا...... ویسے تم کیا جیلس ہوگئی اُسے دیکھ کے...... ویسے ہونا بھی چاہیے۔ اتنی خوبصورت بھی تو ہے اور کروڑوں کی جائیداد کا تڑکہ بھی ساتھ ہے۔'' وہ مسکرا کر اُس کی حالت کا حظ لے کر بولا۔

''مجھے کیا ضرورت ہے ایرے غیرے لوگوں سے جلنے کی، تم نے بہت دن سے چکر نہیں لگایا تھا تو خیریت دریافت کرنا چاہ رہی تھی کہ یہیں ہو یا گاؤں میں۔'' تایا زمینوں کی آمدنی کا حساب کتاب لینے اپنے بیٹوں میں کسی ایک کو گاؤں بھیج دیا کرتے تھے۔

''ارے قدر کیا کرو میری لڑکی! وہ ایری غیری لڑکی بدلے بدلے تیور سے دیکھ رہی ہے آج کل مجھے...... اور تمہیں فکر ہی نہیں ہے۔'' عادی کا انداز حسبِ معمول لاپرواہی لیے ہوئے تھا۔

''اور ہاں کبھی ہمارے ہاں چکر بھی لگالیا کرو۔ مجھ سے ہی اکیلا رشتہ نہیں ہے تمہارا...... امی سے آکر دعا ہی لے لیا کرو کبھی...... ابھی سے ہی نخریلی بیوی کا رول پلے کرنا شروع کردیا ہے تم نے......'' عادی نے دوسری طرف منہ بنا کر کہا۔

رامین نے آؤں گی کہہ کر بات کا اختتام کردیا تھا یہ کہے بغیر کہ اس کا دل ہی نہیں کرتا تھا تایا کے گھر جانے کو...... تایا کے گھر کا ماحول اس کی فطرت سے ہرگز میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ چلی بھی جاتی تو جلدی جلدی واپس آنے کو دل کرتا اور کوئی نہ کوئی بہانا بنا کر واپس آجاتی۔ بڑی دونوں بھابیاں بہنیں تھیں۔ اُن کی عجیب سی شو آف کرنے کی نیچر تھی۔ تایا گھر پر کم ہی نظر آتے۔ تائی کے پاس سنانے کو خاندان کے ڈھیروں قصے ہوتے، تایا کی بڑی بیٹی سے جب ملاقات ہوتی وہ سسرال کے بخیے ادھیڑتی نظر آتیں اور چھوٹی والی نے تو اپنی عادات وسکنات سے اس کی بھابی بن کر کئی سال سے ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ وہ سوچتی کہ شادی کے بعد ایسے ماحول میں کیسے تمام عمر جیئے گی جہاں بالکل مختلف مزاج و عادات کے لوگ بستے تھے جو اس کے مستقبل میں اُس کا قریبی رشتہ بننے والے تھے۔

☆......☆......☆

''ہیلو...... کیا ہوا میڈم...... کن سوچوں میں گم ہیں۔ ڈومنٹ کے لیے آپ کا کمپیوٹر یوز کرسکتا ہوں...... ہمارے روم کا سسٹم گڑبڑ کررہا ہے......'' شاہ میر نے اس کے کیبن میں آکر کہا۔ رامین نے چونک کر اثبات میں سر ہلا دیا اور خود مقفل دراز کھول کر فائلز باہر نکالنا شروع کردیں۔

''میرا پوچھنا بنتا تو نہیں ہے رامین لیکن کچھ دنوں سے پریشان لگ رہی ہیں آپ مجھے...... ایک سیانے کا قول ہے کہ دکھ یا پریشانی آپ کا اپنا ہوتا ہے کوئی دوسرا اپنی جان پر اُسے نہیں لے سکتا لیکن اُسے بیان کرکے اپنے دل کا بوجھ ضرور ہلکا کیا جاسکتا ہے ہم دوست نہ سہی کولیگ تو ہیں ناں...... کوئی پریشانی ہے تو کہہ کر دیکھیں ہوسکتا ہے میں آپ کی پریشانی بانٹ نہ سکوں لیکن آپ ریلیکس ہوجائیں۔'' اس کے گم صم انداز میں دیکھ کر شاہ میر سے رہا نہ گیا تو وہ بغور اُس کی جانب دیکھ کر بولا تھا۔ ایک لمحے کو تو رامین کا دل کیا کہ اپنی ساری اُلجھنیں اس مخلص شخص سے بانٹ کر

خود شانت ہو جائے مگر وہ صرف پھیکا سا مسکرا ہی سکی۔

''کچھ نہیں شاہ میر صاحب! آپ کا وہم ہے میں ٹھیک ہوں۔''

''میرا یہ جاب چھوڑنے کا ارادہ ہو رہا ہے۔'' پیپرز پن اپ کرتے اُس نے سرسری سا کہا۔ رامین چونک گئی۔

''کیوں' خیریت؟ اس جاب میں کیا برائی ہے۔ اچھی خاصی ہے لوگ ترستے ہیں ایسی جاب کے لیے.....'' رامین کے ذہن میں عادی کا سراپا جھلملایا۔

''یہاں رہوں گا تو آپ کو بھول نہیں پاؤں گا۔ امی اور آپی کا شادی کے لیے اصرار اب ناراضگی میں بدل رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی دوسری جگہ مجھ سے ان کی مرضی کا فیصلہ کروانے میں کامیاب ہو جائے..... آپی نے تو اب مجھ سے بات چیت بھی بند کردی ہے۔ امی بھی بس ضرورت کے وقت ہی مخاطب کرتی ہیں۔ ٹھیک ہی تو کہتی ہیں کہ سراب کے پیچھے بھاگنا عقلمندی نہیں ہے اور آپ کے بار بار بتانے کے باوجود کہ آپ انگیجڈ ہیں۔ جلدی شادی بھی ہو جائے گی۔ میں پتہ نہیں کس امید پر اُن کو انکار کر رہا تھا..... ایک دو جگہ اپلائی تو کیا ہوا ہے دیکھیں جیسے ہی گرین سگنل ملتا ہے وہاں سے یہاں سے ریزائن کر دوں گا۔ بس یہ تھوڑا عرصہ برداشت کرلیں مجھے.....'' زبردستی مسکراتا ہوا۔

وہ کہیں سے وہ پرانے والا شاہ میر نہیں لگا جو ہمہ وقت ہنستا مسکراتا ہی نظر آتا تھا۔ رامین اس گم صم بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ دل تھا کہ عجیب سے انداز میں اس شخص کی جانب کھنچے چلا جا رہا تھا۔ جہاں سے ایسی بےلوث اور والہانہ محبت چاہتی تھی وہاں سے ہمیشہ لاپرواہ رویہ ہی دیکھنے کو ملا تھا اور اگر کبھی عادی اس سے اچھے طریقے سے بات کرلیتا یا اسے سراہ دیتا تو اس سے اگلا تقاضا رقم کا ہوتا تھا اور یہاں اسے محبت نظر آتی تھی تو وہ ایسا کوئی حق نہیں رکھتی تھی کہ اسے خوش آمدید کہہ سکے۔ اسے کبھی بھی عادی کا لاپرواہ انداز محسوس نہ ہوتا اگر جو شاہ میر نے اس کی زندگی میں قدم نہ رکھا ہوتا۔ وہ پیارا سا شخص اپنے اندر وہ تمام خصوصیات رکھتا تھا جن کو رامین اپنے ہمسفر کے اندر دیکھنے کی متمنی تھی۔ مروت وخلوص کے جذبوں سے گندھا ہوا احساس ذمہ داری کے احساس سے آشنا..... کتنی ہی بار جب اس پر مہینے کے شروع کے دنوں میں کام کا بوجھ زیادہ ہوتا وہ اُس کی خفگی برداشت کرتے ہوئے بھی کتنا ہی کام نمٹا دیا کرتا تھا۔ ایسے کہ اُسے احساس دلائے بغیر وہ ساری ذمہ داری غیر محسوس طریقے سے خود پر ڈال کر کرلیتا تھا سب کچھ..... اور عادی یا پھر اُس کا بھائی..... ایک کاغذ تک فوٹو کاپی کروانے اُسے خود ہی شاپ پر جانا پڑتا تھا۔

کا ہلی اُس کے گھر کے مردوں کی رگ رگ میں خون کی طرح سرایت کر چکی تھی۔ اب جب وہ عادی کو جیسا ہے۔ اچھا ہے کی بنیاد پر قبول کر چکی تھی۔ شاہ میر کے اس سے ٹکرانے میں قدرت کی کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔ سوچ سوچ کر دماغ دکھنے لگا اور آنکھوں کی نمی چہرے پر چھلک کر اس کا بھرم توڑنے کو تیار ہوگئی تب اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر پیون کو اپنے لیے چائے لانے کو کہا۔ آج بھی وہ لنچ کے لیے بریانی لائی تھی مگر آج شاہ میر اس کے کیبن میں نہیں آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

امی نے اپنی جمع پونجی نکال کر بیٹے کو تھما دی تھی کہ بچے کے عقیقہ کے ساتھ اس کے سو خرچ اور نکل آئے تھے۔ تب کچھ سوچ کر رامین نے امی کے ہاتھ میں معمول سے کم رقم رکھی تھی کہ آج ہی اُسے سیلری ملی تھی۔

''یہ...... کم نہیں ہیں بیٹا......'' امی نے رقم گننے کے بعد اس سے سوال کیا جو چائے پیتے ہوئے کسی اُلجھن کا شکار لگ رہی تھی۔

''جی تین ہزار کم ہیں...... بینک میں ہی رہنے دیے ہیں۔ حج تو نجانے کب نصیب میں ہو کہ اس کے لیے مختص اپنی رقم تو آپ اپنے سپوت پر خرچ کر چکیں۔ اب میں چاہتی ہوں کہ آپ عمرہ کر کے ہی اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر آئیں۔ پانچ ہزار کی مزید کمیٹی شروع کی ہے آفس کے اسٹاف نے تو میں بھی شامل ہو گئی ہوں۔ ارادہ اور خواہش تو آپ کی برسوں سے ہے لیکن اسباب کے لیے کوشش کریں گے تو سبیل بنے گی امی...... اپنے بیٹے کے برتے پر زندگی کی سب سے بڑی خواہش مت رکھیں۔'' امی اپنی حساس سی بیٹی کو دیکھ کر رہ گئیں جو کچھ عرصہ سے انہیں اُلجھی ہوئی سی لگنے لگی تھی۔ کبھی کبھی اس کے لہجے میں انہیں تھکن اور تلخی کا عنصر بھی نظر آتا تھا۔ کون کہتا ہے کہ بیٹیاں بوجھ ہوتی ہیں۔ ارے بیٹیاں رامین جیسی بھی ہوتی ہیں بوجھ اٹھانے والی...... بہت چھوٹی عمر سے ہی اس نے اپنی پڑھائی کا خرچا اٹھالیا تھا۔ ٹیوشنز پڑھا پڑھا کر اور گزشتہ دو سال سے اس گھر کو چلانے میں امی کے شانہ بشانہ کھڑی تھی۔ وہ آگے بڑھیں اور اُس کی پیشانی چوم لی۔

''اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے بیٹا!'' جو توقعات وہ اپنے بیٹے سے رکھتی تھیں۔ انہیں بہت پہلے سے ان کی بیٹی پورا کرتی آرہی تھی اور بیٹا توڑتا ہوا آرہا تھا۔

اگلے دن شام کو منے کے عقیقے کی تقریب تھی۔ ویسی ہی شاندار جیسی وہ لوگ چاہتے تھے۔ بھابی کا پورا میکہ جمع تھا اور تو اور بڑی آپا کی وہ طرحدار نند بھی موجود تھی جسے اِس دن رامین نے عادی کے ساتھ دیکھا تھا۔

''آؤ بھئی رامین! تم تو بینک کی نوکری میں سب کچھ بھول ہی گئی ہو۔ جاب کرنا اچھی بات ہے مگر اس سب میں انسان بھول کر رشتے داروں کو تو نہیں بھول جاتا ناں، آخر کو ہر رشتے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اور کچھ نہ سہی ہماری چچازاد ہو تم، کتنے فنکشنز ہوئے گھر اور خاندان میں ہر جگہ پر چچی ہی نظر آئیں۔ اور بھابیاں بھی ہیں ہماری اچھے عہدوں پر ہیں مگر ان کو تو ہر تقریب ہر پروگرام میں آگے آگے دیکھا ہے۔ مگر تمہاری عجیب ہی نوکری دیکھی ہے ہم نے۔'' عادی کی آپی جو کافی دنوں کی بھری ہوئی تھیں۔ رامین کے سلام کرتے ہی اُس پر چڑھ دوڑیں۔

''اپنی اپنی عادت کی بات ہے آپی! مجھے بس بھیڑ بھاڑ سے عجیب سی اُلجھن ہوتی ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔ جہاں تک رشتہ داری کے تقاضوں کا تعلق ہے تو اللہ میری امی کو سلامت رکھے ابھی تو وہ پورے کرتی ہیں جب میری باری آئی تو دیکھیں گے۔'' ان کے اس انداز کو برداشت کر کے اس نے جبری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر کہا کہ وہ اُن کے گھر مہمان تھی۔ آپی نے اس کی بات کا جواب تک نہیں دیا اور اپنی نند سے باتوں میں مصروف ہوگئیں جو عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ ویسے بھی تائی کے گھر کے تمام افراد کو اس نے آج اسی حسینہ کے آگے پھرتے ہی محسوس کیا تھا۔ مردانہ تقریب باہر تھی سو

عادی فی الحال اُسے نظر نہیں آیا تھا۔ بھابی کے اشارہ کرنے پر وہ اُن کے ساتھ کھانے کے انتظامات دیکھنے کے لیے اٹھی تو پھر فارغ ہونے پر سوائے بستر کے کسی چیز کی چاہ نہیں تھی۔ بس نماز کی ادائیگی کے بعد جو گری تو صبح کی خبر لائی تھی۔

اگلی صبح ویسی ہی تھی جیسی روز ہوا کرتی تھی۔ اس نے دو دن پہلے امی کے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر سے ٹائم لیا تھا۔ اب بھائی سے کہنے آئی تھی کہ وہ گھر جلدی پہنچ گئی تو امی کو چیک کرا لائے گی بہت دن سے وہ سانس کی تکلیف برداشت کر رہی تھیں جو ذرا سا چلنے میں ہی بری طرح سے پھول جاتا اور ایسی حالت میں ان کو شدید گھٹن بھی محسوس ہوتی تھی۔ گزشتہ سال سے ہونے والی اس تکلیف کو وہ مسلسل برداشت کر رہی تھیں مگر ایک دن جب رامین نے ان کی حالت دیکھی تھی تو بہت پریشان ہوگئی تھی اور ڈاکٹر سے ٹائم بھی لے لیا تھا۔ اُس کا ارادہ تھا آج ذرا جلدی گھر آ کر امی کو لے جائے گی بعض اوقات ٹریفک جام کی وجہ سے اسے بہت دیر ہو جایا کرتی تھی۔ ایسی صورت میں بھائی کو کہے گی کہ وہ پانچ بجے تک ہر صورت امی کو دکھلا لائے گا۔

مگر ٹھٹک کر رک جانا پڑا کہ بھابی کی پاٹ دار آواز میں پڑھا جانے والا شکایتی قصیدہ یقیناً اُس کی یا امی کی ذات سے متعلق تھا۔ وہ اپنے سسرالی رشتہ داروں کے بارے میں ایسے ہی انداز میں بات کرنے کی عادی تھیں۔

''دس ہزار امی نے الگ دیا' ابا نے الگ...... بہنوں نے بھی اتنے ہی دیے...... بھابیاں بھی مہنگے مہنگے تحفے دے کر گئیں...... تمہاری بہن بس تقریب کا لباس ہی منے کو دلا کے فارغ ہوگئی اور امی جان نے تو وہ تکلف بھی نہیں کیا۔''

''افوہ! ہر بات کو پکڑ ہی لیا کرو تم...... امی نے اگر کچھ نہیں دیا تو نہیں ہوں گے پیسے اُن کے پاس...... ویسے بھی وہ تمام رقم اس فنکشن کے لیے مجھے دے چکی ہیں۔'' بیوی کے واویلے پر بھائی کی جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔

''ارے جاؤ بھئی آپ بھی بہت سیدھے ہو جوان باتوں میں آ جاتے ہو پچیس سال کمایا ہے انہوں نے اور کاروبار کے نام پر آپ کے ہاتھ میں چند لاکھ پکڑا کر بری الذمہ ہوگئیں......'' آگے بھی وہ اپنی بات جاری رکھنے کا ارادہ رکھتی تھیں مگر دستک دے کر اندر آتی رامین کو دیکھ کر چپ ہوگئی۔ بھائی البتہ بوکھلا گیا تھا۔ رامین نے کچھ بھی ظاہر کیے بغیر بھائی کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ وہ گھر پر ہی رہے گا چار بجے کے بعد' اگر وہ نہ پہنچ سکی تو امی کو ڈاکٹر کے پاس لے کے جانا ہے۔ ایسے ہر موقع پر وہ بھی آئیں بائیں شائیں کر جاتا تھا مگر آج پتہ نہیں بیوی کی زبان کے جوہر رامین پر کھلنے کی شرمندگی تھی یا کچھ اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

رامین عجیب سے دل کے ساتھ واپس آئی تھی۔ شاہ میر کی شاید آج چھٹی تھی جبھی وہ نظر نہ آیا تھا۔ دل البتہ اُسے دیکھنے کا اتنا عادی ہو چلا تھا کہ تمام دن بجھا بجھا ہی رہا۔ چھٹی سے دو گھنٹہ قبل اس نے ایمرجنسی لیو کی درخواست لکھی اور آفس سے چلی گئی۔ مہینے کے آخری دن تھے سو کام کا اتنا بوجھ نہیں تھا اس لیے چھٹی مل بھی گئی۔ چار بجے تک وہ گھر ہی تھی۔ بھابی شاید کیا یقیناً میکے میں تھیں۔ ایک ہی محلے میں گھر ہونے کی وجہ سے وہ روزانہ ہی میکے کا چکر لگا لیتی تھیں۔ اس نے بھائی کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ امی کو لے کر جا رہی ہے۔

پھر بار بار گھڑی دیکھتے وہ کسی ٹیکسی کی تلاش کر رہی تھی جب شاہ میر نے گاڑی اس کے قریب لاکر روکی تھی۔

''ارے رامین! کیوں کھڑی ہیں یہاں' خیریت...... آجائیں...... میں چھوڑ دیتا ہوں......'' صرف کہنے کا تکلف نہیں کیا اس نے بلکہ گاڑی سے اُتر کر گاڑی کا بیک ڈور بھی کھول کر کھڑا ہوگیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو رامین انکار کردیتی مگر اتنی مشکل سے ڈاکٹر کا ٹائم ملا تھا اور چھٹی بھی...... کسی اور وقت پر دونوں چیزیں ترتیب دینا مشکل تھا۔ سوامی کے کان میں آہستہ سے بتایا کہ اس کے کولیگ ہیں اور بینک میں اس کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ امی بھی اثبات میں سر ہلا کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ اُس کی ماں اور بہن سے اس کے بارے میں سنا تھا۔ آج دیکھ بھی لیا تھا کہ کتنا مہذب اور شائستہ نوجوان تھا۔

''آپ کی طرح میری امی کا بھی آج چیک اپ کرانا تھا آنٹی! جوڑوں کی مستقبل مریضہ ہیں کچھ سالوں سے......بہن نے گاڑی بھجوائی تھی۔ بائیک پر بیٹھنے میں تکلیف محسوس کرتی ہیں میری امی...... ان کو چیک اپ کرا کے گھر چھوڑ آیا ہوں۔ اب آپی کے گھر گاڑی چھوڑنے جارہا تھا۔'' وہ لمحوں میں ہی امی سے بے تکلف ہوگیا۔

''جلد ہی اپنی گاڑی کا ارادہ بن رہا ہے میرا' میں تو خیر بائیک پر ہی ایزی فیل کرتا ہوں مگر اب ضرورت محسوس ہورہی ہے گاڑی کی...... امی کا چیک اپ کرانا ہوتا ہے اور جب آپی کی اولاد ضد پر آجائے کہ آئسکریم کھانے جانا ہے تو ساری پلٹن کو بائیک پر لادنا بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔''

اس کی بات پر وہ دونوں ماں بیٹی مسکرادی تھیں۔ پھر نہ صرف شاہ میر نے دونوں کو ڈاکٹر کے پاس چھوڑا بلکہ رامین کی حیرت کی حد نہ رہی جب اس نے چیک اپ کے بعد واپس آنے پر اُسے انتظار گاہ میں بیٹھے پایا تھا۔

''ہوگیا چیک اپ...... کیا کہا ڈاکٹر نے...... کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟'' اس طرح پوچھتا وہ کتنا اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ رامین نے ہی آہستہ سے بتایا کہ ڈاکٹرز نے خون کی کمی کے ساتھ دمہ کی بھی شکایت بتائی ہے۔

''مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے شاہ میر صاحب! اس طرح آپ باؤنڈ ہوکر ہمارا ویٹ کرتے رہے' چلے جاتے ہم لوگ......'' وہ ہلکی سی خفگی سے کہہ رہی تھی۔

''ہاں بچے! اور بھی تو کوئی کام تمہارے منتظر ہوں گے......بہن کی گاڑی بھی پہنچانی ہے اور تمہاری اماں بھی راہ تک رہی ہوں گی۔'' امی کی بات پر وہ ہنس پڑا۔

''ارے آنٹی! یہ کیسی غیروں والی باتیں کررہی ہیں' آپ بھی تو میری ماں کی جگہ پر ہیں۔ ایسے کیسے چھوڑ کر چلا جاتا۔ اماں کو میں کھانا اور دوائی کھلا کر ملازمہ کو اُن کے پاس چھوڑ کے آیا تھا۔ اور گاڑی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپی کی اپنی ذاتی ہے یہ...... اماں کو جب بھی ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہو دو' دو دن تک ہمارے گھر ہی چھوڑ دیتی ہیں آپی۔ اُن کے گھر بھلا گاڑیوں کی کیا کمی ہے۔ وہ ان دونوں کی خودار فطرت کو جانتا تھا اس لیے پوری تسلی کرانے کی کوشش کررہا تھا۔ پھر اس کے اصرار پر ہی وہ دونوں اس کے ساتھ بیٹھیں۔ شاہ میر نے نہ صرف ان کو گھر تک چھوڑا بلکہ اپنے پاس رکھے فروٹس اور جوسز کے شاپرز بھی زبردستی امی کو تھما دیے۔ وہ نا...... نا...... کرتی رہ گئیں مگر اس نے انہیں قائل کرہی لیا کہ وہ ان کی

عیادت کے لیے آتا تو کیا خالی ہاتھ آتا اور اُس کا انداز اتنا بھرپور اور قطعی تھا کہ رامین بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ اس بار بھی اس نے ان دونوں کی گھر آنے کی پیشکش پر مسکرا کر کہا کہ زندگی نے ساتھ دیا تو ضرور آئے گا اور خدا حافظ کہہ کر گاڑی نکال کر لے گیا۔ امی تو بہت دیر تک اُسے دعائیں دیتی رہی تھیں۔

''ایسے ہیرے جیسے بچے قسمت والی ماؤں کا نصیب ہوتے ہیں۔ خوش نصیب ہوگی وہ لڑکی جو اُس کی زندگی کی ساتھی بنے گی۔ کتنی چاہ سے اُس کی ماں اور بہن رشتہ لے کر آئی تھیں۔ کاش...... یہ وٹے سٹے کا طوق گلے سے اُتار پھینکنے کا اختیار ہمیں حاصل ہوتا تو میں ہرگز اس رشتے کو گنوانے کی غلطی نہ کرتی۔'' امی کا انداز خود کلامی کے جیسا تھا پھر بھی رامین کے اندر گہرے سناٹے اتر گئے تھے اُن کی بات سن کر...... بہت تھکا ہونے کے باوجود اُسے کتنی دیر تک نیند نہ آسکی تھی۔ امی اور وہ ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں یہ جاننے کے باوجود بھی بھائی نے آ کر پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ ڈاکٹر نے امی کو کیا کہا تھا۔ نہ ہی گھر آنے پر اُن کو کھانے کے نام پر کچھ ملا تھا۔ یقیناً وہ لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ بھابی کے پورشن میں ٹی وی چلنے اور بچوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ جب رامین امی کے لیے سنکے ہوئے دو سلائس اور دودھ کا گلاس لے کر گئی تھی کہ ان کو آج سے ہی دوائی شروع کرانی تھی۔

''دنیا مکافات عمل ہے امی! بھابی تو پرائی بیٹی ہے اس سے کیا گلہ جب اپنا کھوٹا ہی کمزور ہو...... دیکھیے گا ان کی اولاد بھی ایسا ہی کرے گی ان کے ساتھ......'' امی نے سلائس دیکھ کر جب کھانے کی بابت پوچھا تھا۔ تب رامین بولی تھی۔ ماں تھیں برداشت نہ کرسکیں۔

''ایسے مت کہو بیٹا! اللہ میرے بچوں کو خوش رکھے اور ہدایت کے رستے پر چلائے۔'' انہوں نے گہری سانس لے کر سلائس کا ٹکڑا توڑا تھا۔

اگلے دن ہفتہ وار تعطیل تھی۔ عموماً امی ہی گھر کا راشن، سودا سلف ہر ہفتے جا کر لے آیا کرتی تھیں کہ بھائی ایسی ہر قسم کی ذمہ داری سے آزاد تھا۔ مگر آج رامین نے امی کو منع کر دیا کہ آرام کریں وہ خود ہی جائے گی مارکیٹ، بہت دن سے عادی سے بات نہیں ہوئی تھی۔ اس نے سوچا عادی کو ساتھ لے کر جائے گی سو گھر کی تفصیلی صفائی کے بعد اس نے دال چاول بنائے اور امی کو بتا کر تایا کے گھر آگئی۔ لان میں ہی بڑی آپی کے بچے اور اپنے بھتیجا بھتیجیاں کھیلتے نظر آئے تھے۔ لاؤنج میں دونوں بھابیاں سر جوڑے نظر آئیں۔ اس کے سلام کرنے پر وہ چونکی تھیں۔ رامین نے عادی کے ساتھ ساتھ تائی کا بھی پوچھا تھا۔

''آج سنڈے ہے رامین اور شاید تمہیں پتہ نہیں ہے کہ اس دن ہماری ساس صاحبہ کی اپنی اولاد کے ساتھ خصوصی میٹنگ چلتی ہے جس میں بہوؤں کی انٹری ممنوع ہے خیر جلد ہی اس گھر کا حصہ بنو گی تو روٹین بھی سمجھ لوگی اپنی سسرال کی...... امی جان کے خاص کمرے میں ہیں آپ کے عادی صاحب اور دونوں بہنیں۔'' بڑی بھابی نے خاصے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے بھابی! میں ان سے وہیں مل لیتی ہوں۔'' اس نے دونوں بہنوں سے جان چھڑا کے کہا اور خود تائی کے کمرہ خاص کی طرف آگئی۔ دروازہ مکمل بند تھا نہ کھلا ہوا بھڑا ہوا تھا۔ داخل ہونے پر رامین کو اپنا نام سنائی دیا تو قدموں کو زمین نے جکڑ لیا۔

''رامین سے کیسے پیچھا چھڑواؤں گا میں؟

اس وقت یہ بات زیادہ اہم ہے۔'' عادی کی جھنجلائی آواز میں اس کے لیے بے زاری کوٹ کوٹ کر بھری تھی جس نے رامین کو فریز کر دیا۔

''لو پیچھا چھڑانے کی بھی کیا خوب کہی تم نے..... تین بار شادی کی تاریخ لینے گئی ہوں مگر رامین بی بی کے نخرے ہی نہیں ختم ہو رہے ایک ہی ضد ہے کہ عادی کی نوکری ہو جائے تب ہی بات ہوگی شادی کی' اب بھی کہہ دیں گے کہ اور کتنا ایڑیاں رگڑیں تمہاری دہلیز پر..... تمہارے ابا کو میں خود سمجھالوں گی۔'' اطمینان سے کہتی یہ تائی تھیں۔ رامین کی آنکھوں میں بے ساختہ ڈھیر سارے آنسو بھر گئے۔ شاہ میر کے بار بار اصرار پر بھی اس نے اُس کو پذیرائی نہ بخشی تھی اگرچہ دل کب سے ہی اِس کا اسیر ہو چلا تھا مگر وہ خود کو ایک معاہدے' ایک رشتے کا پابند سمجھتی تھی جو اس کے خاندان نے اس کے لیے چنا تھا۔ وہی لوگ تھے جو آج اس رشتے سے منکر ہونے کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے۔ کتنی تحقیر تھی اس شخص کے لہجے میں اس کے لیے جس کو اس نے کب سے اپنا مان لیا تھا۔

''کامران اور شہلا کی زندگی پر تو نہیں اثر پڑے گا اس بات کا..... آخر کو رشتہ کا معاملہ ہے۔'' یہ آواز بھی بلاشبہ عادی کی تھی۔

''ارے تم فکر ہی نہ کرو اس کی..... کامران پوری طرح سے میری مٹھی میں ہے جو میں کہوں گی۔ ویسے ہی کرے گا وہ..... ویسے بھی کامران سے جب سے پیسوں کا حساب کتاب رکھنے لگی ہے رامین وہ خار کھاتے ہیں اس سے۔ اور انہیں بھی اس بات کا غصہ ہے کہ اماں کے بار بار تاریخ لینے آنے پر بھی رامین کی ضد پر چاچی نے شادی کی تاریخ دی ہی نہیں۔'' اطمینان سے بولتی وہ اُس کی اپنی بھابی تھیں جو اس کے کپڑوں سے لے کر ضرورت کی ہر چیز کے لیے خود کو مالک سمجھ کر بلا اجازت جب اور جیسے چاہتی استعمال کرتی تھی۔ جس کے خرچ کے لیے رامین ہر مہینے بھائی کے ہاتھ پر پیسے رکھتی تھی۔

''ارے اماں شکر کریں آپ اور فخر کرے عادی جس کو زیب نے پسند کیا ہے ورنہ اس کے لیے محاورتاً نہیں حقیقتاً رشتوں کی لائنیں لگی ہوئی ہیں ہمارے گھر اسی کے ہم پلہ' میرے ساس سسر کو تو اعتراض تھا مگر لڑکی ضد پر اڑی ہے کہ شادی کرے گی تو عادی کے ساتھ' ڈیفنس والا بنگلہ تو نام ہی اسی کے ہے اور سلامی میں بھی دلہا کو گاڑی دینے کا ارادہ رکھتے ہیں ہمارے گھر والے' دیگر بہن' بھائی جو گفٹس دیں گے وہ الگ..... ختم کریں اس رامین والے سلسلے کو اور آج ہی مجھے فائنل بتائیں کہ باقاعدہ رشتہ لینے کب آ رہے ہیں آپ لوگ۔ میں تو کہتی ہوں کل ہی آ جائیں۔'' یہ بڑی آپی تھیں۔

''ہاں ہاں ٹھیک ہے بالکل..... بلکہ میرا خیال ہے کہ رشتہ پکا کر کے جب مٹھائی جائے گی چچی کے گھر تو بات کھل جائے گی ساری..... پہلے سے کسی کو کیا کچھ کہنا۔'' عادی کی آواز میں ایک اَن دیکھا غرور بول رہا تھا۔ آخر کو ہائی سوسائٹی کی خوبصورت اور دولت مند لڑکی کا انتخاب ٹھہرا تھا وہ..... رامین سے اس سے زیادہ برداشت نہ ہو سکا تھا وہ دروازہ دھکیلتی اندر آ گئی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کو سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ رامین نے ایک نظر سب کے فقی چہروں کی طرف دیکھا پھر بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی سے انگوٹھی اُتار کر شیشے والی میز جو ان کے درمیان میں رکھی تھی پر رکھی۔

''مجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے آپ سب میں سے کسی کو کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود اس رشتے سے انکار کرتی ہوں۔ کیونکہ ساری عمر ایک طفیلیے کو پالنے کی ہمت اور حوصلہ مجھ میں نہیں ہے۔'' عادی کا چہرہ اس کی بات سن کر سرخ ہوگیا جبکہ باقی کسی کو پتہ نہیں اُس کی بات سمجھ میں آئی تھی یا نہیں سب ہی چپ تھے۔ رامین جس خاموشی سے آئی تھی ویسے ہی جا چکی تھی۔

☆......☆......☆

امی کو سوتا دیکھ کر وہ اپنے کمرے میں آیا تھا جب اُسے رامین کی کال موصول ہوئی تھی۔ اس کے پاس نمبر تھا اس کا مگر اس کے دوٹوک رویے کے باعث آج تک فون کرنے کی ہمت نہیں کر پایا تھا۔

''السلام علیکم' زہے نصیب! خوشی کے مارے آج تو مجھے نیند بھی مشکل سے آئے کہ آپ نے کیسے یہ عزت بخشی ہے۔'' خوشگوار حیرت کے زیر اثر اُس کی ہلکی سی ہیلو سن کر وہ ریلیکس ہو کر بیٹھا۔

''جی...... وہ آپ سے پوچھنا تھا وہ جو متبادل جابز کے لیے آپ نے اپلائی کیا تھا اُس کا کیا ہوا؟'' اُس کی غیر متوقع بات پر شاہ میر چونک گیا۔

''جی...... ایک جگہ چانسز تو ہیں تو کیا ہوا خیریت؟''

''وہ میں کہہ رہی تھی کہ آپ کو اتنی اچھی جاب چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں یہ جاب چھوڑ رہی ہوں۔'' رامین کا ایسا کہنا شاہ میر کے دل پر قیامت ڈھا گیا۔ وہ اُس کو کبھی نہیں دیکھ پائے گا۔ یہ سوچ کر ہی دل پر قیامت گزر گئی۔

''کک...... کیوں...... اتنی جلدی......'' بہت دیر خاموشی کے بعد بے ربط سے کچھ لفظ منہ سے نکلے۔ وہ یہ نہ پوچھ سکا کہ اُس کی شادی تو نہیں ہو رہی۔

''جی اس لیے کہ میری ہونے والی ساس بیمار رہتی ہیں۔ اور ان کی خواہش ہے کہ کیونکہ ان کے گھر اللہ کا دیا سب کچھ ہے تو ان کو اپنی بہو کو دفتروں میں رُلتا دیکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اس وقت یہ جاب میری ضرورت تھی شادی کے بعد نہیں ہوگی۔'' بہت خوش ہو کر وہ بتا رہی تھی اور بڑے پیار سے اپنی ساس اور شادی کا ذکر کیا تھا۔

''بہت مبارک ہو رامین! اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے......'' وہ بہت مشکل سے آہستہ سے بولا۔ دوسری جانب رامین کے ہنسنے کی آواز پر اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ صبح و شام دعاؤں میں طلب کرنے پر بھی وہ اُس کا نصیب نہیں بن سکی تھی کیا وہ اُسے بھول پائے گا۔

''ابھی مبارکباد مت دیں اس کا ابھی ٹائم نہیں آیا۔ سب سے پہلے تو ایک کام جو ضروری ہے وہ یہ کریں کہ کل اپنی امی اور آپی کو رشتہ کے لیے بھیج دیں۔'' رامین کی ہنستی ہوئی آواز اور بات پر وہ جھٹکا کھا کے اٹھ بیٹھا۔

''سوری...... میری طبیعت نہیں ٹھیک رامین...... آپ...... آپ نے کیا کہا ابھی میں نے سنا نہیں......'' بے تابی و بے قراری سے وہ بولا۔

''میں نے کہا کہ آپ کی چائے اُدھار تھی ہم پر وہ بھی پینی ہیں آپ نے اور آنٹی اور آپی کو بھیجے گا ...... ہوسکتا ہے اس بار قسمت آپ پر اور مجھ پر مہربان ہونے کو تیار ہو۔'' آہستہ سے کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ شاہ میر نے خوشی سے گنگ ہوتے فون کو دیکھا اور 'یاہو' کہتا ہوا امی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا کہ اگر وہ جاگ رہی ہوں تو قسمت کی مہربانی کے متعلق سب سے پہلے ان کو بتائے۔

☆☆......☆☆

گئے۔ ہال میں مہمانوں کے ساتھ حمنہ اور خالد رہ گئے تو سارے مہمان بھی ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد ہال میں حمنہ اور خالد تنہا بیٹھے تھے۔

حمنہ: یہ بچے ابھی تک اوپر سے نہیں آئے، چھوڑ کر آنے میں اتنی دیر لگتی ہے کیا؟

خالد نے ہنستے ہوئے حمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کیوں اپنا وقت بھول گئیں، کمرے سے کوئی نکلنے کو تیار نہیں تھا تو پھر اماں کو آ کر سب کو باہر نکالنا پڑا تھا۔ حمنہ وہ منظر یاد کر کے مسکرائی اور چہرہ موڑ کر بولی۔

''تو کیا آپ کے خیال میں ہمیں بھی جانا چاہئے۔''

''نہیں! ہمیں اب گھر جانا چاہئے، دو تین گاڑیاں ہیں بچے خود آ جائیں گے اور جو ایک کمرہ ہم نے ایکسٹرا بک کروایا تھا وہ وہاں بھی رات گذار سکتے ہیں۔''

☆......☆......☆

حمنہ اور خالد گھر آ گئے۔ بیٹی کو رخصت کر کے ایسا لگ رہا تھا جیسے زندگی ایک دم سے ہلکی ہو گئی

ہے، حمنہ کو اپنا وجود ہوا میں اڑتے چڑیا کے پر کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ چیز جو کبھی ہاتھ میں آنا ناممکن لگتی تھی، آج وہ چیز مکمل ہو کر اس کے ہاتھ سے جا چکی تھی۔ کپڑے بدلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اماں کا بھی اسے رخصت کرتے ہوئے یہی حال ہوا ہوگا؟ کیا انہیں بھی ایسے ہی لگا ہوگا کہ جیسے ان کا وجود خالی ہو گیا۔ سر سے ایک بوجھ تھا جو اتر گیا۔ کیا اسی لیے بیٹی کو بوجھ سمجھا جاتا ہے کہ پرائے گھر چلے جانے کے بعد ہی سکون ملتا ہے، کپڑے بدل کر باہر آئی تو خالد شائد ابھی تک اندر نہیں آئے تھے، ان کا انتظار کرتے کرتے وہ بستر پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی اُن کی آنکھ لگ گئی۔ خالد نے کمرے میں آ کر حمنہ کو بے خبر سوتا دیکھا تو ڈھیر ساری باتیں کرنے بچوں کا بچپن یاد کرنے کا پروگرام ملتوی کر دیا اور حمنہ پر ہلکا کمبل ڈال کر خود باہر جا کر بیٹھ گئے، ان کی آنکھوں سے نیند بہت دور تھی۔

☆......☆......☆

صبح سویرے حمنہ کی آنکھ کھلی تو خالد بستر پر نہیں تھے، لگتا تھا رات کوئی یہاں لیٹا ہی نہیں ہے۔ حمنہ باہر آئی تو لاونج میں خالد صوفے پر سر ٹکائے سو رہے تھے اور ان کی گود میں البم کھلا ہوا تھا۔ حمنہ نے دھیرے سے اپنا ہاتھ خالد کے کاندھے پر رکھا تو ان کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے پاس بیٹھتے ہوئے البم ان کی گود سے اٹھالی۔

''خالد یہ کیمرہ بھی کیا ایجاد ہے زندگی کے حسین ترین لمحوں کو ہمارے لیے فریز کر دیتا ہے۔ ہر ایک یاد، ان تصویروں میں بند ہو جاتی ہے اور جب دیکھو تو وہ بولنے لگتی ہیں، جیسے وہ بچے دیکھتے تھے نا فلم ہیری پوٹر، اس میں بھی تو تصویریں بولتی تھیں۔'' حمنہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ باتیں کرتی چلی جائے بچوں کی باتیں، سعد اور عنایا کی باتیں اپنے اندر بیٹھے خوف اور خوشیوں کی باتیں، اس لیے خالد نے اٹھتے ہوئے پوچھا کیا آج ناشتہ نہیں کرنا۔ حمنہ نے مسکرا کر جواب دیا: کرنا ہے مگر آج ٹیرس پر ناشتہ کرینگے، آج اسلام آباد بہت خوبصورت لگ رہا ہے۔

☆......☆......☆

دونوں باہر چلے آئے واقعی صبح کی سنہری دھوپ میں ہر چیز حسین لگ رہی تھی، حتیٰ کے تھوڑے فاصلے پر بہنے والی نہر کے کنارے بھی آج، روز سے زیادہ پھول کھلے ہوئے تھے، دور مری کی پہاڑیاں دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔

''حمنہ یہاں بیٹھو اور اس منظر کو دیکھو۔ آج میں ناشتہ بنا کر لاتا ہوں، ہمیشہ تو تم بنا کر لاتی رہی ہو۔'' خالد نے دھیمی سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر کہا۔ مگر حمنہ نے یہ سب کہاں سنا وہ تو اپنی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

حمنہ۔ حمنہ۔ خالد نے اسے آوازیں دیں تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا، کیا سوچ رہی تھیں؟''

''کچھ نہیں بس۔ بیس اکیس سال پیچھے چلی گئی تھی۔ وہ ساری باتیں ذہن میں ایسے تازہ ہو گئی ہیں جیسے کل کی بات ہو۔'' وہ گہری آنکھوں سے خالد کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

جو کام میں رات بھر کرتا رہا کیا اب تمہاری باری ہے۔ میں چائے بنا کر لاتا ہوں

حالانکہ آج سورج مشرق سے ہی نکلا ہے۔ پھر بھی آپ کام کر رہے ہیں۔'' اور وہ دونوں زور سے ہنس دیے۔

☆......☆......☆

حمنہ مری کی دھندلی پہاڑیوں کو دیکھتے ہوئے

یادوں کی دھند میں ڈوبتی چلی گئی، اسے اکیس برس پہلے کی وہ شام یاد آگئی جب وہ دونوں ڈاکٹر کے پاس سے واپس آرہے تھے، خالد بالکل خاموش تھے اور حمنہ کی رورو کرہچکی بندھی ہوئی تھی۔ شادی کے آٹھ سال بعد، ان کی زندگی کی آخری امید بھی دم توڑ گئی تھی، ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ ہر رپورٹ یہی کہہ رہی ہے کہ آپ کا ماں بننا بہت مشکل ہے مگر اللہ کے نزدیک کچھ مشکل نہیں، بس آپ اب ڈاکٹر نہیں اللہ کا دامن تھام کر بیٹھ جائیں۔ گھر پہنچتے پہنچتے حمنہ کی مایوسی غصے اور شکایت میں بدل چکی تھی۔

گھر پہنچ کر اس نے بیگ ایک طرف ڈالا اور فائل دوسری طرف، دوپٹہ اتار کرکہیں پھینکا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ خالد مجھے ایک بات بتائیں، ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے، صورت شکل بھی اچھی ہے، خاندان اچھا ہے، دولت ہے، تعلیم ہے، ہم ایک بچے کی اچھی طرح پرورش کر سکتے ہیں۔ پھر اللہ میاں ہمیں کیوں اولاد نہیں دیتا۔ اور جن کے پاس کھانے کو نہیں ہے، وہاں ان چاہے بچے ہر سال پیدا ہورہے ہیں۔ ایک لائن لگی ہوئی ہے اور ایک میں ہوں۔ میں نے تو ایک روز اپنی امی اور آپ کی امی سے فون پر معافی بھی مانگ لی تھی کہ کبھی کچھ برا لگا ہو تو معاف کر دیں، شائد اسی وجہ سے اللہ ہمیں یہ نعمت نہیں دے رہا۔ ماں کو ناراض نہیں کرنا چاہئے نا۔ بتایئے خالد میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا!!!

حمنہ میری جان! یہ اللہ کی مصلحت ہے ہم اس میں کیا کر سکتے ہیں

کر سکتے ہیں، بالکل کر سکتے ہیں

حمنہ کیا ہوگیا ہے، کیسی باتیں کر رہی ہو۔ چلو ہم کچھ دنوں کے لیے کراچی چلتے ہیں، تمہارا دل بہل جائے گا۔

حمنہ یہ سن کر کچھ دیر خلاؤں میں گھورتی رہی پھر خالد کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر بولی۔ خالد میری کوکھ سے اگر کوئی بچہ جنم نہیں لے سکتا تو ہم ایک بچہ گود تو لے سکتے ہیں، وہ مجھے امی کہہ کر پکارے گا تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔ ہم کراچی چلیں گے۔ اور میں کسی بہن بھائی کا بچہ نہیں لونگی، مجھے زکوۃ خیرات، احسان کی اولاد نہیں چاہئے، ہم کراچی میں ایدھی ہوم سے بچہ گود لے لیں گے۔ خالد آپ ایسا کرینگے نا میرے لیے۔ خالد کو حمنہ کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا تھا۔ مگر انہوں نے اُس کو ٹالنے کے لیے وعدہ کیا کہ جب کراچی جائیں گے تب ایسا ہی کرینگے۔

☆......☆......☆

چند روز بعد خالد نے دفتر سے چھٹی لی اور حمنہ کو لے کر کراچی آگئے، مگر کراچی آکر انہیں احساس ہوا کہ انہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا، کلفٹن پر ان کے والدین کے گھر کا راستہ ایدھی ہوم کے سامنے سے جاتا تھا جہاں باہر ایک جھولہ بھی رکھا ہوا تھا۔ حمنہ کی ضد بڑھ گئی تھی اور سب کا یہی خیال تھا کہ حمنہ کی صحت اور گھر کے سکون کے لیے انہیں ایک بچہ گود لے لینا چاہئے۔

آخر ایک دن حمنہ اور خالد ایدھی ہوم چلے ہی گئے، وہاں ان کو ایک تین سال کا پیارا سا گول مٹول بچہ بہت اچھا لگا، حمنہ کا خیال تھا کہ ہمیں اسی بچے کو گود لے لینا چاہئے۔ اس بچے کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا سب اسے گڈا کہہ کر پکارتے تھے۔ کیونکہ تھا بھی وہ بالکل گڈے جیسا۔ ایک حادثے میں گڈے کے امی ابا یا وہ جن کے بھی ساتھ تھا، اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور صرف اللہ کی رحمت سے یہ بچ گیا تھا، کوئی اسے لینے بھی نہیں آیا تھا، اور یہ بچہ ایدھی ہوم میں رہ رہا تھا، حمنہ کا خیال تھا کہ یہ بچہ صرف اسی کے

لیے بچایا گیا ہے، ورنہ وہ لوگ کراچی کیوں آتے ملک سے باہر بھی جا سکتے تھے۔

ایدھی والوں نے بتایا تھا کہ کاغذی کارروائی پوری ہونے اور آپ کے بارے میں تحقیق کرنے میں کچھ وقت لگے گا، پھر آپ آ کر اس بچے کو لے جایئے گا، بچہ کسی کو بھی گود دینے سے پہلے ہمارا اطمینان ضروری ہے۔ اسلام آباد واپس آنے سے پہلے ایک دن حمنہ اکیلے ہی ایدھی ہوم چلی گئی، وہ گڈے کے لیے بہت سارے کھلونے اور کپڑے لے کر گئی تھی۔ اس نے وہاں جا کر گڈے کو گلے لگا کر بہت پیار کیا اس کے کپڑے بدلوائے، اس کے ساتھ کھانا کھایا، اس کے ساتھ بیٹھی کھیلتی رہی، اس کو لگا جیسے اس کے اندر سب کچھ تبدیل ہو رہا ہے اب وہ پہلے جیسی حمنہ نہیں رہی ہے، ایک اطمینان اس کے اندر اتر گیا تھا، اسے ماں ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔

☆......☆......☆

حمنہ اور خالد واپس اسلام آباد آ گئے، حمنہ کی نظریں دروازے پر ہوتیں یا فون پر، نہ جانے کب خبر آ جائے اور انہیں کراچی جانا پڑے، اپنے بیٹے کو اپنے پاس لانے کے لیے۔ آخر ایک دن یہ خوش خبری انہیں مل ہی گئی کہ حمنہ اور خالد ہر تحقیق تفتیش میں پورے اترے ہیں اور وہ اب بچے کو آ کر گود لے سکتے ہیں۔ یہ خبر سن کر حمنہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ مگر طبیعت اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ کراچی جا سکے۔ خالد جو حمنہ کو دیکھ دیکھ کر جیتا تھا، اس کی خوشی میں خوش تھا اور اب خالد کے اسرار پر وہ ڈاکٹر کے پاس جا رہی تھی، اور شائد اس لیے بھی کہ انہیں بتا سکے کہ وہ ایک بچہ گود لے رہے ہیں۔ ڈاکٹر کی کلینک میں داخل ہوتے ہی، ڈاکٹر نے حیرت سے حمنہ کو دیکھا، اس کے چہرے پر مامتا پھیلی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے خالد کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا، حمنہ بہت خوش لگ رہی ہے

حمنہ نے فوراً جواب دیا۔ اس لیے کہ ہم ایک پیارا سا بچہ گود لے رہے ہیں

ڈاکٹر: کیا یہی بتانے آئی ہیں آپ

خالد: یہ خوش تو بہت ہیں مگر طبیعت بہت سست ہو رہی ہے، سارا دن نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے بس بستر پر لیٹ رہنا چاہتی ہے۔

ڈاکٹر نے حمنہ کا چیک اپ کیا اور کچھ دوائیں لکھتے ہوئے سر اٹھا کر انتہائی سنجیدگی سے بولی: یہ بچہ آپ کے لیے بہت مبارک ہے

حمنہ: وہ کیسے؟

ڈاکٹر: کیونکہ آپ سچ مچ ماں بننے والی ہیں۔

یہ اتنی بڑی خبر تھی کہ خالد کو احساس ہی نہیں رہا کہ وہ ڈاکٹر کے کلینک میں ہے اس نے اٹھ کر حمنہ کو گلے لگا لیا۔

خالد کی خوشی دیدنی تھی۔

''ڈاکٹر...... اللہ نے ہماری دعائیں سن لیں۔ پتہ نہیں کتنی راتیں! ہم نے رو کر گزاری ہیں۔''

مگر حمنہ اپنی جگہ پر سن بیٹھی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ اسے آواز دی۔ حمنہ!'' تب وہ چونکی۔

''خالو یہ بچہ ہمارے لیے مبارک ہے۔ میں اس کا نام سعد رکھوں گی اور کب تک کراچی جا سکوں گی۔''

وہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں بول رہی تھی۔

''بس ایک ہفتے یہ دوائیں کھا لیں تو اس کے بعد کراچی جا سکتی ہیں، اور ہاں اپنے کھانے پینے کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔'' ڈاکٹر نے مسکرا کر اپنی بات مکمل کی۔

گھر واپس جاتے ہوئے دونوں ہی اپنی اپنی سوچ میں گم تھے، حمنہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی تو خالد کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے وہ انتہائی تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا۔ اس نئی خبر نے اسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔

☆......☆......☆

ابھی صرف تین دن ہی گزرے تھے کہ خالد بہت سی چیزیں لے کر گھر آیا تو حمنہ کا پہلا سوال یہ تھا کہ کیا کراچی کی سیٹیں بک کروا لیں، ہم کب کراچی جائیں گے، سعد کو لے کر آئیں گے۔ مگر خالد سنی ان سنی کر کے تھیلوں میں سے چیزیں نکالنے لگا۔ یہ دیکھو یہ سب چیزیں میں تمہارے لیے لایا ہوں تم ان کو دیکھ کر خوش رہو گی تو آنے والا بچہ بھی اچھا موڈ لے کر پیدا ہوگا۔ ورنہ تمہاری طرح سڑو اور ضدی ہو جائیگا۔

حمنہ مسکرائی۔ اچھا آپ یہ سمجھتے ہیں۔ میں سڑو ہوں، سڑو تو آپ ہیں، کئی دن سے منہ بنا ہوا ہے۔ اچھا بتایئے نا ہم کراچی...... ''اور اس کی بات نامکمل ہی رہ گئی۔ خالد نے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور اطمینان سے بولا کہ ہم کراچی نہیں جا رہے ہے۔

حمنہ: کیوں، کیا وہ لوگ سعد کو لے کر یہاں آجائیں گے۔ حمنہ نے حیرت سے سوال کیا۔

''نہیں، نہ وہ یہاں آرہے ہیں اور نہ ہم جا رہے ہیں۔ ہم بچہ گود نہیں لیں گے۔ خالد نے قطعیت سے جواب دیا۔

''مگر کیوں؟ پہلے تو آپ راضی ہو گئے تھے، اب کیا ہو گیا۔''

''اس لیے کہ اب اللہ ہمیں ہمارا بچہ دے رہا ہے، اس لیے کسی دوسرے بچے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کس نے کہا ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت ہے، وہ دوسرا بچہ نہیں ہے وہ میرا پہلا بچہ ہے، اور یہ دوسرا ہے جو آپ کا ہے۔ میں نے کہا نا کہ سعد میرا پہلا بچہ ہے۔ مجھے بتائیں کہ کون دوسرا بچہ آنے پر پہلے بچے کو گھر سے نکال پھینکتا ہے۔ سعد نے مجھے بتایا کہ ماتا کیا ہوتی ہے کیسے انسان کو اندر سے بدل دیتی ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ اس گھر میں آئے گا۔ ورنہ صرف آپ، اپنی اولاد پالیے گا۔ حمنہ بے تکان بولے جا رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل برس رہے تھے یہاں تک کہ خالد نے آگے بڑھ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ حمنہ ہوش میں آؤ۔ کیا ہو گیا ہے؟

اور پھر یہ روز کا معمول ہو گیا، کھانے پر، ناشتے پر، گاڑی میں، ان کے درمیان سعد کو لانے اور نہ لانے پر بحث چھڑ جاتی۔ راتوں کو جاگ کر حمنہ کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ چکے تھے، وہ اکثر خالد کو سوتے سے اٹھا کر سوال کرتی کہ دروازے کی بیل بجی ہے۔ خالد ناراض ہوتا کہ مجھے صبح آفس جانا ہے تم میری نیند کیوں خراب کرتی ہو۔ خالد کی ڈانٹ سن کر حمنہ رونے لگتی اور خالد کا دل چاہتا کہ مجنوں بن کر صحرا میں نکل جائے، مگر ایسا ممکن نہیں تھا، لیکن ایک چیز ممکن تھی جو خالد کر سکتا تھا سو اس نے دوسرے کمرے میں سونا شروع کر دیا۔ خالد کا خیال تھا کہ شاید ایسا کرنے سے حمنہ مان جائے گی، مگر اس عمل سے جہاں حمنہ کو بے حد دکھ ہوا وہیں اس کا ارادہ مزید پختہ ہوتا چلا گیا۔

ایک رات سوتے سوتے حمنہ کی آنکھ کھلی تو اسے لگا کہ کوئی دروازہ پیٹ رہا ہے اور ماما، ماما پکار رہا ہے۔ حمنہ تیزی سے دروازے کی طرف بھاگی، دروازہ کھول کر دیکھا تو وہاں تنہا سعد کھڑا تھا، کوئی دوسرا نہیں تھا، اتنی رات گئے یہ کیسے یہاں آگیا، حمنہ نے سوچا۔ اس نے دیکھا سعد کے ہاتھوں میں ایک بڑے بڑے گھنگھریالے بالوں والی پیاری سی گڑیا ہے۔ وہ گڑیا سعد نے حمنہ کی طرف بڑھا دی اور حمنہ نے گڑیا کے ساتھ اسے بھی گلے سے لگا لیا۔ حمنہ رونے لگی، میرا بچہ، میری جان، میں کتنا تڑپ رہی تھی۔ سعد اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا کہ اچانک خالد بھی دروازے پر آگئے۔ حمنہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ حمنہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''خالد...... سعد خود بخود اس وقت......''

''ہوش میں آؤ حمنہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے خالد نے کاندھوں سے پکڑ کر حمنہ کو اٹھایا مگر وہ بے ہوش ہو کر خالد کی بانہوں میں جھول گئی۔

دو دنوں تک حمنہ ہوش وخرد سے بیگانہ رہی خالد نے آفس سے چھٹی لے کر بہت خدمت کی وہ غور سے اُس کی بند آنکھوں کے نیچے پڑنے والے حلقوں کو دیکھتے رہے اور پھر خود ہی فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئے۔ حمنہ کی طبیعت کچھ سنبھلی تو خالد نے اُس کراچی چلنے کی خوش خبری سنا دی۔

''خالد آپ سچ بول رہے ہیں نا۔'' وہ خوشی سے بے قابو ہو رہی تھی۔

''ہاں حمنہ ہم کراچی جا رہے ہیں اور اب سعد کو لے کر ہی واپس آئیں گے۔'' خالد نے حمنہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ اور حمنہ نے مطمئن ہو کر خالد کے کاندھے پر اپنا سر ٹکا دیا۔

☆......☆......☆

ڈور بیل کی آواز نے حمنہ کو چونکا دیا اور وہ ماضی سے نکل کر حال میں آ گئی، مری کی پہاڑیوں پر دھند کم ہو چکی تھی، سامنے میز پر سلائس اور جیم خالد کب رکھ کر گئے اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا، وہ پھر نہر کنارے کھلتے پھولوں کو دیکھنے لگی۔

''حمنہ!'' خالد نے چائے کے مگ میز پر رکھتے ہوئے آہستہ سے حمنہ کو آواز دی۔

حمنہ نے پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ آج حمنہ کے چہرے پر فرشتوں سی مسکراہٹ تھی، مکمل ہو جانے کا احساس تھا

''خالد...... میری زندگی میں اتنی خوشیاں بھر دینے کے لیے میں نے ہمیشہ آپ کا شکریہ ادا کیا ہے اور آج بھی کر رہی ہوں، اگر آپ سعد کو نہ لاتے تو یہ زندگی شائد ایسی نہ ہوتی جیسی ہم چاروں نے گذاری۔''

اور انشاء اللہ مزید گذاریں گے اور اس سے بھی اچھی۔ ابھی بہت بار شکریہ ادا کرنے کے موقعے آئیں گے۔'' خالد نے مسکرا کر کہا۔

''مگر ایک سوال کا جواب آپ نے آج تک نہیں دیا کہ آپ اس طرح اچانک سعد کو لانے پر تیار کیسے ہو گئے تھے۔''

''تمہاری محبت میں۔'' حمنہ نے مسکرا کر خالد کو دیکھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ حقیقت کچھ اور ہے مگر بحث کر کے زندگی میں کڑواہٹ گھولنے کی قائل وہ کبھی نہ تھی اس لیے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

''خالد دروازے پر کون تھا؟''

''زبیر اور آمنہ تھے اور صرف یہ بتانے آئے تھے کہ ہم پریشان نہ ہوں۔ یہ سب شام تک آئیں گے اور رات کا کھانا ہمارے ساتھ گھر پر کھائیں گے۔''

حمنہ یہ سن کر ایک دم پریشان ہو گئی۔

''ارے تو پھر اتنے لوگوں کا انتظام!!!

''یہ لسٹ دے گئے ہیں، کہ یہ آرڈر ہو چکا ہے اور اگر کچھ مزید بنوانا ہو تو انہیں بتا دیں، کھانا پہنچ جائے گا۔ ذمہ داری سمجھنے لگے ہیں، اور سب سے بڑھ کر تمہیں آرام دینا چاہتے ہیں۔''

حمنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خالد یہ بچے اچانک سے کتنے بڑے ہو گئے، اور ہمیں پتہ ہی نہیں چلا، ہم تو ابھی تک انہیں ناسمجھ اور لاابالی ہی سمجھتے ہیں۔

''تم صحیح کہہ رہی ہو وقت بہت تیزی سے آگے بڑھ گیا ہے حمنہ بیگم......''

☆......☆......☆

دھوپ تیز ہو چلی تھی اس لیے حمنہ اور خالد اند آ گئے جہاں شفاف گلاس وال سے باہر کا منظر مزید نکھر کر نظر آ رہا تھا

''تمہیں یاد ہے جب عنایا پیدا ہوئی تھی تو سعد اس کے لیے میرے ساتھ جا کر گڑیا خرید کر لایا تھا اور

تم نے کہا یہ ویسی ہی ہے جو تم نے خواب میں دیکھی تھی۔''

''اور تب ہی ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ تم دونوں بہن بھائی ہو، ہم کہیں گے تم دوست ہو، سب سے اچھے دوست اور اللہ نے تمہیں ایک دوسرے کے لیے بھیجا ہے۔

''اور جب یہی بات ہم نے عنایا کے عقیقے کے وقت بڑے ابا اور مولوی صاحب کو بتائی تھی تو انہوں نے کتنی تعریف کی تھی اور شاباش دی تھی۔ کہ تم دونوں کا یہ فیصلہ بہت صحیح اور شریعت کے عین مطابق ہے

''حالانکہ ہم یہ بات اتنی تفصیل سے تب جانتے بھی نہیں تھے کہ گود لیے بچے چاہے کتنے بھی پیار سے رہیں سگے بہن بھائی نہیں ہو سکتے۔ اور ان کی اس بات نے ہم سب کی ہی زندگی کتنی آسان کر دی تھی

''اور آج سعد اور عنایا ایک دوسرے کے ساتھی بن گئے ہیں تو یہ بھی اسی لیے ہوا نا۔ اللہ کی رسی کو تھاما تو زندگی آسان ہو گئی۔

''جب سعد کو ہم نے گود لینا چاہا تھا تب کیا معلوم تھا کہ عنایا بھی ہمیں مل جائے گی۔ اللہ اپنے بندوں سے کتنی محبت کرتا ہے، کتنی زیادہ محبت۔

حسنہ کی آنکھوں سے شکر کے آنسو جاری ہوئے تو خالد نے اس کا دل بہلانے کے لیے دوسری بات چھیڑ دی۔ یاد ہے تمہیں۔ جب سعد نے ایک دن آ کر بتایا تھا کہ برابر والی آنٹی کہہ رہی تھیں کہ تم عنایا کے بھائی نہیں ہو اور نہ ان کے بیٹے ہو تو وہ ان سے لڑ کر اور ان کے بال نوچ کر آ گیا تھا۔ گھر آ کر اس نے بتایا تھا کہ۔ ماما، آنٹی حبیب کہہ رہی تھیں عنایا تمہاری بہن نہیں ہے، میں نے کہا ہاں نہیں ہے اور انہوں نے کہا کہ تم ان کے بیٹے بھی نہیں ہو اور اس بات پر مجھے غصہ آ گیا۔ اور پھر اس نے کیا کہا تھا کہ۔ میں نے ان کے بال نوچ لیے تھے اور ان سے کہا تھا کہ میں اپنی ماما کا بیٹا ہوں میں اپنی ماما کا بیٹا ہوں، اس بات پر مسز حبیب ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ اور پھر گھر آ کر انہوں نے شکایت بھی کی تھی۔

کتنی دیر تک دونوں مسز حبیب کی حالت یاد کر کے ہنستے رہے، ان کے بلو ڈرائی کیے ہوئے بال چڑیا کا گھونسلہ بن گئے تھے۔

''آپ کو معلوم ہے عنایا کے پاس وہ گڑیا آج تک موجود ہے جو سعد اس کے پیدا ہونے پر لایا تھا۔''

خالد نے حیرت سے حسنہ کو دیکھا۔ یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی

''جو چیز ازل سے لکھ دی گئی ہو ہم اس سے فرار حاصل نہیں کر سکتے۔ کہاں ہم ایک بچے کی تمنا کرتے تھے پھر اللہ نے ہمیں دو بچے دے دیے۔ اور اس خوف کو بھی دل سے نکال دیا کہ داماد کیسا ملے گا، اور یہ ڈر بھی کہ ہماری بہو ہمارے ساتھ کیا سلوک رکھے گی اور کہیں ہمارے بیٹے کو ہمارے پاس سے نہ لے جائے۔ بچپن سے ایک ساتھ بڑے ہوئے، ایک خیال، ایک محبت۔

☆......☆......☆

ڈرائینگ روم کی گلاس وال سے دونوں باہر دیکھ رہے تھے دھوپ پورے ٹیرس سے ہوتی دوسرے کونے تک پہنچ رہی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے اُن کی زندگیوں میں چار سو خوشیاں ہی خوشیاں تھیں روشنی ہی روشنی تھی۔

''چلو اٹھو حسنہ بے شک کھانا سب باہر سے آ رہا ہے مگر کچھ انتظامات تو ہمیں کرنے ہی ہوں گے۔'' دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں محبت سے دیکھا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ سورج دور افق کے پار ڈوب گیا۔

☆☆......☆☆

لوزر

''ایسا نہیں ہے علیز ے..... تم کسی بھی ایک چیز کو پوری طرح توجہ نہیں دے پاتی ہو، تمہاری عادت میں ہے کہ تم بے چین رہتی ہو، برا نہ منانا، تمہیں سنجیدہ ہونا ہوگا اور اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہیں صرف شہرت حاصل کرنا ہے تو..... تو اس کے لیے تمہیں......

''اچھا کہانی بناؤ۔'' اُس نے اپنے تئیں نہایت عقلمندی سے سوال داغا تھا۔

''..... کہانی بناؤ..... کمال ہے بھئی..... کہانی کہی ہوتی ہے یار! یہ بن کیسے سکتی ہے۔''

''بن بھی جا سکتی ہے.....'' سے جتنا آتا تھا اُس کے مطابق ایسا ہی تھا۔

''جب تصویر بن سکتی ہے تو کہانی کیوں نہیں بن سکتی..... تم کوشش تو کر کے دیکھو۔''

''..... تم کہتی ہو تو کوشش کر کے دیکھتا ہے۔'' اُس نے یوں گلا کھنکارا جیسے ابھی کوئی راگ الاپنے جا رہا ہو۔ وہ بغور اُسے دیکھ رہی تھی اسے یوں دیکھتا دیکھ کر وہ پھر جھینپ سا گیا۔

''اب یوں ہی دیکھتی رہو گی ناں تو کم از کم کہانی تو نہیں بن سکتی۔'' اس نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

''اوکے اوکے میں تمہاری جانب بالکل نہیں دیکھ رہی..... اب بناؤ۔'' اس نے اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔

''اچھا..... چلو ایسے ہی سہی..... کہانی بن رہی ہے..... ایک تھی چڑیا..... اور ایک تھا چڑا.....''

''یہ کیا بکواس ہے شرافت.....'' وہ چڑ ہی گئی۔

''شرافت علی.....'' اس کو ہمیشہ اپنے ادھورا نام پکارنے پر چڑ سی تھی۔

''اُف توبہ..... شرافت علی..... یہ کیا کہانی ہوئی۔'' وہ زچ ہو کر بولی تھی۔

''بھئی ہمارے بچپن میں تو ہماری اماں ہر رات اسی طرح کہانی شروع کرتی تھی۔ پھر یقین جانو..... چڑیا چڑے سے کہانی پنساری کی دکان..... ڈھول کے حساب اور ابا سے چھوٹی موٹی لڑائی کی ڈھکی چھپی تفصیلات تک جا پہنچی تھی اور اماں بیچاری یہ سمجھتی تھیں کہ میں چڑے چڑیا کی انٹرویل سے پہلے کی کہانی سن کر ہی سو گیا ہوں۔ اور تم جانتی ہو کہ اماں کو کہانیاں آتی ہی نہیں تھیں۔ وہ تو بس میرا دل بہلانے کے لیے یوں ہی شروع کر دیتی تھیں چڑیا لائی دال کا دانہ..... چڑا لایا چاول کا دانہ..... دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی.....

وغیرہ وغیرہ......''

شرافت علی کی شرارتی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

اس کے چہرے پر اس کی یہ فضولیات سن کر اس قدر کی کوفت سوار ہو چکی تھی۔ جیسے گلی کے چوکیدار کی...... جو ہر مہینہ دروازے پر دستک کرتا اور اماں جواب میں کہہ دیتی...... دس تاریخ کے بعد آنا...... شرافت علی کو آج تک اس کا وہ زہرخند چہرہ یاد رہا تھا۔

''پھر تم یہ کہانیاں...... افسانے وغیرہ کیسے لکھ لیتے ہو...... مطلب کچھ تو پتہ چلے ناں۔''

''تو گویا تم میری سراغ رسانی پر مامور ہو کہ میں کہانیاں کہاں سے اسمگل کرتا ہوں۔'' اب برا منانے کی باری اُس کی تھی۔

''ہاں یہ ہی سمجھ لو......'' علیزے نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

''کباڑ کی دکانیں کھنگالتا ہوں۔ پرانی پرانی کتابیں اور ڈائجسٹوں سے کہانیاں چراتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''دیکھا...... میرا اندازہ بالکل غلط نہ تھا۔ میرا بھی یہ ہی خیال تھا کہ تم ایسا ہی کرتے ہو گے۔''

''اے جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔'' وہ اچھل ہی پڑی تھی۔

''اچھا اچھا...... اب سمجھا...... تمہیں فواد گروپ نے میری مخبری پر لگایا تھا۔ کمال ہے یار میں سمجھا کہ تم واقعی میرے افسانے...... میری کہانیوں سے متاثر ہو کر......'' اس نے غصے سے زور سے سر جھٹکا۔

''ارے نہیں بابا...... میں ریئلی تمہاری اسٹوریز

پسند کرتی ہوں۔ سر بھی تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے۔ کمال ہے سر اعظم تو کسی کو گھاس بھی نہیں ڈالتے۔"

"تو تم اس گھاس میں حصہ بٹورنے آئی ہو۔" "شرافت علی....." اس کے دماغ پھر گھوم گیا۔

"تم میری انسلٹ کر رہے ہو..... یہ ہی ڈائیلاگ ہوگا اس کے آگے....." وہ پٹ بولا۔

"آخر اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو۔" اس نے تنک کر پوچھا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم جو سارے کالج میں اپنا کیمرہ سنبھالے گھومتی رہتی ہو..... تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو..... بولو۔"

"پروفیسر سحر انصاری کا کہنا ہے کہ جانور بولتے ہیں اور انسان کہتے ہیں۔" اس نے بڑی ادا سے اپنی آنکھیں گھماتے کہا۔

"اچھا اچھا..... فرمائیں کہ مسماۃ علیزے آپ اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہیں۔" اس نے نہایت مودب ہونے کی نہایت فضول اداکاری کی۔

"دیکھو شرافت علی!" اُس نے ایک پُرسکون سانس لیا اور دور خلاؤں میں گھورتے کہنے لگی جیسے وہ بہت بڑی فلاسفر ہو۔

"دراصل میں ایک فوٹو گرافر ہوں..... پیدائشی فوٹو گرافر..... میرے والد بھی یہ ہی کام کیا کرتے تھے..... ان کا بیٹا تو کوئی ہے نہیں لہٰذا..... ان کا یہ سارا شوق قدرتی طور پر مجھ میں جذب ہو گیا۔"

"اجی واہ واہ..... کیا کہنے آپ کی تصویر گرافی کے..... بی بی! ابھی تک آپ نے کتنے کمال کی تصاویر اُتاری ہیں..... سوائے کلاس کی ساری فیشن زدہ لڑکیوں کے اتنے سیدھے پوز کی..... ان درختوں اور ابھرتے چڑھتے سورج کی..... اور مان لو کہ تم اس میں بھی فیل ہی رہی ہو۔"

چند لفظوں میں اس نے اُس کی کارکردگی کو صفر قرار دیا۔

"اوکے..... میں تو فیل ہوں ہی اپنے بارے میں کہو شرافت علی....." اس کی چھوٹی سی ناک غصے سے سرخ ہو گئی۔

"ارے تم تو سچ میں ناراض ہو گئیں..... مذاق کر رہا تھا یار!"

اس نے منانے کی کوشش کی لیکن وہاں ہنوز ناراضی طاری تھی۔

"اچھا بابا..... بتاؤ کہ کیا کروں..... کان پکڑوں کہ مرغا بنوں۔" اس نے کان پکڑ لیے اور مسکین سی صورت بنالی..... وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"علیزے! تم بھی ناں....." وہ بھی مسکرا دیا۔

"ویسے ایک بات کہوں۔"

"فرمائیں۔"

"تم کان پکڑے زیادہ اچھے لگتے ہو۔"

"علیزے کی بچی....." وہ مسکراتے ہوئے بولا اور دونوں کے قہقہے ابھرے۔

ان دونوں میں کچھ ایسا مشترک تو نہ تھا پھر بھی دونوں میں دوستی تھی۔ شرافت علی ایک عام سے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا وہ کرائے کے مکان میں رہتے والد صاحب کی پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کرتے چھوٹی سی فیملی تھی۔ تین فرد زندگی آسان گزر رہی تھی۔ شرافت علی اپنے گھریلو حالات سے واقف تھا۔ خواہشات کو محدود کر کے زندگی کے فٹ پاتھ پر کیسے چلا جاتا ہے یہ بچپن میں اسے دادا جی نے بارہا سکھایا تھا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ شرافت علی کے بعد ان کے پوتا پوتی اس دنیا میں آ کر ان کے بیٹے کے بجٹ پر اثر انداز ہوں گے لہٰذا انہوں نے پہلے ہی سپوت کی نس نس میں پیوست کر دیا تھا

جو خدا کو منظور کہ شرافت علی کے بعد پھر اس گھر میں کوئی اور نہ آیا۔

شرجیل، عمران، فیضان، ارسلان نجانے کتنے ہی نام سوچ رکھے تھے اماں نے...... پر دادا جی کو اپنے والد سے بہت پیار تھا بس ان کے نام پر ہی اس کا نام شرافت رکھا گیا تھا۔ یقیناً انہوں نے بھی سوچا ہوگا کہ چلو دوسرے یا تیسرے بچے کا نام رکھ لیں گے یہ......'' خاموشی ہی خاموشی...... پھر کوئی صدا نہ ابھری...... شرافت علی کے شوق بھی بڑے عجیب تھے۔ چھوٹی سی عمر میں بڑی بڑی کتابیں پڑھ ڈالیں پانچویں جماعت کا بچہ سیارہ ڈائجسٹ لے کر ستارہ کے دسترخوان تک کھنگال ڈالتا...... شاید اسی پڑھنے کی عادت نے اسے قلم پکڑ کر لکھنا سکھادیا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں نگارشات چھپنے لگی، پہلے بچوں کے صفحات پر پھر آہستہ آہستہ بڑوں کے رسالوں اور اخبارات تک...... اب میاں امجد علی نئے لوگوں سے اپنا تعارف یہ کہہ کر کرواتے کہ میں شرافت علی کا والد ہوں۔ پہلے اسکول اور پھر کالج میں اس کی شہرت جلد عام ہوگئی اس کی اسی شہرت نے علیزے مغل کو اس کے نزدیک کردیا تھا۔ اس کے باپ کا خاندانی کام ماربل کا تھا لیکن وہ شوقیہ فوٹو گرافر تھے۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی لہٰذا یہ مہنگا شوق پلتا رہا اور ان کی بڑی بیٹی علیزے میں منتقل ہوگیا۔ سلیم مغل کوئی مشہور فوٹو گرافر تو نہ تھے بس یوں ہی اِدھر اُدھر جاننے والے مفت میں تصاویر اتروانے ان کی تعریف کردیتے اور وہ خوش ہوکر کھٹا کھٹ تصاویر بنا ڈالتے۔ علیزے سے چھوٹی شانزے کو اس سے ذرا رغبت نہ تھی اس کے خیال میں یہ وقت ضائع کرنے والا شوق ہے۔

''ویسے میں بھی شانزے کے خیال سے متفق ہوں۔''

''کمال ہے شرافت علی؟ تم اور آرٹ کے مخالف......''

''ایسی بات نہیں ہے علیزے! تم اس مشغلے کو دل سے نہیں بلکہ وقت گزاری کے لیے اختیار کیے ہوئے ہو۔''

''میں چاہتی ہوں کہ لوگ مجھے بھی پہچانیں...... کہ میں اچھی تصویریں اتارتی ہوں۔''

''بھئی تو تم باقاعدہ کوئی کورس کرلو...... پروفیشنل فوٹو گرافی کے بہت سے کورسز ہورہے ہیں۔'' اس کا مشورہ معقول تھا لیکن اس کی سمجھ نہ آیا۔

''وہ جس الف ب کے چکر میں پڑتے ہیں ناں...... وہ مجھے پسند نہیں اور پھر...... سچی بات یہ ہے کہ ٹائم بہت برباد ہوتا ہے...... پڑھائی کو وقت دینا ہوتا ہے...... اب میں تمہاری طرح تو ہوں نہیں کہ اچانک کوئی خیال ذہن میں کوندا اور لکھ ڈالا ایک شاہکار افسانہ......'' اس نے چپس کا پیکٹ اپنے بیگ سے نکالا اور اسے کھولتے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''ایسا نہیں ہے علیزے...... تم کسی بھی ایک چیز کو پوری طرح توجہ نہیں دے پاتی ہو...... تمہاری عادت میں ہے کہ تم بے چین رہتی ہو...... برا نہ منانا...... تمہیں سنجیدہ ہونا ہوگا اور اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہیں صرف شہرت حاصل کرنا ہے تو...... تو اس کے لیے تمہیں کوئی ایسا ٹریک پکڑنا ہوگا کہ جس سے لوگ دنگ رہ جائیں۔''

''ایں......'' اس نے ایک چپس کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اس کے خیال کے کینوس پر بہت سے لوگ حیرت زدہ سے نظر آئے۔

''ہاں...... لوگ حیران رہ جائیں...... کیا درد ہے اس تصویر میں......''

فضا میں چپس کے کڑ کڑانے کی دھیمی سی آواز

گونجی۔ وہ سارے لوگ اس کی تصاویر دیکھ رہے تھے۔

''تصویر میں درد...... یہ کیسے ہوسکتا ہے......''

وہ گم صم سی رہ گئی اور مشینی انداز میں چپس کا پیکٹ اس کے سامنے کیا۔ وہ بھی اپنی سوچوں میں غلطاں تھا مشینی انداز میں اُس کا ہاتھ بھی چپس کے پیکٹ کی جانب بڑھا۔

''ہاں تصویر بھی بولتی ہے...... اس کے بھی رنگ ہوتے ہیں...... وہ ہنستی بھی ہے...... مسکراتی بھی ہے...... روتی بھی ہے...... سسکتی بھی ہے...... وہ دل دہلا دیتی ہے...... روح بے چین کر دیتی ہے۔ سوال اٹھاتی ہے۔'' اُسے بے شمار انگلیاں اٹھتی دکھائی دیں۔

''کیا......؟'' وہ یوں ہی بولی۔

''ابے یار! یہ ہی کہ کیا خوب تصویر بنائی ہے مصور نے۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''لیکن شرافت علی...... میں مصور نہیں ہوں ناں یار۔''

سارا تخیل کھٹ کر کے جیسے بکھر سا گیا ورنہ وہ تو نجانے کہاں سے کہاں جا پہنچی تھی۔

''علیزے...... میرا خیال ہے کہ تم ماریہ، فائزہ اور سویرا کی تصویریں بنالو...... آج ماریہ نے پنک کلر کی بڑی اچھی لپ اسٹک لگائی ہے اور فائزہ نے ہلکا ہلکا میک اپ کر رکھا ہے لگتا ہے آج اس کا ہاتھ ذرا زیادہ چل گیا ورنہ وہ ہر روز یہ ہی شو کرتی ہے کہ قدرتی طور پر ہی اُس کا رنگ پنک ہے۔ ہونٹ گلابی ہیں...... مجھے سب پتہ ہے بہر حال ان کا گروپ آج بہت چمک رہا ہے...... جاؤ جلدی جاؤ اس سے پہلے کہ وہ کینٹین میں جا کر اپنے نیچرل میک اپ کا بیڑہ غرق کر کے پھر دوبارہ نیا پینٹ کر دیں......'' وہ طنز کر رہا تھا۔

''شرافت علی......!''

اس کے اس انسلٹ کر دینے والے انداز پر وہ سلگ اٹھی پر کیا کرتی...... اس کے اتنے **اچھے اچھے** خیالات کی وہ تصویریں کیسے اپنے کیمرے کی آنکھ میں قید کرتی...... اس کی خوبصورتی افسانوی باتیں اس کے اردگرد سے کہیں گزر جاتیں تھیں۔

اس دن بہت عجیب ہوا سلیم مغل کے ایک دوست اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر ان کے در پر آئے' لڑکے نے اسے کسی فنکشن میں دیکھا تھا اور یوں بات شادی تک آپہنچی تھی۔ اسے تو پتہ ہی نہ چلا کہ کیا ہو رہا ہے جب وہ لوگ باقاعدہ طور پر آئے تو پتہ چلا کہ یہ تو اسی کے لیے ہلچل سی مچی تھی گھر بھر میں...... فیروز اچھا بھلا انسان تھا اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز...... باپ کا بڑا بزنس...... خاندانی وقار اور کیا چاہیے تھا اُسے...... لیکن شرافت علی...... اس کا دل بجھ سا گیا۔

''شرافت علی...... میری بات پکی ہوگئی ہے۔''

مٹھائی کھاتے کھاتے اسے جیسے اچھو سا لگا۔ اس قدر بدذائقہ مٹھائی اس نے پہلے کبھی نہ کھائی تھی اس نے مٹھائی کا ڈبہ بند کیا اور اس کے سامنے رکھا۔

''اچھی نہیں لگی مٹھائی......'' اس نے افسردگی سے پوچھا۔

''نہیں اچھی تھی۔''

فضا میں خاموشی سی چھا گئی۔ اس بے رنگ سی دوستی کا کوئی نام بھی تو نہ تھا۔

''پھر تم...... پڑھائی چھوڑ دو گی کیا؟''

اس نے اپنے جذبات سے مچلتے دل کو سنبھالتے بظاہر اطمینان سے پوچھا۔

''نہیں...... فائنل ایئر ہے شرافت...... ایگزامز میں ابھی ڈیڑھ مہینہ تو رہ گیا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے......'' وہ لاتعلق سا بولا پھر طویل خاموشی کے بعد گویا ہوا۔

''بہت جلدی نہیں کر دیا تمہارے گھر والوں

نے سب کچھ......'' کوفت سی ہو رہی تھی۔
'' ہوں...... صحیح کہتے ہو...... بہت جلدی کر دیا...... مجھے تو پتہ نہیں چلا تھا......''
'' حیرت ہے ویسے کہ تمہاری شادی کی باتیں گھر میں ہو رہی ہوں اور...... تمہیں خبر تک نہ ہوئی ہو...... ہے ناں۔''
اس کے طنزیہ انداز پر وہ کچھ اور افسردہ ہو گئی۔
'' اور اگر مجھے پتہ بھی چل جاتا تو کیا کر لیتی؟''
اس نے اس کی جانب ایک اچٹتی نظر ڈالی۔
'' ہاں ٹھیک کہتی ہو...... ہمارے یہاں لڑکیوں سے کچھ پوچھا نہیں جاتا۔'' وہ زہر خند سا مسکرایا۔
'' تمہیں اچھا نہیں لگا ناں......''
ایک یاس تھی یا آس......
'' نہیں...... ٹھیک ہے...... تمہارے فادر اچھے سمجھدار آدمی ہیں...... اپنے ہم پلہ میں ہی رشتہ جوڑا ہوگا۔''
اس کے سرد رویے نے جیسے اس کے ابھرتے بے معنی جذبوں پر برف سی ڈال دی۔
اور پھر بہت سے دن گزر گئے چڑیا کی شادی ہوگئی وہ اپنے بڑے سرکاری شوہر کے ساتھ سندھ میں سرکاری بڑے سے گھر میں منتقل ہوگئی اور چڑا ایسے ہی اِدھر اُدھر اپنی چڑیا کی جدائی کے غم کو سمیٹتے سمیٹتے سات سمندر پار چلا گیا...... وہی عام سی کہانی...... عام سے لوگ...... عام سے جذبے......
وہ اکثر سوچتا کہ اُس کی زندگی کی کہانی میں اس کے لکھے افسانوں اور کہانیوں کی طرح کوئی ایسا ٹرننگ پوائنٹ نہیں آیا کہ جس نے پڑھنے والے قارئین کی آنکھیں نم کر دی ہوں شاید کہانیوں اور حقیقتوں میں اتنا ہی فرق...... اتنا ہی فاصلہ ہوتا ہے یا شاید اُس کی زندگی کی کہانی...... دوسروں کی زندگیوں کی کہانی کی طرح اتنی خاص نہ ہو...... یا شاید علیز ے اور اس کے بیچ ایسا کچھ تھا ہی نہیں پھر کہانی کیسے بنائی جاتی۔
اس بنانے کے عمل پر غور کرتے کرتے وہ بے ساختہ مسکرا دیتا۔
جاب کرتے کرتے بھی قلم سے رشتہ نہ ٹوٹا تھا' میاں امجد علی گزر گئے تو اس نے اماں کو اپنے پاس کینیڈا بلوا لیا اور پھر اس نے زندگی کے فٹ پاتھ پر اپنی گاڑی سست روی سے ڈال دی۔ جویریہ اچھی بیوی ثابت ہوئی اس کے والدین بھی کینیڈا میں مقیم تھے۔ کچھ عرصے بعد اس کے دو پیارے بچے بھی اس دنیا میں آ گئے یوں اس کی چھوٹی سی فیملی مکمل ہوگئی۔ اس کے قلم کی دھوم اب مغرب کی فضاؤں میں اردو بولنے والوں کے درمیان خوب تھی۔ لوگ اس کی عزت کرتے تھے اس کا ایک مقام تھا معاشرے میں......
اماں کی طبیعت ان دنوں خراب رہتی تھی پاکستان کی یاد انہیں ستانے لگی تو وہ ان کی خواہش پر آفس سے چھٹیاں لے کر بیوی بچوں سمیت پاکستان آ گیا۔ یہ وہ پاکستان نہ تھا جسے وہ تیرہ چودہ برس پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ کراچی کی سڑکیں اب ٹریفک سے کھچا کھچ بھری رہتی' ہر دم کچھ نہ کچھ چھن جانے کا احساس رہتا' پہلے بھی کیبل کی مصروفیات انسانوں کو گھیر لیتی تھیں اور اب بھی برسوں بعد کچھ یہ ہی حال تھا۔
'' بیٹا...... اپنے موبائل اور نقدی وغیرہ گھر ہی چھوڑ کر جانا۔''
'' کیوں خالہ بی......'' اس نے حیرت سے اپنی میزبان خالہ سے پوچھا تھا۔
'' ارے بچے...... اب باہر کھلے عام اتنا مہنگا موبائل لے کر جانا اچھا نہیں...... دن دیہاڑے آ جاتے ہیں لوٹنے۔''
'' ہائے میرا کراچی......'' اس کے دل سے آہ

بلند ہوئی۔

''سوشل میڈیا کا شور کینیڈا میں تو تھا ہی پر یہاں بھی اس کا اثر رسوخ بڑا نظر آتا تھا' لیکن شکر تھا دہشت گردی کی لپیٹ سے پاکستان بڑی حد تک نکل چکا تھا وہ بار بار خدا کا شکر ادا کرتا لیکن چند روز بعد ہی لاہور میں دہشت گردی کی ایک بڑی واردات میں کئی بڑے پولیس افسران سمیت کئی معصوم لوگ اپنی زندگیاں کھو بیٹھے اور پھر چند روز بعد ہی سندھ میں سیہون شریف میں شہباز قلندر کے مزار پر ایک بڑا خود کش دھماکہ ہوا جس نے سب کے دل دہلا کر رکھ دیئے' شیر خوار بچے' جوان' بوڑھے' مرد' خواتین سب خون میں نہا گئے یکا یک اس ملک میں کیا ہو گیا' اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا' ٹی وی چینلز چیخ رہے تھے۔ لوگ مدد کے لیے پکار رہے تھے' خون کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ لیکن سہولتوں سے دور سیہون شریف تک رسائی اتنی آسان نہ تھی' رونا رویا جا رہا تھا' جوریہ اور دونوں بچے اس صورت حال سے سخت خوفزدہ تھے اماں بھی بے چین ہو رہی تھیں وہ اپنا سکون تلاش کرنے پاکستان آئی تھیں لیکن یہاں اُن کا سکون لٹ گیا تھا۔

سوشل میڈیا سے تعلق منقطع رکھنا آسان نہ تھا وہ فیس بک دیکھ رہا تھا کہ ایک پوسٹ دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا' مزار پر دہشت گردی کی واردات سے متعلق اس تصویر میں ایک نظر میں دیکھنے پر انسان بے ساختہ رو پڑتا' وہ چودہ پندرہ سال کا کمزور سا بچہ اپنے ہی خون میں نہایا ہوا مدد کے لیے پکار رہا تھا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا خوف تھا۔ زندگی سے دور جانے کا خوف...... موت کا خوف...... بم کا خوف...... اذیت یا کچھ اور...... اس کے چہرے پر خون ہی خون تھا لیکن اس میں ایک پکار تھی۔ تکلیف تھی۔ وہ بے چین ہو گیا...... پوسٹ کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کا ایک شعر تحریر تھا۔

دن زندگی کے ختم ہوئے ' شام ہوگئی
پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کنج مزار میں

''لاحول ولاقوۃ......'' بے ساختہ اس کے منہ سے ادا ہوا......

''زندگی کو لوگوں نے تماشہ سمجھ رکھا ہے۔'' اس کی انگلیاں کی بورڈ پر چلنے لگی اس کے علاوہ وہ اور کیا لکھ سکتا تھا۔

''کیسے کیسے نامعقول لوگ ہوتے ہیں۔'' وہ بڑبڑایا تھا۔

☆......☆......☆

''شرافت علی......''

وہ سونو اور روما کو مال کی برقی سیڑھیوں کی جانب لے کر بڑھا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی مانوس سی آواز نے اُسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''علیز ے...... اتنے برسوں میں وہ بس اتنی ہی بدلی تھی کہ ذرا سی موٹی ہوگئی تھی اور بالوں کو ذرا مختلف اسٹائل سے بنایا تھا چہرے کی مسکراہٹ ویسے ہی تھی جیسے برسوں پہلے ہوا کرتی تھی۔

''دیکھا پہچان لیا ناں تم نے...... اور دیکھو میں نے بھی تمہیں پہچان لیا...... کہاں ہو کیسے ہو شادی کر لی...... اور شاید یہ تمہارے ہی بچے ہیں۔'' وہ مسکراتی ہوئی سونو اور روما کے گالوں کو چھوتی بولی۔

''ایک ساتھ اتنا کچھ...... ارے بابا ذرا بریک تو لے لیتی...... ویسے اطلاعاً عرض ہے کینیڈا میں ہوتا ہوں وہیں اچھی بھلی جاب کر رہا ہوں آج کل اماں اور بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان آیا ہوا ہوں...... اور تم سناؤ۔''

اس نے بھی اسی طرح کہا۔

''اچھی ہوں...... میاں صاحب کی پوسٹنگ کراچی ہوگئی تھی پھر دوبارہ سندھ میں ہوگئی دراصل

شانزے بھی آئی ہوئی ہے..... وہ امریکہ میں ہوتی ہے..... اس کی وجہ سے میں بھی آئی ہوئی ہوں ویسے بھی میرا ایک پیر کراچی تو دوسرا سندھ میں ہوتا ہے..... اور سندھ بھر میں گھومتی رہتی ہوں..... ایک این جی او بنائی ہے میں نے غریب بچوں کے لیے..... اس میں مصروف رہتی ہوں..... تم آؤ ناں گھر کسی دن..... ابھی تو یہیں ہو ناں پاکستان میں۔''

''سوچا تو یہ ہی تھا لیکن یار! پرابلم یہ ہے کہ یہاں کے حالات..... اماں کچھ ہول رہی ہیں..... اس لیے سوچا کہ جلد چلا جاؤں..... لیکن ابھی تو ایک ڈیڑھ ہفتہ ہوں۔ ٹکٹ تو کر دیا ہے..... اماں اور بیگم کی جانب سے آرڈر ملتے ہی کنفرم کرا دینا ہے بس۔''

''او کے تو بس تم کل ہی آ جاؤ..... مزہ آئے گا ناں سب مل کر بیٹھیں گے پرانی باتیں ہوں گی..... چلو جلدی سے اپنا نمبر دو۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹیں پھیلی تھیں۔

اس کے یوں اچانک مل جانے سے وہ بہت عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اتنے برسوں بعد اسی کی تلاش میں پاکستان آیا ہو۔ واقعی ایسا ہی تھا یا یہ ایک محض اتفاق ہی تھا' وہ خوشی خوشی گھر لوٹا۔

''اچھا ہوا آپ جلدی آ گئے..... ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی رونی کا فون آیا تھا۔ جویریہ نے آتے ہی اپنی سنائی وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی رونی اس کا فرسٹ کزن تھا جو دبئی میں رہتا تھا اور اس کی فیملی اسلام آباد میں مقیم تھی۔

''اچھا..... کیا کہہ رہا تھا۔''

''آپ کو پتہ ہے..... کل اس کا نکاح ہے۔''

''نکاح..... کل.....'' وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔

''ہاں کل..... آج ہی وہ دبئی سے آیا ہے۔ یہیں کراچی میں ہے..... ماموں جی بھی آج کراچی آ رہے ہیں۔''

''لیکن یہ سب اتنا اچانک..... میرا مطلب ہے کہ وہ یہ سب تمہارے آنے کی وجہ سے کر رہے ہیں۔'' اس کا دل کچھ ٹوٹ سا گیا تھا کل تو اس نے علیزے کو ٹائم دے رکھا تھا۔

''ارے بھئی آپ کو نہیں پتہ یہ رونی کا بچہ بھی ناں..... پہلے ہی کہہ رہا تھا تم پاکستان پہنچو ایک سرپرائز دوں گا۔ تو اس کا سرپرائز یہ تھا۔ حیرت یہ ہے کہ ماموں جی بھی ناں..... ویسے کیا کریں بیچارے ایک ہی تو بیٹا ہے..... چار بہنوں کا ایک بھائی ہے۔''

وہ خوشی خوشی بتا رہی تھی۔

''تو پھر کل چلنا ہے نکاح میں.....'' وہ مرے دل سے پوچھ رہا تھا۔

''تو اور کیا شرافت..... اماں کے کپڑے بھی میں نے نکال دیے ہیں وہ بھی بہت خوش ہیں کہ چلو اس طرح ایک شادی کی تقریب ہی اٹینڈ کر لیں گے۔ اور ہاں خالہ بی اور حمزہ بھائی کو بھی میں نے کہہ دیا ہے۔''

''تو گویا پورا گھر جا رہا ہے۔''

''اور کیا بھئی..... کیا سوچیں گے آپ کے خالہ والے کہ کیسی بہو ہے..... سب چلیں گے ناں..... میں نے تو صاف رونی سے کہہ دیا ہے کہ یہ میرے سسرال والوں کا میکے والوں کے لیے پہلا فنکشن ہوگا پاکستان میں..... ذرا میری عزت کا خیال رکھیں۔''

وہ کہے جا رہی تھی اور وہ اپنے خیالات میں کہیں اور گم تھا۔ کسی نے اندر سے چپکے سے کہا۔

''بے وفا کہیں کا۔'' وہ چونک اٹھا۔

''نہیں تو......'' بے ساختہ بول اٹھا۔
''کیا نہیں تو......'' جویریہ نے رک کر اس کی شکل حیرت سے دیکھی۔
''ارے کچھ نہیں یار! میرا کہنے کا مطلب ہے کہ میری بیگم جیسا کہے گی...... ویسا ہی ہوگا۔'' اس نے زبردستی اپنے چہرے پر وفادار شوہروں کی طرح چاہتیں بکھیریں۔ وہ بے وفا شوہر کی پہچان سے خائف تھا جویریہ نے آج تک ایک اچھی مشرقی بیوی کی طرح اسے چاہا تھا۔ پر وہ کیا سوچے گی کہ اتنے برسوں بعد ملا اور اس کی دعوت کو رد کر دیا۔ رات یوں ہی گزر گئی۔ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اس کا سیل بجا۔
''ہیلو......''
''السلام علیکم شرافت صاحب! میں شانزے...... علیزے کی بہن......''
''او شانزے...... کیسی ہیں آپ؟'' وہ پہلی بار اس سے ہمکلام ہوا تھا۔
''دراصل...... ایک پرابلم ہوگئی ہے...... علیزے نے آپ کو آج ڈنر پر انوائٹ کیا تھا۔'' وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی جیسے کچھ چھپا رہی ہو۔
''جی جی......''
''اس کے لیے سوری، ایکچوئیلی...... وہ ابھی آپ کو فیس نہیں کر سکتی...... بہت ڈسٹرب ہے۔''
''ڈسٹرب ہے...... شانزے! پلیز مجھے بتاؤ...... کیا ہوا ہے علیزے کو......'' وہ یکدم ٹینشن میں آ گیا۔
''اس لوزر نے علیزے کو ڈی ورس دے دی۔'' جیسے ایک تیر ہوا میں لہرایا تھا۔
''وہاٹ...... ڈی ورس...... طلاق...... امیگزنگ...... ابھی...... ابھی کل ہی تو وہ مجھے ملی تھی۔ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔''
اس نے اپنے آپ کو بمشکل سنبھالا اس کی عزیز دوست کو طلاق...... یہ کیا راز تھا......
''وہ ہمیشہ خوش ہی رہتی ہے...... اپنے غم چھپا کر...... اسے دوسروں پر اپنی مظلومیت ظاہر کرنے کا شوق نہیں ہے۔''
''کوئی ریزن...... کوئی تو سبب ہوگا طلاق کا......''
''شرافت صاحب! ریزن ہے...... علیزے بے اولاد ہے...... اور ہمارے ہاں یہ ہی سب سے بڑا ریزن ہوتا ہے طلاق کا...... وہ بہت ڈسٹرب ہے...... آج ہی اس کے لائر کی جانب سے طلاق نامہ موصول ہوا ہے۔''
''او کے شانزے! میں......'' سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسے موقع پر کیا کہوں...... بہر حال......
''آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔''
''میری جانب سے اسے بہت پیار دیجیے گا...... جانے سے پہلے خود اسے کال کر لوں گا۔''
''او کے...... تھینکس شرافت صاحب! مجھے بہت عجیب سا محسوس ہو رہا ہے...... وہ آپ کی وجہ سے بہت خوش تھی۔ ہم سب نے پلان کر لیا تھا لیکن جیسے یہ ایک بم تھا جو ہم سب پر پڑا ہے۔''
''میں سمجھ سکتا ہوں شانزے!'' وہ بہت دکھی ہو رہا تھا۔
''او کے بائے۔''
دوسری جانب سے فون رکھا جا چکا تھا۔ وہ حیران پریشان کھڑا تھا جویریہ کی خوشی کی خاطر وہ رونی کے نکاح کا فنکشن مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود ہی علیزے سے بہانہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ڈنر کو رد کر دینے کا یہ سبب نکل آئے گا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔
''ارے آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے رونی کا دو بار فون آ چکا ہے۔''

جویریہ بھاری بھرکم جوڑا پہنے کمرے میں داخل ہوئی اور اسے گم صم دیکھ کر کچھ پریشان سی ہوگئی۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں..... آر یو اوکے ڈیئر.....''

''اویس..... آئی ایم فائن..... پرفیکٹلی فائن.....''

وہ خیالات کے بھنور سے نکلا اور مسکراتے ہوئے جویریہ کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''تم چلو..... میں بس ابھی آتا ہوں۔''

اس نے مسکراتے ہوئے شرافت علی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''یو نو شرافت..... یو آر دا بیسٹ ہزبینڈ ان دا ورلڈ (آپ دنیا کے بہترین شوہر ہیں)۔''

یہ اُس کا اعتماد تھا یا بھروسہ..... اس کے اندر کچھ بکھر سا گیا اپنا آپ بہت کمتر حقیر سا محسوس ہوا اس نے اپنے آپ کو دلاسہ دیا۔

''میں لوزر نہیں ہوں۔'' اس نے بہت اعتماد سے اپنے آپ سے کہا۔

☆......☆......☆

رونی نہایت دلچسپ انسان تھا اس نے اپنے نکاح پر خوب ناچ کیا ساتھ میں جویریہ اور بچوں کو بھی شامل کرلیا پہلی بار وہ اتنا کھل کر ناچا تھا۔ نکاح کا وہ فنکشن اس کے لیے ایک یادگار موقع بن گیا' علیزے کی طلاق کا غم اس رنگ' شور شرابے میں کہیں گم ہوگیا۔ اس کے بعد اماں کا بلڈ پریشر ہائی ہوگیا' سونو کو بخار ہوگیا' علیزے بھی اچانک بیمار پڑگئی اتنے سارے جھنجٹ اور واپسی کی تیاریاں ایک کے بعد ایک مسائل سے وہ نکلتا رہا۔ اس کے کولیگز نے خاص طور پر پاکستان سے سوغات منگوائی تھی اس کے لیے بھی کچھ نہ کچھ کرنا تو تھا پھر رونی زبردستی سب کو لے کر اسلام آباد چلا گیا۔ دو دن کا کہہ کر گئے تھے پورا ہفتہ لگ گیا اور یوں بھاگم دوڑی میں وہ پاکستان سے کینیڈا لوٹ گئے' دن کیسے پھر کر کے گزر گئے کہ پتہ ہی نہ چلا۔

''شکر خدا کا..... خیر خیریت سے آگئے۔''

اماں نے صدق دل سے شکر ادا کیا اتنے دنوں اپنوں میں رہ کر آنے کے بعد اُن کے چہرے کا رنگ کھل گیا تھا۔

''واقعی ..... بہت انجوائے کیا ہم سب نے..... جلدی جلدی میں ہوا لیکن پھر بھی..... کیوں شرافت۔''

''ہاں واقعی..... جلدی جلدی میں بھی بہت انجوائے کیا۔''

وہ اس کے نزدیک ہی صوفے میں دھنس گیا کافی کے مگ سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ اچانک ہی اسے ایسے میں علیزے کی یاد آئی۔ زندگی کے جھمیلوں میں وہ اسے بھول ہی گیا تھا۔ اسے اپنی اس حماقت پر بہت غصہ آیا کم از کم ایک بار ایک فون ہی کردیتا تو کیا ہوجاتا بیچاری کا دل بڑھ جاتا۔ کچھ سوچ کر وہ اٹھا اپنے کمرے میں آیا اور سیل اٹھایا۔ اس کا نمبر ڈائل کیا لیکن دوسری جانب سے جواب ندارد..... اس کا موبائل آف تھا یا جان بوجھ کر اٹینڈ نہیں کیا جارہا تھا۔ اس نے جلدی سے اُسے ایک مختصر سا پیغام لکھ کر بھیج دیا۔ اس کا ضمیر اب کسی قدر مطمئن تھا۔

وہ اپنے افسانے کے اختتام کی جانب تھا رات کا نجانے کون سا پہر تھا آج کتنے دنوں بعد اُسے کچھ لکھنے کا موقع ملا تھا موڈ بھی اچھا تھا اور الفاظ جیسے پھسلتے گئے۔ وہ اپنی رائٹنگ ٹیبل پر جھکا کسی اور ہی دنیا میں تھا تب ہی اچانک جویریہ کے کراہنے کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اس نے جلدی سے قلم میز پر دھرا اور اٹھ کر جویریہ کے نزدیک آیا جلدی سے

کمرے کی لائٹس آن کیں۔
"جویریہ کیا ہوا..... جویریہ....." وہ اسے آوازیں دے رہا تھا اور جواباً وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھے صرف کراہ رہی تھی اس کے چہرے کی رنگت پیلی پڑگئی تھی اور ہاتھ پیر سرد ہورہے تھے تھوڑی ہی دیر میں اس کی کار سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ جویریہ کی کراہیں اب بلند ہوچکی تھیں۔
وہ چند گھنٹے اس کی زندگی میں نہایت بھاری گزرے وہ نہایت بے چینی سے اسپتال کے کاریڈور میں چکر لگا رہا تھا۔ رات گزر گئی صبح کی سپیدی چہار سو پھیل گئی تھی جویریہ کی ٹریٹمنٹ جاری تھی اس کے ضروری ٹیسٹ کرائے جارہے تھے کچھ کی رپورٹ فوری مل چکی تھی جبکہ کچھ رپورٹس ابھی باقی تھیں' ڈاکٹر نے فی الحال جس شک کا اظہار کیا تھا وہ اس کے لیے روح فرسا تھا اور پھر وہ ہی ہوا جگر میں سرطان..... زندگی اور موت کے بیچ اتنا مختصر سا فاصلہ وہ اس پُر پیچ راستے سے گزرتے خوف کھا رہا تھا۔ سونو اور روما..... اماں اور وہ خود..... ان سب کے بیچ تھی 'جویریہ' زندگی سے بھرپور..... اس گھر اور اس گھر میں مہکنے والی خوشبوؤں کا مرکز اور اب اس گھر کی خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی تھی۔ وہ کب سے ٹیرس پر کھڑا خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ موسم میں خنکی کے ساتھ سردی بڑھتی جارہی تھی اور وہ بیگانہ بنا کھڑا تھا۔
"شرافت بیٹا! یہ کیا حماقت ہے..... اس سرد موسم میں یہاں کھڑے ہو" اماں نے پیچھے سے آکر اُسے جھنجھوڑا وہ چونک اٹھا۔
"اماں! میں جویریہ کے بغیر کیسے زندگی گزاروں گا..... اماں سنا تھا ناں آپ نے..... وہ ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا۔ جویریہ کی زندگی اب..... اماں اب کچھ نہیں بچا....."
وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ رو دیا اماں نے اُسے اپنے سینے سے لگالیا۔
"اسی کا نام زندگی ہے بیٹا..... ہم سب کو جانا ہے بیٹا..... کسی نے جلدی کسی نے دیر سے..... بس اس کو اپنے رب کی رضا سمجھ میری جان.....!" ان کی آواز آنسوؤں میں مدغم ہوگئی۔
یہ رب کی رضا ہی تھی جویریہ نے ڈاکٹر کی بتائی مقررہ مدت سے بھی پہلے اس دنیا سے اپنا دانہ پانی اٹھالیا۔ بظاہر کمزور نازک سی نظر آنے والی جویریہ بہت باہمت نکلی وہ شرافت کو سمجھاتی رہتی اماں کی ہمت بڑھاتی سونو اور روما کو پیار محبت سے رہنے کا درس دیتی اور پھر ایک دن سوئی کی سوتی ہی رہ گئی۔
اس کے جانے کے بعد شرافت کو اس کی ذات کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اس کے کپڑے' کھانا پینا' بچوں کا خیال ان کی تعلیم و تربیت اماں کی وقت پر دوائی' وہ سب کچھ مشین کی طرح کرتی چلی جاتی مغرب کی ہواؤں میں سانس لیتی پل کر جوان ہونے والی جویریہ اندر سے مکمل طور پر مشرقی عورت تھی جو بیک وقت ایک اچھی ماں اچھی بیوی اور بہو تھی۔ اس کے بعد اب کسی چیز میں دل ہی نہ لگتا تھا۔ دن کیسے گزر رہے تھے پتہ ہی نہ چلا جویریہ کی ماں پندرہ دن تک ان کے ساتھ رہی سونو اور روما میں انہیں اپنی جویریہ نظر آتی لیکن کون کب تک ساتھ رہتا ہے پھر وہ بھی چلی گئی۔
"شرافت علی..... مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔"
"جی اماں....." وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور اپنا سر اُن کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔
"بیٹا..... جویریہ کو گزرے اب چالیس روز ہونے والے ہیں..... تم جانتے ہو وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ دیکھو بیٹا! مرنے والے کے ساتھ مرا تو نہیں جاسکتا..... تم سمجھ رہے ہو ناں..... یہ مرنے

والی کی بھی خواہش تھی۔'' وہ اس کے بالوں میں شفقت سے اپنی انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

'' دیکھ میرا بچہ...... جویریہ کی ماں کا فون آیا تھا...... انہوں نے ایک بڑی اچھی لڑکی دیکھ رکھی ہے۔ چھوٹے بچوں کے اسکول میں پڑھاتی ہے جویریہ کی سہیلی ہے...... یہیں کینیڈا میں رہتی ہے...... اگر تو کہے تو......''

'' اماں پلیز......'' وہ تڑپ اٹھا۔

'' دیکھ بیٹا! جیسا تو کہے گا ویسا ہی ہوگا...... اگر تو چاہتا ہے تو ہم پاکستان چل کر رہتے ہیں۔ جس سے تو کہے گا میں تیری شادی کر دوں گی۔''

'' خدارا اماں! جویریہ کے بعد میں کسی سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' وہ بس رو دینے کو تھا اماں نے اُسے امتحان میں ڈال دیا تھا۔

'' آج نہیں تو کل...... شادی تو کرنا ہی ہوگی...... اپنے لیے نا سہی...... پر اپنے معصوم چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے...... میں اب بوڑھی ہوگئی ہوں...... ان بوڑھی ہڈیوں میں اتنی جان نہیں رہی...... جانے کب یہ سانس بھی ساتھ چھوڑ دے...... یہ فیصلہ میرا اور جویریہ کے گھر والوں کا بھی ہے...... میں تم پر زور نہیں ڈالتی پر تم اچھی طرح سوچ لو یہ زندگی کی دھوپ چھاؤں ہے بیٹا! گزرنا تو ہوگا۔'' اماں دیر تک اسے سمجھاتی رہیں اور وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

'' تو میاں شرافت تیری زندگی کی کہانی کا ٹرننگ پوائنٹ آ گیا۔ جویریہ کی موت...... بس اس نے اتنا ہی سوچا کہ آنکھیں نین بہانے لگیں۔ یا خدایا یہ کہانیاں حقیقت میں کس قدر تلخ ہوتی ہیں۔ اس کے سارے لکھے افسانے اور کہانیوں کی کڑواہٹ اس کے وجود میں گھل گئی۔ خود کو اس کہانی کا کردار سمجھ کر اسے خود پر بے تحاشہ ترس آیا۔ اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی۔

'' ہیلو......''

'' شرافت علی...... میں علیز ے...... فرام کراچی۔''

ذہن میں ایک جھما کا سا ہوا بھلا اس آواز کو وہ کیسے بھلا سکتا تھا۔

'' علیز ے......'' آواز بھرا سی گئی اس نے بیدردی سے اپنے لب کاٹے۔

'' بہت افسوس ہوا مجھے تمہاری وائف کی ڈیتھ کا سن کر...... یقین جانو دل جیسے کٹ سا گیا جب سے سنا ہے ایک پل چین نہیں آیا کب سے ٹرائی کر رہی تھی۔ اب جا کر کال ملی ہے۔''

'' تو تم تک خبر پہنچ گئی۔'' اس نے اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

'' ظاہر ہے تم ایک عام آدمی تو ہو نہیں اتنے بڑے قلم کار ہو۔'' جواباً اس نے ایک گہری سانس بھری۔

'' جانتی ہوں شرافت علی تم پر کیا گزر رہی ہوگی...... میں اس دکھ سے گزر چکی ہوں فیروز سے طلاق شاید ایسا ہی دکھ تھا۔ لیکن تمہارے ساتھ تو تمہارا سہارا ہے۔ تمہارے بچے...... اور میں...... میں تو اکیلی تھی...... اکیلی ہوں۔'' اس کا انداز نہایت دکھی تھا۔

'' دکھ بہت کاری ہوتا ہے علیز ے...... وہ کسی کو نہیں بخشتا...... سب کچھ کھا جاتا ہے۔''

'' نہیں شرافت...... تم اس دکھ کی خوراک نہیں بننا...... تمہیں اپنے آپ کو بچانا ہے...... ضرور بچانا ہے...... اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے بچوں اور اماں کے لیے......''

'' بہت مشکل ہے علیز ے......'' اُس کا دل بے ساختہ رو دینے کو چاہا تھا۔

''آسان بنانا ہوگا تم بہت باہمت ہو میں جانتی ہوں تم آسان کر سکتے ہو... تم بڑے کمال کے شخص ہو' شرافت علی...... تمہیں اپنے اندر کے بپھرنے طوفان کو سنبھالنا آتا ہے۔'' وقت نے اسے خاصا سمجھدار بنادیا تھا' نگاہوں کے سامنے اُس کی تصویر گھوم گئی۔

''اماں بھی یہ ہی کہتی ہیں...... اور تم بھی...... حالانکہ میں اندر سے بہت کمزور ہوگیا ہوں یار......!''

''یقیناً...... اس میں کوئی شک نہیں تمہاری زندگی میں بھونچال آ کر گزر چکا ہے۔ جویریہ بہت اچھی تھی۔ اتفاقاً میں اس سے مل نہ سکی لیکن تم اس ملاقات میں مجھے اتنے پُرسکون اور پُراعتماد دکھائی دیے تھے۔ شاید اس کے پیچھے تمہاری بیوی کا بھی ہاتھ تھا۔

یہ اتفاق تھا یا اس کا طنز کا انداز وہ سمجھ نہ سکا لیکن سب کچھ تیزی سے فلم کی ریل کی مانند گھوم گیا۔ علیزے کی طلاق...... اُف خدایا......''

''سوری علیزے! میں نے تمہیں اس حادثے کے بعد کانٹیکٹ نہیں کیا تھا۔ پاکستان میں اتنا اُلجھ گیا تھا۔ پھر بچے اور اماں بیمار ہوگئے تھے جویریہ بھی...... شاید وہیں اس پر اس بیماری کا اٹیک شروع ہو چکا تھا۔ ہمیں پتہ ہی نہ چلا...... یقین مانو...... کینیڈا آ کر میں نے کئی بار ٹرائی کیا لیکن تمہارا اسں......''

''اوہو...... کمال ہے بھئی...... میں جویریہ کی تعزیت کے لیے بات کر رہی ہوں اور تم میری کہانی لے کر بیٹھ گئے...... ویسے یہ کہانی بہت پرانی ہو چکی ہے...... شرافت......'' وہ کہتے کہتے رُکی جیسے کچھ سوچ رہی ہو...... پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔

''تم اسی طرح کہانیاں بنایا کرتے تھے ناں......'' وہ مسکرا دیا اُس کی سوچ اب بھی ویسے ہی تھی وہ میچور ہوگئی ہے شاید اس کا وہم تھا۔

''ارے یار! کہانیاں بنایا نہیں کرتے...... بُنتے ہیں...... تخلیق کرتے ہیں۔''

''اچھا اچھا اب تم اپنے چڑے چڑیا کی کہانی نہ شروع کر دینا۔'' وہ ناراض سی بولی اور بے ساختہ اس کے لب کھل اٹھے۔

☆......☆......☆

جویریہ کو گزرے دو مہینے ہو چلے تھے گھر میں سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ سب کچھ تھا پر وہ نہ تھی آج اسے آفس سے لوٹتے ذرا دیر ہوگئی تھی گھر پہنچا تو اماں کے ساتھ جویریہ کی ماں کو بھی اپنا منتظر پایا وہ انہیں دیکھ کر کچھ شرمندہ سا ہوگیا۔

''اپنے آپ کو آفس میں مصروف کر لینے سے کیا زندگی آرام سے گزر جاتی ہے بیٹا......'' وہ تینوں کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے تھے اماں نے سونو اور روما کو کھانا کھلا کر سلا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آنٹی رخسانہ کا آنا کسی خاص مقصد کے لیے ہی تھا۔

''بس کچھ کام زیادہ تھا آج...... میں شرمندہ ہوں آنٹی!''

''تم جانتے ہو بیٹا...... آج رخسانہ بہن کیوں آئی ہیں؟'' اماں نے اُسے کچھ یاد دلانا چاہا۔

''اماں پلیز...... میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ میں جویریہ کے بعد کسی کو بھی اسی روپ میں قبول نہیں کر سکتا۔'' اس پر کوفت سی سوار ہوگئی۔

''دیکھا آپ نے اسے...... اسے اپنی بوڑھی ماں کا بھی کوئی خیال نہیں...... کل کلاں کو مجھے اگر کچھ ہو جائے تو یہ مجھے بھی مٹی میں دبا کر ایسے ہی کرے گا۔'' اماں کا لہجہ گلوگیر ہوگیا۔

''آپا! خدانخواستہ جو آپ کو کچھ ہو...... آپ کو اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنا ہیں ابھی...... اگر مدثر کی نوکری کا مسئلہ نہ ہوتا ناں...... تو میں اِدھر ہی آ جاتی...... مدثر کے پاپا کے گزرنے کے بعد یہ بچے ہی ہیں اب میری زندگی...... اچھا بھلا کام تھا

یہاں..... پر مدثر کی وجہ سے.....''

''اماں..... آنٹی..... آپ لوگ مجھے اموشنلی بلیک میل کررہے ہیں۔'' وہ سب جانتا تھا کہ اماں اور آنٹی رخسانہ جویریہ کی سہیلی کی شادی اس سے کرانے کے درپے ہیں۔

''چلو ہوسکتا ہے کہ ہم غلط سوچ رہے ہوں..... ہم تمہیں بھی سوچنے کا موقع دیتے ہیں..... تمہاری نظر میں اگر کوئی بہتر لڑکی ہو تو..... ہم لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہے..... حالانکہ مدثر کی بیوی کے اپنے رشتے دار بھی یہاں ہیں..... اس نے بھی مجھے کہا تھا ..... کوئی انڈین لڑکی ہے..... پر میں نے اپنی بہو سے کہہ دیا کہ بیٹا..... مجھے اپنے داماد کے لیے صرف بیوی ہی نہیں بلکہ اپنے نواسا نواسی کے لیے ماں بھی چاہیے.....کوئی بھی ہو وہ حقیقی ماں کی تو جگہ نہیں لے سکتی لیکن ماں کی طرح خیال تو رکھ سکتی ہے سہارا تو بن سکتی ہے۔''

''آنٹی..... اب ہم سب نے جویریہ کے بغیر بھی جینا سیکھ لیا ہے..... آگے بھی گزر ہی جائے گی۔'' آنٹی رخسانہ کے جواب میں اس نے اپنی دلیل پیش کی۔

''یہ تمہارا خیال ہے بیٹا..... نئی نئی بات ہے ابھی.....سب ہی توجہ دے دیتے ہیں.....ہم دونوں اب زندگی کے آخری دور سے گزر رہے ہیں..... ہمارے بعد..... کیا مدثر اور اس کے بیوی بچے اپنے روما سونو کو اس قدر پیار دے سکیں گے۔ اور تم تو اکلوتے ہو میرے بیٹے..... ذرا سوچو..... مجھے تمہاری ماں نے فون کیا تو مجھے بہت تشویش ہوئی..... یہ سب کیسے چلے گا..... میں کب تک ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کرتی رہوں گی۔ پھر یہاں کا سخت موسم.....''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں بیٹا..... ورنہ میری مان پاکستان چل۔'' اماں نے اپنی صلاح دی۔

''چاہے پاکستان ہو یا کینیڈا.....سونو اور روما بہت چھوٹے ہیں..... روما لڑکی ذات ہے سات آٹھ برس کی بچی اور اتنا لمبا زندگی کا سفر..... مسائل ویسے ہی رہیں گے۔ تمہیں سوچنا ہی ہوگا یوں میرے دل کو سکون نہیں آئے گا۔'' آنٹی رخسانہ کے چہرے پر پریشانیوں کے سائے لہرائے۔

''اوکے آنٹی..... میں آپ کو سوچ کر بتاتا ہوں۔''

اس نے ان کی ضد کے آگے گرین سگنل کردیا۔ فیصلہ اب بھی اس کے پاس محفوظ تھا۔ دونوں بوڑھی خواتین مطمئن ہوگئیں۔

وہ رات سونے لیٹا تو اماں اور آنٹی رخسانہ کی باتیں ذہن میں شور مچاتی رہیں۔ اسے کسی پل چین نہیں آرہا تھا۔ بالآخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اسی دم موبائل کی بیپ بجی۔

''علیزے.....'' وہ کچھ حیران کچھ خوشگوار انداز میں فون کی جانب بڑھا۔ جویریہ کی وفات کے بعد سے اس کے فون آنے اور جانے لگے تھے بچوں کے لیے' اس نے اپنی این جی او کا دائرہ کچھ وسیع کردیا تھا۔ وہ اپنے ادارے کے لیے بہت پُرعزم تھی۔ اس کے بڑے بڑے پلان تھے۔ فیروز کے ساتھ گزری سنگت نے اسے سرکاری اداروں کے ساتھ ڈیل کرنے کے طریقے سکھا دیے تھے۔

''علیزے.....! تم شادی کیوں نہیں کرلیتیں۔'' باتوں کے دوران اس نے پوچھا۔

''اس لیے کہ مجھے تم جیسا احمق نہیں ملا.....'' اس نے بڑی خوشگواری سے جواب دیا۔

''اچھا تو پھر مجھ احمق سے ہی سہی۔'' اور جواباً اس کا قہقہہ ابھرا وہ بہت خوش تھی۔ خوش تو وہ بھی تھا۔ اب وہ اماں اور آنٹی رخسانہ کے ساتھ اپنے آپ کو

بھی مطمئن کر رہا تھا۔ آنٹی رخسانہ اور اماں شاید اس کے فیصلے سے خوش نہ تھیں لیکن انہوں نے اعتراض بھی نہ کیا۔ مدثر کا فون آیا تھا اس کے بڑے بیٹے کی طبیعت ناساز تھی لہٰذا آنٹی رخسانہ نے فوراً اپنا بوریا بستر سنبھالا...... وہ آفس سے لوٹا تو وہ جا چکی تھیں۔

''آنٹی رخسانہ چلی گئیں۔''

''ہاں...... تمہارا جواب تو مل چکا تھا اسے...... رک کر کیا کرنا تھا اُسے۔''

''شاید انہیں میری چوائس پر اعتراض ہے...... ہے ناں اماں۔''

''ناں بیٹا دراصل جویریہ بڑی سمجھدار لڑکی تھی اس نے بھانپ لیا تھا کہ اس کے پاس ٹائم نہیں ہے...... سنبل اس کی سہیلی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ پڑھا تھا۔ رخسانہ بتا رہی تھی کہ بڑی اچھی لڑکی ہے سنبل...... پر قسمت دیکھو...... شوہر نے ایک دوسری عورت سے عشق کر لیا شادی کے سال بھر بعد ہی سنبل نے اس سے طلاق لے لی...... اب بچوں کو اسکول میں پڑھاتی ہے...... کہتی ہے کہ اب شادی نہیں کرنا...... پر جویریہ کی بیماری میں اس نے جویریہ کو ہاں کہہ دی تھی۔ دیکھا تو ہوگا تم نے اسے اسپتال میں۔''

اسے یاد آیا اُس کی شادی کی تقریب میں جویریہ نے سنبل نام کی کسی لڑکی سے تعارف کروایا تھا۔ پر شکل یاد ہی نہیں آ رہی تھی۔ اتفاقاً اسپتال میں بھی نہ مل سکا تھا اس سے لیکن وہ حیران تھا کہ جویریہ نے مرنے سے قبل اتنا بڑا اہم فیصلہ اس سے پوچھے بنا کیسے کر دیا تھا۔

''پر اب کہنے کہلانے کا کیا فائدہ...... تم نے تو اپنی پرانی دوست کو منتخب کر لیا ہے...... چلو...... وہ جویریہ کی پسند تھی اور یہ تمہاری پسند ہے۔ جو میرے رب کی رضا...... بس اسی میں بہتری ہے۔'' اماں خود ہی خود بڑبڑاتی نماز کے لیے اٹھیں اور وہ سوچتا ہی رہ گیا۔

''کیا میں لوزر ہوں...... جویریہ کے بعد بھی...... لوزر......'' سوال اٹھتے جا رہے تھے۔ پر جواب کوئی نہ تھا۔

☆......☆......☆

اس نے بچوں سے وعدہ کر رکھا تھا گھمانے کا لیکن ذہن پر ایسی سوفتگی سوار تھی کہ کچھ سوجھ ہی نہ رہا تھا۔ بار بار جویریہ کے فیصلے پر جا کر سوئی اٹک رہی تھی لیکن جویریہ کو علیزے اور اس کے بارے میں علم ہی کیا تھا۔ پھر علیزے بھی تو اتنی پیاری لڑکی ہے...... اگر سنبل بچوں کو پڑھاتی ہے تو علیزے بھی تو بچوں کے لیے اس قدر درد رکھتی ہے کہ ان کی فلاح و بہبود کے لیے جُتی رہتی ہے وہ سنبل اور علیزے کو ترازو کے پلڑے میں رکھتا تو علیزے کا پلڑہ خود بخود جھک جاتا...... وہ بار بار اپنے آپ کو مطمئن کرتا...... دلاسا دیتا۔

''علیزے...... ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔'' خوشگوار سی لہر وجود میں ابھری۔

''اب مجھے کسی بری چیز سے نہ ملا دینا۔'' اس کے اشارے پر وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''تمہیں یاد ہے ناں...... تم میرا کس قدر مذاق اڑایا کرتے تھے۔''

''ہاں...... وہ تمہارا پیدائش شوق...... ویسے اب بھی برقرار ہے وہ شوق یا اپنی این جی او کے چکر میں اُسے بھول گئیں۔''

''ہاں کبھی کبھار یاد آ ہی جاتا ہے...... ویسے بھی آج کل تو بہت آسان ہے...... موبائل فونز میں ایک سے ایک کیمرے فٹ ہیں یار! اور اتنے زبردست رزلٹس آتے ہیں۔ اس لیے جسے دیکھو فوٹو گرافر بنا پھرتا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے لیکن ہر کوئی قلم کار نہیں بن سکتا..... کیونکہ کہانی تخلیق کی جاتی ہے۔''

''شکر تمہیں یہ تو یاد رہا..... ویسے تم نے وہ کالج کے زمانے کی تصاویر کا کیا کیا؟''

''سب بانٹ دی تھیں..... کچھ ابھی بھی پڑی ہیں ویسے تمہاری فوٹوز بھی ہیں جناب ..... تمہیں دکھانی ہیں۔''

''بالکل..... سب دیکھوں گا.....'' اُس نے بہت جذب سے کہا تھا۔

''پرامس.....'' اس کے دل میں جھنجلاہٹ سی ہوئی تھی۔

''پکا والا.....'' دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔

''اچھا سناؤ..... میں نے تو خود اپنی آنکھوں نے اتنا کچھ دیکھا ہے کہ کیا بتاؤں..... اب بھی سوچتی ہوں کبھی تو خوف سے جھرجھری سی آجاتی ہے۔''

''مطلب..... تم نے خود 'اوہ گاڈ' بہت بہادر ہو یار! تم.....'' وہ اس سے متاثر ہو رہا تھا۔

''تمہیں پتہ نہیں یاد ہو کہ نہیں..... سیہون شریف..... سندھ میں ہے ناں..... وہاں مزار میں ایک خودکش کارروائی ہوئی تھی۔ تم تصور بھی نہیں کرسکتے یار..... میں کیا بتاؤں..... میں نے خود اپنی آنکھوں سے لوگوں کو وہاں مرتے دیکھا ہے۔''

''تم وہاں تھیں کیا؟'' وہ حیران سا بولا۔

''نہیں ہم تو اس دھماکے کے کوئی تین چار گھنٹے بعد گئے تھے..... انسانی اعضا ایسے بکھرے تھے جیسے کیسا بتاؤں..... فیروز نہیں چاہتا تھا کہ میں وہاں جاؤں لیکن میں زبردستی اس کے ساتھ چلی گئی۔ اتنی چیخ و پکار تھی وہاں حالانکہ اتنے گھنٹے گزر چکے تھے۔ لوگ تڑپ رہے تھے۔''

''ہاں علیزے..... مجھے یاد ہے..... بہت دل رو رہا تھا وہ سب دیکھ کر..... میں اس سے چند روز پہلے ہی تو پاکستان آیا تھا.....'' اس کی نگاہوں میں اس چودہ برس کی مجبور خون میں نہائے بچے کی تصویر گھوم گئی۔

''اچھا اچھا..... ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو..... دیکھو وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے..... پتہ ہی نہیں چلتا۔''

''ہاں..... واقعی..... میں نے ایف بی پر ایک بچے کی تصویر دیکھی تھی اسی حادثے کی ..... اتنی تکلیف دہ تھی کہ نہ پوچھو۔'' اس تصویر کا اثر اب بھی محسوس ہو رہا تھا۔

''ہاں واقعی..... کچھ تصاویر تو میں نے بھی سوشل میڈیا پر ڈالی تھیں۔''

''تم نے.....'' اُسے اچھنبا سا ہوا۔

''ہاں میں نے..... فیروز کہہ رہا تھا کہ تمہاری ہمت ہے تم نے کیسے یہ خود تصویریں بنالیں۔ میں نے کہا کہ بھئی میں تو پیدائشی فوٹو گرافر ہوں۔''

وہ اپنی رو میں مگن بولے جارہی تھی۔

دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہوگئی
پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کنج مزار میں

وہ گم صم سا جیسے بڑبڑا رہا تھا۔

''ارے تمہیں تو وہ شعر بھی یاد ہے جو میں نے اس تصویر کے ساتھ پوسٹ کیا تھا۔'' وہ یوں خوشی سے بولی جیسے کوئی بہت بڑا اعزاز ملا ہو۔

''یار وہ بے چارہ بچہ..... مجھے دیکھتے ہی یوں اشارے کرنے لگا جیسے میں اس کے لیے فوری طور پر کچھ کر ڈالوں گی۔ پر میں کیا کرسکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس زندگی اور موت کے امتزاج کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہی کرلوں۔'' وہ اس کے اندر ابھرتے کرب کو محسوس ہی نہ کرسکی۔

''تم کچھ بھی کرسکتی تھیں علیزے! کچھ بھی..... تم اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے چہرے کا خون ہی

صاف کر سکتی تھیں۔ تم...... تم اپنی قمیض کے دامن سے اس کے پٹی باندھ دیتیں...... تم اس کو دلاسہ ہی دے سکتی تھیں کہ تم اس کی مدد کر سکتی ہو...... تم ایک مرتے ہوئے چھوٹے سے بچے کو زندگی کا ایک بھرپور احساس دلا سکتی تھیں کہ ابھی انسانیت مری نہیں ہے۔''

''لیکن...... لیکن میں کیا...... کیا کر سکتی تھی۔ میرے ہاتھ میں تو......''

وہ کچھ ہکلائی تھی۔ شرافت علی کی جذباتی کیفیت ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

''تم نے اپنے پیدائشی شوق کا حق ادا کر دیا لیکن...... تم نے انسانیت کا حق ادا نہ کیا۔'' وہ چھنا کے کی آواز سے ٹوٹ چکا تھا۔

''یو نو شرافت علی...... اس پک کے بعد میں نے لوگوں کو بلایا تھا لیکن کسی نے میری سنی ہی نہیں...... میں...... میں مجبور تھی یار...... یو نو...... وہ بچہ کچھ دیر بعد مر گیا تھا۔ ایدھی والے اس کی ڈیڈ باڈی میرے سامنے لے کر گئے تھے...... آئی سیور......''

وہ گڑبڑا رہی تھی۔ عذر پیش کر رہی تھی اس کے اندر گھپ اندھیرا اتر رہا تھا۔

☆......☆......☆

''ہری اپ کڈز جلدی جلدی...... فٹافٹ......''

وہ سونو اور روما کو ہدایات جاری کر رہا تھا۔ دونوں بچے خوشی خوشی اپنے شوز پہن رہے تھے۔

''ارے بیٹا! اچانک ہی پروگرام بنالیا۔'' اماں اس کے بدلتے رویے پر حیران تھیں آج کتنے دنوں بعد وہ پرانا والا شرافت علی دکھائی دے رہا تھا۔

''ہاں اماں! کب سے بچوں کو باہر لے کر جانے کا کیا ہوا تھا...... پر آفس کے جھنجٹ...... لیکن بس بہت ہو گیا...... میرے بچے میری توجہ چاہتے ہیں۔''

''خدا تمہیں خوش رکھے میری جان...... میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ شام کو کب تک لوٹو گے۔''

''ارے تو کیا آپ نہیں چل رہیں۔'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ناں بابا...... سردی بڑھ رہی ہے۔''

''چلیے جیسے آپ کی مرضی......''

''چلیے پپا......!'' سونو نے آواز لگائی۔

''او کے بیٹا! اچھا اماں...... ہم چلتے ہیں۔'' وہ جانے کے لیے مڑا۔

''ہاں اماں...... وہ آنٹی رخسانہ کو فون کر دیجیے گا۔ وہ سنبل سے تمام معاملات سیٹل کر لیں...... اور جہاں میری ضرورت پڑے مجھے بتا دیجیے میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

''بیٹا...... تو کیا تم نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔'' اماں کے چہرے پر ایک خوشگوار حیرت پنہاں تھی۔

''جی اماں! ایک ماں ہی ایک ماں کا انتخاب بہتر طور پر کر سکتی ہے...... اور سنبل کے معاملے میں تو تین ماؤں کی چوائس شامل ہے۔''

اس کے دانت کھلے تھے اور آنکھوں میں چمک تھی زندگی کی چمک......

''جیتے میرا لال...... میں ابھی رخسانہ کو یہ خوشخبری سناتی ہوں۔''

''آئی ایم ناٹ آ لوزر...... شکر میرے خدا کا......'' وہ خود ہی بڑبڑا رہا تھا۔

اس نے سونو اور روما کا ہاتھ محبت سے تھاما اور بیرونی دروازہ کھولا۔ سرد ہوا کا جھونکا اُن کی جانب لپکا۔ واقعی باہر سردی کچھ بڑھ رہی تھی لیکن ان تینوں نے خاصے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔''

☆☆......☆☆

تیر نیم کش

''ایک تو میری سمجھ سے بالاتر ہے یہ کہ حیان میں ایسے کون سے سرخاب کے پر ہیں جو کسی اور میں نہیں ہیں۔ سچ کہتی ہوں نذیر' بابا جان ہمیشہ ہم سب کے ساتھ اور خاص کر میرے شہریار کے ساتھ بہت زیادتی کرتے ہیں۔'' شہلا کا موڈ بے حد خراب تھا ایک بار پھر......

فاروقی ولا میں آج ضرورت سے زیادہ خاموشی تھی' ورنہ زندگی ہر وقت اس گھر میں دوڑتی محسوس ہوتی تھی۔

گھر کے بھی بڑے شمشیر فاروقی کے کمرے میں موجود تھے۔ بڑے گھمبیر مسئلے پر بحث ہو رہی تھی۔

''تو بابا جان اب کیا کرنا ہے؟ کون جائے گا پرویز کے پاس؟'' نذیر فاروقی نے کہا۔

''ہوں...... میں بھی یہ ہی سوچ رہا ہوں'' شمشیر فاروقی گہری سوچ میں تھے۔

''ویسے بابا جان انہیں اتنے سالوں بعد ہماری یاد آ کیسے گئی؟ وہ تو سارے بندھن توڑ کر پردیس گئے تھے۔'' نذیر فاروقی کی بیگم شہلا فاروقی نے کہا۔

''ہو گیا ہوگا کوئی مسئلہ...... جو یاد آ گئی اُس کو ہماری۔'' ناصر فاروقی نے کہا۔

''جو بھی ہو آخر کو پتہ تو چلے کہ ہوا کیا ہے؟'' سنبل حیدر نے کہا۔

''بابا جان آپ کیوں چپ ہیں؟ کچھ کہیں تو سہی۔'' شمشیر فاروقی کو گہری سوچ میں دیکھ کر اُن کے داماد بولے۔

''کچھ خاص نہیں ابھی تم سب جاؤ اس معاملے پر صبح بات کریں گے۔'' وہ اپنے بستر پر دراز ہوتے ہوئے بولے۔

''جی بابا جان جیسا آپ کہیں۔'' ثمرین نبیل نے کہا۔

''چلیں پھر سب چلتے ہیں یہاں سے۔'' انہوں نے سب کو مخاطب کیا۔ ثمرین نے شمشیر صاحب کو ٹھیک سے چادر اوڑھائی اور باہر نکل گئیں۔

''جب سے پرویز بھائی کا فون آیا ہے بابا جان اسی طرح پریشان سے ہیں۔'' سنبل نے ثمرین سے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو باجی تم یقیناً کوئی بات ہے جو بتا نہیں رہے ہیں۔ ورنہ وہ یوں چپ نہ ہوتے۔ لیکن پتہ چلے گا کیسے؟'' ناصر فاروقی کی

عالیہ بیگم نے کہا۔
''دیکھو شاید صبح کچھ بتائیں ابھی تو چلتے ہیں ہم۔''
وہ سب کوریڈور سے ہوتے ہوئے سٹنگ روم میں آ گئے۔
''اب ہمیں چلنا چاہیے سنبل۔'' حیدر نے سنبل سے کہا۔
''جی چلیں۔''
''ارے کہاں جاؤ گے رات کے دس بج رہے ہیں صبح پھر سے آنا پڑے گا تم لوگوں کو۔'' شہلا نے کہا۔
''جی بھابی ..... لیکن خیر ہے ہم صبح ہی آ جائیں گے۔ ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے۔'' سنبل مسکرا کر بولیں۔
''ارے آپ لوگوں کے کون سے بچے چھوٹے ہیں جو آپ کو فکر ہو ماشاء اللہ سب جوان ہیں آپ لوگ کہیں یہاں پر ہیں۔'' عالیہ نے کہا۔
''ہاں باجی رُک جائیں ہم دونوں بھی یہاں ہی ہیں۔'' ثمرین نے نبیل کی طرف دیکھ کر کہا جو ناصر سے باتیں کر رہا تھا۔
''چلو ٹھیک ہے رک جاتے ہیں' کیا خیال ہے حیدر۔'' انہوں نے شوہر کا مشورہ لینا ضروری جانا۔
''ہوں ٹھیک ہے پھر میں ذرا گھر فون کر دیتا ہوں۔'' وہ مسکرائے اور جیب سے سیل نکال کر باہر نکلے۔
''رمضو بابا..... ذرا اوپر گیسٹ روم ٹھیک کرا دیں دونوں۔'' شہلا فاروقی نے آواز لگائی۔
''شکریہ بھابی.....'' سنبل مسکرائیں۔
''ارے شرمندہ نہ کرو۔'' وہ بھی مسکرا دیں۔
☆......☆......☆

''بابا جان مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کا دل دکھایا ہے میں جانتا ہوں..... لیکن اب آپ مجھے معاف کر دیں بابا جانی پلیز..... یہ میری درخواست ہے آپ سے۔'' پرویز فاروقی بچوں کی طرح رو رہے تھے۔
شمشیر فاروقی اتنے سالوں بعد اپنے سب سے چھوٹے بیٹے پرویز کی آواز سن کر جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔
''بابا جانی کچھ تو بولیں ناں پلیز.....'' وہ پھر بولے۔
تو ہاتھ میں پکڑا شمشیر فاروقی کا فون لڑکھڑا گیا۔
''پرویز.....'' بہت خستہ سی آواز ابھری تھی۔ انہیں اپنی آواز بے گانا سی محسوس ہوئی تھی۔
''جی بابا جانی میں پرویز آپ کا نالائق..... نافرمان پرویز۔'' وہ ہچکیوں سے رو رہے تھے اور ان کے آنسو شمشیر فاروقی کو اپنے دل پر گرتے محسوس ہو رہے تھے۔
''بابا جانی..... بس آپ میری آخری خواہش سمجھ کر مجھے معاف کر دیں..... کیونکہ میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہی بچا ہے۔ زندگی نے بہت کم مہلت دی ہے مجھے اور میں اپنے باپ کی ناراضگی ساتھ لے کر نہیں جانا چاہتا۔''
''پرویز کیا کہہ رہا ہے تو..... کیا ہوا ہے تجھے تو ٹھیک تو ہے ناں؟'' وہ گھبرا کر بولے۔
''بس بابا جان آپ کسی کو میرے پاس بھیج دیں پلیز..... کوئی بھی آ جائے..... لیکن آ جائے میں اپنی بہت قیمتی امانت آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ اسے میری درخواست سمجھ لیں آپ.....''
''لیکن تو.....'' وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ پرویز نے روک دیا۔

''بس بابا جانی میں اور کچھ نہیں کہہ پاؤں گا۔''

''بس آپ مجھے معاف کر دیں۔'' اُس کے ساتھ رابطہ منقطع ہو گیا۔

شمشیر فاروقی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

آج صبح انہوں نے اپنے سب سے لاڈلے بیٹے کی آواز نا جانے کتنے برسوں بعد سنی تھی اور وہ بھی عجیب حالات میں......

پرویز کے فون کے بعد انہیں ایک پل چین نہیں آ رہا تھا۔ نا جانے کیا ہوا ہے میرے بچے کو......

وہ مسلسل سوچ رہے تھے۔ آخر وہ نتیجے پر پہنچ گئے۔

☆......☆......☆

''السلام علیکم پھوپو جانی......'' سائرہ نے ناشتے کی ٹیبل پر سنبل کو دیکھا تو آ کر اُن کا گال چوم لیا۔

''وعلیکم السلام جانو......'' وہ اُسے پیار کر کے بولیں۔

''واہ کیا بات ہے پھوپو جانی آپ صبح ہی صبح ہمارے ہاں...... عثمان بھی آ گیا......''

''تم گھر میں ٹکو تو معلوم ہو نا کہ کون آ رہا ہے اور کب آ رہا ہے۔'' سنبل سے پہلے عالیہ بول پڑیں۔

''بس کریں نا امی جان اور بتائیں ناں کہ پھوپو آپ اتنی صبح خیریت تو ہے ناں۔'' وہ کرسی کھینچ کر بیٹھا اور ہمہ وقت دونوں سے مخاطب ہوا۔

''ہاں بس یوں ہی۔'' وہ مسکرا دیں۔

''ارے ثمرین پھوپو آپ بھی ہیں۔'' سائرہ نے انہیں سیڑھیاں اترتے دیکھا تو حیران ہوئی۔

''ہاں وہ بھی ہیں۔'' عالیہ سرد کرتے ہوئے بولیں۔ اتنے میں گھر کے افراد جمع ہونا شروع ہوئے۔ پہلے ریحان آیا پھر شانزے آئی۔

وہ بھی حیران ہوئے یوں اچانک اپنی پھوپوؤں کو دیکھ کر......

اس کے بعد گھر کے سبھی مرد حضرات جو باہر لان میں بیٹھے گھر کے اوپر آن پڑے مسئلے پر بحث کر رہے تھے وہ بھی ناشتے کی میز پر جمع ہوئے۔

شہزاد اور شہریار دونوں اکٹھے ہی نیچے اترے تھے۔

''بھائی جلدی کرو مجھے دیر ہو گئی ہے آئی ریڈی۔'' سائرہ جلدی جلدی چائے پیتے ہوئے شہریار سے مخاطب ہوئی کیونکہ اس نے اس کے ساتھ جانا تھا۔

''سنبھل کر لڑکی کہیں گلے میں نہ لگ جائے گرم چائے۔'' اسے یوں گھٹا گھٹ چائے پیتے دیکھ کر شہلا بولیں۔

جبکہ سبھی مسکرا دیتے۔

''اچھا پھر شام میں ملتے ہیں ہم۔'' شہریار ہنستا ہوا اٹھا۔

''بابا آپ آج آ رہے ہیں ناں آفس؟'' وہ اپنی عینک کو درست کر کے نذیر فاروقی سے بولا۔

''اور چچا جان آپ؟'' وہ ناصر فاروقی سے بھی مخاطب ہوا۔

''دیکھو بیٹا کہ ہم آتے ہیں یا نہیں خیر تم جاؤ خیر سے وقت ملا تو ضرور آئیں گے۔'' ناصر نے بڑے پیار سے اپنے بھتیجے کو دیکھا جو بہت ذمہ دار بزنس مین لگ رہا تھا۔

''ہوں ٹھیک ہے نو پرابلم آج ویسے بھی کوئی خاص کام نہیں ہے۔ شہزاد اور عثمان تم دونوں ضرور چکر لگا نا...... کچھ باتیں ڈسکس کرنی ہیں۔'' وہ بولا

اور پھر سلام کر کے نکل گیا۔

''ہاں تم دونوں ضرور چکر لگا لینا......اور بھائی کا ہاتھ بٹا دینا۔'' نذیر فاروقی نے عثمان اور شہزاد کو کہا۔

''جی بابا جی۔'' شہزاد نے کہا جبکہ عثمان نے سر کو جنبش دی۔

''شانزے تم اتنے سکون سے ناشتہ کر رہی ہو تمہیں کالج نہیں جانا کیا؟''

اسے مزے سے ناشتہ کرتا دیکھ کر سنبل نے گھڑی دیکھی۔

''جانا ہے امی جان......لیکن لیٹ......'' وہ دوبارہ مصروف ہوگئی۔

''ہوں ٹھیک ہے۔'' وہ بھی ناشتے کی طرف متوجہ ہوئیں۔

☆......☆......☆

''بھابی گیارہ بج رہے ہیں بابا جانی تو ابھی تک اپنے کمرے سے باہر نہیں آئے......اُن کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔'' سنبل پریشانی سے بولیں۔

''پتہ نہیں ابھی تک نکلے کیوں نہیں بابا جانی......مجھے بھی حیرانی ہو رہی ہے۔'' وہ بولیں۔

''بھئی آپ خواتین پریشان نہ ہوں وہ اٹھ گئے ہیں۔ رمضو بابا انہیں چائے دے آئے تھے۔ ابھی آتے ہوں گے باہر۔''

خواتین کی پریشانی کے پیش نظر ناصر فاروقی نے کہا۔

''بابا جانی کچھ ٹھیک سے بتا بھی نہیں رہے بس سرسری سا کہا تھا کہ پرویز کے پاس کسی کو جانا ہے مجھے یہ کچھ سمجھ نہیں آیا......اتنے عرصے بعد یوں اچانک بابا جان کی ناراضگی کیسے ختم ہوگئی ہے۔'' نذیر فاروقی بولے۔

''بات تو حیرانی کی ہے بھائی صاحب......واقعی......!'' حیدر یزدانی چائے کا کپ میز سے اٹھاتے ہوئے بولے۔

''بھئی ہو گیا ہوگا کوئی چکر۔'' ثمرین بھی پریشان تھیں۔

''ارے بھابی آپ کے کوئی عزیز رہتے تھے ناں پرویز بھائی کے گھر کے قریب ہی جو اکثر اُن کی خیر خبر بتا دیتے تھے۔ ان سے رابطہ ہی کر لیتے۔'' ثمرین اچانک یاد آنے پر سنبل سے بولیں۔

''ہاں رہتے تو تھے میرے خالہ زاد لیکن کافی عرصے سے کوئی رابطہ نہیں ہے اُن کے ساتھ۔'' وہ چائے کا کپ اُٹھا کر بولیں۔

اتنے میں شمشیر فاروقی باہر آئے تو سارے سنبھل گئے۔

''السلام علیکم بابا جانی۔'' سبھی نے کہا۔

''وعلیکم السلام!'' وہ تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔

''بابا جانی آپ ٹھیک تو ہیں ناں......'' سنبل فوراً اُن کے پاس بیٹھ گئیں۔

''ہوں......'' وہ بڑی دقت سے مسکرائے۔

''کیا سوچا ہے آپ نے پھر بابا جانی......'' نذیر بولے۔

جامد خاموشی چھا گئی ہر کوئی اُن کے فیصلے کا منتظر تھا۔

کچھ دیر بعد وہ گویا ہوئے۔

''حیان کو بلاؤ۔ اُسے کہو کہ آج ہی آئے ہم بلا رہے ہیں۔'' انہوں نے کہا اور اٹھ گئے۔

''تو بلائیں بابا جان کے چہیتے کو۔'' سنبل سر مار کر بولیں۔

''ایک تو بابا جان کو اس کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا۔'' انہیں برا لگا۔

''یہاں سب ہی ہیں مگر بابا جان صرف حیان کو کیوں بلا رہے ہیں ویسے بھابی۔'' عالیہ بھی حیران تھیں۔

''اگر کسی کا جانا اتنا ہی ضروری ہے تو بڑوں میں سے کوئی جاتا...... حیان کی مجھے بھی سمجھ نہیں آئی۔'' وہ بولیں۔

''اچھا اب اس بحث میں مت اُلجھو تم......'' ناصر فاروقی نے اپنی بیگم کو خاموش کرایا اور موبائل نکال کر نمبر ڈائل کیا۔

☆......☆......☆

وہ آفس کے لیے نکل ہی رہا تھا کہ فون نے اُس کے قدم روک لیے۔

ناصر فاروقی کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے ریسیو کیا۔

''السلام علیکم چچا جان......''

''وعلیکم السلام...... حیان خیریت سے ہو؟''

''جی......!'' وہ بولا۔

''تمہیں بابا جانی نے بلایا ہے اور کہا ہے کہ آج ہی آؤ۔'' وہ بلا کسی تمہید کے مدعے پر آئے۔

''جی! آجاؤں گا...... ان سے کہہ دیں۔''

اس نے اتنا کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

☆......☆......☆

رات کے بارہ بجے وہ فاروقی ولا میں داخل ہوا اور سیدھا بڑے بابا کے کمرے میں گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے منتظر ہوں گے۔

''السلام علیکم بڑے بابا۔'' وہ مسکرایا۔

''وعلیکم السلام بابا کی جان۔'' وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھے۔

''یار صبح بلایا بلایا تھا تمہیں اور تم اب آئے ہو؟'' وہ گلہ کر کے مسکرائے۔

''بس بڑے بابا آپ کو تو پتہ ہے میں سرکاری ملازم ہوں...... اس لیے ذرا نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' وہ اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ اور اُن کا ہاتھ چوم لیا۔

''کیسے یاد کر لیا آپ نے مجھے؟''

''یار تمہیں میں بھولتا ہی کب ہوں تم تو یہاں اس دل میں رہتے ہو......'' وہ دل کی طرف اشارہ کر کے بولے اور پھر اُسے پیار کیا۔

''جانتا ہوں میں بابا جانی بالکل جانتا ہوں میں۔'' وہ اُن کے سینے سے لگ گیا۔

''اچھا اب بتائیں پریشانی کیا ہے؟'' وہ بولا۔

''تمہیں کس نے کہا کہ میں پریشان ہوں۔'' وہ الٹا بولے۔

''بڑے بابا میں حیان فاروقی ہوں...... یہ مجھے نہیں پتہ ہوگا تو کس کو ہوگا؟ میں فوراً آپ میں آنے والی تبدیلی کو پہچان لیتا ہوں۔''

''آج آپ اتنی گرم جوشی سے نہیں ملے جتنا ملتے ہیں...... اب بتائیں؟''

''ہوں......!'' وہ مسکرائے۔

''پریشان تو میں ہوں اور بہت ہوں۔''

حیان پوری توجہ سے سن رہا تھا۔

''پرویز کا فون آیا تھا۔''

''کیا......؟ پرویز چچا کا؟'' وہ بھی حیران ہوا۔

''ہوں......!'' انہوں نے گردن ہلائی۔

''تم جاؤ یار اُس کے پاس میرا بیٹا تکلیف میں ہے۔'' وہ کرب سے بولے۔

''بڑے بابا......!'' وہ فوراً اُن کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''بس یار تم جس قدر جلد ہو سکے جاؤ۔'' وہ بہت شکستہ لگ رہے تھے۔

''میں جاؤں گا بڑے بابا..... ضرور جاؤں گا اور آپ فکر نہ کریں۔'' وہ اُن کا ہاتھ دبا کر بولا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم اسے ملے ہو جب تم پڑھنے گئے تھے۔''

''جی؟'' وہ حیران ہوا۔

''آپ کو کیسے پتہ؟''

''شمشیر فاروقی ہوں میں' شمشیر فاروقی.....'' وہ اسی کی طرح بولے۔

''ہاہاہا..... جی بالکل.....'' وہ ہنس دیا۔

''اچھا بابا جان میں کل ہی کچھ کرتا ہوں اب آپ بے فکر ہو جائیں..... میں ہوں ناں۔'' وہ بستر سے اٹھا۔

''اب آپ سو جائیں۔'' اس نے اُن کا ماتھا چوما اور نکل گیا۔

''آخر ہوا کیا ہے کہ چچا نے یوں بلایا ہے؟'' گہری سوچ کے ساتھ وہ اپنے روم کی طرف بڑھا۔

اپنے روم کا دروازہ کھول کر جیسے وہ اندر گھسا ایک عجیب سا کرب اُس کے اندر اتر گیا۔

اس نے ایک رنجیدہ سی نظر کمرے میں ڈالی اور واش روم میں چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

''السلام علیکم!'' وہ بلند آواز میں بولا تو ناشتے کی میز پر سارے ایک دم متوجہ ہوئے۔

''ارے حیان تم کب آئے؟'' شہریار نے توس اٹھا کر کہا۔

''رات کو.....'' جواب مختصر اور روکھا تھا۔

''ہوں.....!'' وہ دوبارہ ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔

''رمضو بابا..... میرے لیے بلیک کافی۔'' وہ وہیں سے بولا۔

اور ایک توس اٹھا لیا۔

''کیسے ہو تم حیان؟'' نذیر فاروقی بولے۔

''ٹھیک ہو چچا جان.....'' جواب پھر روکھا تھا۔

''لو آ گئے اس دنیا کے سب سے انگری مین۔'' شانزے سائرہ کے کان میں بولی۔ تو سائرہ نے کہنی اُس کی کمر میں گھسا دی جس سے اُس کے منہ سے 'سی' نکل گیا۔

''کیا ہوا تمہیں؟'' ریحان نے کہا۔ جو اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔

''کچھ..... کچھ نہیں ہوا تم اپنا ناشتہ کرو۔'' وہ گھور کر بولی۔

حیان نے اپنا کپ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

''مجال ہے کہ اس میں ذرا اخلاق ہو نذیر صاحب!'' سنبل کا موڈ خراب ہو گیا۔

''وہ ایسا ہی ہے..... تم جانتی ہو اسے۔'' انہوں نے سرد سا جواب دیا اور اٹھ گئے۔

باقی سارے بھی آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔

☆.....☆.....☆

''بڑے بابا آپ جاگ رہے ہیں؟'' حیان ناک کر کے اندر آیا۔

''آ جاؤ بابا کی جان آ جاؤ'' وہ مسکراتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔

'Looking Great'..... وہ مسکرایا۔

''ہوں..... تمہیں دیکھ کر ہو جاتا ہوں یار وہ کیا شعر ہے.....'' وہ ذہن پر زور ڈال کر بولے۔

''ارے ہاں.....وہ''

اُن کے آ جانے سے آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں بیمار کا حال اچھا ہے

وہ اٹھے اور کھڑکی کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔ حیان بھی مسکراتا ہوا آیا اور اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔

''بابا جان میں نے بات کر لی ہے......بس انتظام ہوا ہی سمجھیں جس قدر جلد ہو سکے گا میں چلا جاؤں گا۔'' وہ تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔

''اچھا یار بس تو میرے پرویز کو لے آ میرے پاس 25 سال ہو گئے ہیں اُس کا چہرہ دیکھے۔''

وہ اداس ہو گئے۔

''یار اب تو اس کی شبیہہ بھی دھندلا سی گئی ہے۔''

حیان تڑپ اٹھا۔

''بابا جان پلیز......خود کو سنبھالیں۔'' وہ اٹھا اور ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اُن کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''ویسے ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو بابا کی جان......'' وہ مسکرائے۔

''آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں چچا سے ملا تھا؟'' وہ حیرانی سے بولا۔

''تمہارا دادا ہوں میں......تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔'' وہ اس کے قریب ہوئے۔

''بابا جان...... پتہ ہے مگر پھر بھی بتائیں تو سہی ناں......میں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ آپ کو بھنک بھی نہ پڑے میں کہاں پر پھسل گیا؟'' وہ شرارت سے بولا۔

''کہیں پر بھی نہیں......'' وہ ہنسے۔

''تو پھر؟'' وہ کندھے اُچکا کر بولا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم اس شہر میں جا رہے ہو تو کسی نہ کسی طرح اس تک پہنچ ہی جاؤ گے۔''

''واقعی؟'' وہ حیران ہوا۔

''صرف یقین کی بنا پر آپ نے اتنا بڑا دعویٰ کر دیا۔'' وہ مسکرایا۔

''میرا دعویٰ کیا غلط ہے؟'' وہ اس سے الٹا سوال کر کے بولے۔

''نہیں بابا جان بالکل نہیں......میں ملا تھا اُن سے......'' وہ شرمندہ ہوا......

''حالانکہ یہ بات میں جانتا تھا کہ آپ نے ان سے سارے رشتے ختم کر دیے ہیں پھر بھی میں ملا تھا۔''

''سوری بابا جان......'' وہ شرمندہ ہوا۔

''اچھا ہی ہوا کہ تم مل لیے تھے اس سے اب اس کو تم آسانی سے ڈھونڈ پاؤ گے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

''آپ ناراض ہیں اس بات پر۔'' وہ بھی اٹھا۔

مگر وہ جواب دیے بغیر ہی چلے گئے اور وہ پیچھے شرمندہ سا کھڑا رہا۔

☆......☆......☆

شام میں سارے ہی سٹنگ روم میں تھے۔ گھر کے بچے بھی اپنے اپنے کام سے فارغ ہو کر شام کی چائے پر تھے۔ بڑے بابا اپنی لاٹھی سنبھالتے ہوئے آئے۔

''ارے بڑے بابا آئیں ناں......'' سائرہ بڑھی اور انہیں تھام لیا اور لا کر صوفے پر بٹھا دیا۔

''چائے پئیں گے بابا۔'' سنبل ٹیبل کی طرف بڑھی۔

''ہوں بیٹا دے دو۔'' وہ مسکرائے۔

''بابا کوئی فیصلہ کیا ہے آپ نے۔'' ناصر بولے۔

''ہاں......'' جواب مختصر تھا۔

سبھی بڑے متوجہ ہوئے' جبکہ بچے ایک

دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔

''میں نے حیان کو کہہ دیا ہے وہ جائے گا۔''

وہ بولے۔سنبل کے چلتے ہوئے ہاتھ تھم گئے۔

''حیان کیوں بابا؟ میں اور ناصر میں سے کوئی کیوں نہیں؟'' نذیر صاحب کو حیان کا انتخاب اچھا نہ لگا تو فوراً بول پڑے۔

''بس میں نے فیصلہ کرلیا ہے...... تم سے مشورہ نہیں مانگا'' وہ بے لچک بولے تو وہ شرمندہ ہوگئے۔

''جی بابا......'' وہ بولے اور اٹھ گئے۔

سنبل نے چائے کا کپ پٹخ دیا اور خود بھی واک آؤٹ کرگئیں۔

''ہوا کیا ہے؟'' شانزے ریحان کے کان میں بولی۔

''مجھے کیا پتہ میں بھی تو ابھی آیا ہوں۔'' وہ کندھے اُچکا کر بولا۔

بڑے بابا اُٹھ گئے۔تو عثمان نے انہیں تھام لیا۔

''آئیں میں چھوڑ آؤں بڑے بابا'' وہ مسکرایا۔

''جیتے رہو بیٹا۔'' انہوں نے دعا دی۔

''کوئی مسئلہ چل رہا ہے کیا؟''

''آپی کیا چل رہا ہے۔'' شہزاد نے سائرہ سے پوچھا۔

اس نے کندھے اُچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

''تم دونوں کو پتہ ہے؟'' وہ شانزے اور ریحان کی طرف متوجہ ہوا۔

''نہیں بھائی......'' دونوں ایک ساتھ بولے۔

اتنے میں حیان مصروف سا اندر داخل ہوا وہ پیپرز چیک کررہا تھا۔

''آپ کہاں جارہے ہیں حیان بھائی۔''

شانزے ایک دم حیان کو دیکھ کر بول پڑی۔

حیان کے چلتے قدم رُک گئے۔

''ہوں...... کچھ کہا ہے؟''

''میں نے پوچھا کہیں جارہے ہیں؟''

''ہاں......''

''کہاں؟'' اس پر وہ زور دے کر بولی۔

''لندن......'' وہ کہہ کر رُکا نہیں۔

''لندن؟'' شانزے تینوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

☆......☆......☆

ایک نظر اس نے اپنی تیاری پر ڈالی...... بیگ تیار تھا۔ضرورت کی سبھی چیزیں وہ رکھ چکا تھا۔

ایک بار پھر اس نے پیپرز چیک کیے......اور پھر فون پر نمبر پریس کیا۔

''ہاں...... میں جارہا ہوں۔آفس کو دیکھ لینا ہاں...... ہاں...... او کے۔'' مختصر سی بات کر کے وہ چیزیں لیے نیچے آیا۔سارے نیچے تھے۔

رات کے دس بج رہے تھے اور دو بجے اس کی فلائٹ تھی۔

''اچھا بابا جان......'' وہ اُن کے سامنے آیا اور اُن کے گلے لگ گیا۔

''میرے پرویز کو لے کر آنا......حیان......'' انہوں نے سرگوشی کی۔

''لے کر آؤں گا بابا......'' اس نے ان کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

اور کسی سے بھی ملے بنا چلا گیا۔

''ہوں...... حد ہے۔'' سنبل نے کہا اور اُٹھ کر لاؤنج سے نکل گئیں۔

''کہاں گیا ہے یہ؟ واپس؟' شہریار نے سائرہ سے پوچھا۔

''نہیں لندن گئے ہیں وہ۔'' انہوں نے کہا۔

'' لندن...... خیریت......'' وہ بھی حیران ہوا۔

''وہاں کیا کرنے گیا ہے؟''

''پتہ نہیں بھائی۔'' اس نے کہا اور اُٹھ گئی۔

☆......☆......☆

فاروقی ولا...... شہر کی سب سے پُر رونق جگہ پر واقع تھا۔

''یہاں پر شمشیر فاروقی اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہتے تھے۔ اُن کے دو بیٹے اور پھر اُن کی اولادیں تھیں۔ جو فاروقی ولا کے مکین تھے۔ نذیر فاروقی اور ناصر فاروقی۔

نذیر فاروقی کے چار بچے تھے۔ شہریار' سائرہ شہزاد اور شانزے......

ناصر فاروقی کے تین بچے تھے۔ عثمان' ریحان اور فائق......

جبکہ حیان فاروقی اُن کی پہلی بیگم کی واحد اولاد غالب کا اکلوتا بیٹا تھا۔

غالب اور اس کی بیوی کا انتقال حیان کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے وہ شمشیر فاروقی کے بہت قریب تھا۔

ساجدہ اُن کی پہلی بیوی تھیں۔ غالب کی پیدائش کے وقت وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں تھیں۔

گھر والوں کے حد سے زیادہ اصرار پر انہوں نے دوسری شادی رقیہ سے کی تھی جن سے اُن کی پانچ اولادیں تھیں۔ نذیر' ناصر' سنبل' ثمرین اور پرویز فاروقی رقیہ کو شمشیر فاروقی کا ساتھ چھوڑے 10 سال ہو گئے تھے وہ اپنے سب سے لاڈلے بیٹے پرویز کی جدائی میں اس دنیا سے چلی گئیں تھیں۔ مگر شمشیر فاروقی اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی نہیں ہٹے تھے۔

پرویز فاروقی کے ساتھ وہ اپنے ہر قسم کے تعلق کو ختم کر چکے تھے۔ لیکن اُن کے یوں اچانک فون سے وہ کمزور پڑ گئے تھے۔ 25 سال کے طویل عرصے کے بعد انہوں نے اس کی آواز سنی تھی اور اُن کی ہونے والی گفتگو انہیں ہلا گئی تھی۔ چاہے جتنی مرضی ناراضگی سہی لیکن وہ تھے تو باپ ہی ناں اور پرویز اُن کا لاڈلہ بچہ تھا۔

پرویز کے آنسوؤں کے سامنے وہ مٹی کی دیوار کی طرح ڈھے گئے تھے اور انہوں نے اُسے واپس لانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

''ایک تو میری سمجھ سے بالاتر ہے یہ کہ حیان میں ایسے کون سے سرخاب کے پر ہیں جو کسی اور میں نہیں ہیں۔ سچ کہتی ہوں نذیر' بابا جان ہمیشہ ہم سب کے ساتھ اور خاص کر میرے شہریار کے ساتھ بہت زیادتی کرتے ہیں۔'' شہلا کا موڈ بے حد خراب تھا ایک بار پھر حیان کے انتخاب پر۔

'' حالانکہ شہریار اُن کا سب سے بڑا پوتا ہے مگر نہیں حیان' حیان' حیان اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں وہ......''

''کیا تھا اگر شہریار کو بھیج دیتے وہ پرویز کو لانے کے لیے......'' وہ منہ پھلا کر بیٹھی تھیں۔

''بس کرو شہلا میرے سر میں پہلے ہی درد ہو رہا ہے تم اسے اور نہ بڑھاؤ۔'' وہ اخبار کو میز پر پٹخ کر بولے۔

تو وہ خاموش ہو گئیں۔

'' امی نیچے پھوپو آئی ہیں آ جائیں۔'' شانزے انہیں بلانے آئی۔

'' ہاں چلو آ رہی ہوں۔'' وہ کہہ کر فریش ہونے کے لیے واش روم میں چلی گئیں۔

''بھابی پھر کیا ہوا اس مسئلے کا.....'' سنبل عالیہ سے پوچھ رہی تھیں۔

''ہونا کیا ہے سنبل باجی! آپ کو تو پتہ ہے نا بابا جان کا انہوں نے حیان کو بھیج دیا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولیں۔

''حیان کو! کیوں؟'' پرویز کے پاس تو کسی بڑے کو جانا چاہیے تھا۔'' وہ بابا جان کے فیصلے پر حیران ہوئیں۔

''میرا بھی یہ ہی ماننا ہے سنبل..... کہ کسی بڑے کو جانا چاہیے تھا۔'' شہلا بھی شامل ہوئیں۔

''چلو بابا نے کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا۔'' وہ چائے کی چسکی لے کر بولیں۔

''ہاں بابا کی سوچ کی حد ہی حیان ہے..... وہاں پر بابا جان کی سوچ ختم ہو جاتی ہے۔'' انہوں نے طنز کا تیر چلایا۔

سنبل نے گہری سانس لی اور عالیہ کو دیکھا۔

وہ بھی بھابی کے لہجے پر حیران تھی۔

''ارے پھوپو جانی آپ...'' سائرہ داخلی دروازے سے اندر آئی۔

''السلام علیکم!'' وہ کتابیں اور بیگ ٹیبل پر رکھ کر ان سے ملی۔

''وعلیکم السلام میرا بچہ...'' انہوں نے اُس کا ماتھا چوم لیا۔

''کیسی ہے میری بچی اور یونیورسٹی کیسی جارہی ہے؟'' وہ اسے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولیں۔

''اچھی ہوں اور وہ بھی اچھی جارہی ہے۔'' وہ بسکٹ اُٹھا کر کھاتے ہوئے بولی۔

''اچھا کیا سائرہ جو تم نے گھر میں فارغ بیٹھنے پر لیکچرار شپ کو ترجیح دی۔''

''ہوں..... پھوپو واقعی میں نے بہت اچھا فیصلہ کر لیا تھا اس وقت.....'' وہ مسکرائی۔

''آپ کب تک ہیں یہاں میں ذرا چینج کر لوں۔''

''بس بیٹا فیضی آنے والا ہی ہوگا مجھے لینے کے لیے۔'' وہ مسکرائیں۔

''ہوں.....'' وہ کہہ کر اٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

لندن کے ایئرپورٹ سے نکلتے ہی یخ بستہ ہواؤں نے اسے خوش آمدید کہا۔ برف باری کی وجہ سے ہوائیں بہت سرد تھیں۔

اس نے اوورکوٹ کو آگے سے بند کیا اور پھر موبائل نکالا۔

''ہیلو سلیم.....'' وہ بولا۔

''ہاں یار میں پہنچ گیا ہوں..... ہوٹل جاؤں گا میں ہوں..... تم صبح ملنا یار.....''

''ارے یار یہ شہر میرے لیے نیا نہیں ہے۔ پانچ سال پہلے میں بھی انہی سڑکوں پر گھوما پھرا کرتا تھا۔'' وہ مسکرایا۔

''ہاں یار وہیں کیفے میں ملنا.....''

''او کے.....'' وہ بولا اور فون بند کر دیا۔

''ٹیکسی.....!'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی روکی۔

☆.....☆.....☆

مقررہ وقت پر وہ کیفے پر پہنچ گیا..... اور کھڑکی سے باہر کا جائزہ لینے لگا..... جب وہ یہاں پڑھنے آیا تھا تو یہ کیفے اسے بہت پسند تھا۔ خاص کر یہاں کی بلیک کافی اور کپ کیکس وہ بہت شوق سے کھاتا تھا۔ ابھی بھی اُس نے وہی آرڈر دیا تھا۔

پھر باہر چلتے لوگوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ زندگی اب بھی اپنی تمام خوبصورتی لیے اس شہر میں

موجود تھی۔ عمارتوں میں ہلکی پھلکی تبدیلی آئی تھی مگر طرز پہلے ہی کی طرح تھی۔

''حیان.....اوہ کہاں گم ہو یار تم؟'' ایک مسکراتی شیریں جیسی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔

وہ آواز کتنی پیاری تھی وہ زندگی بھر بس یہ ہی آواز سننا چاہتا تھا۔ وہ اس آواز کے سحر سے باہر نہیں آنا چاہتا تھا۔

''شزا.....'' اس کے لبوں سے بے ساختہ یہ آواز نکلی۔ اور ایک کرب اس کے اندر سما گیا۔

''بھئی کافی میرے لیے بھی منگواؤ یہاں باہر بہت سردی ہے۔'' وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور سر سے ٹوپی اُتار دی اور ہاتھ رگڑنے لگی۔

''مسکرا کیوں رہے ہو تم؟'' وہ حیران ہوئی۔

''تمہاری ناک لال ہو رہی ہے سردی سے.....اور یہ تم پر بہت کیوٹ لگتی ہے۔'' وہ اس کی ناک کھینچ کر بولا۔

''بہت بدتمیز ہو تم.....'' اور ہنس دی۔ اسے دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیا۔

''حیان.....یار کہاں ہے تو؟'' کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ایک دم بوکھلا گیا۔ سامنے کرسی خالی تھی..... سلیم اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ایک لمحے کو تو اسے سمجھ نہیں آئی پھر ایک دم وہ سنبھلا۔

''تم اب بھی میرے حواسوں پر سوار ہو شزا وہ بس.....''

''ٹھیک ہوں یار تم سناؤ'' وہ اٹھا اور سلیم سے بغل گیر ہوا۔

''So Good To See You یار اتنے سالوں بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں۔'' وہ کوٹ اُتار کر بولا۔

''Me Too.....'' وہ مسکرایا۔

''اور سناؤ کیسی چل رہی ہے یار لائف۔'' وہ ہاتھ رگڑ کر بولا۔

''بس چل رہی ہے۔'' پھیکی سی ہنسی ہنسا۔

''تم سناؤ موٹو..... تم کتنے موٹے ہو گئے ہو۔'' وہ سلیم کو دیکھ کر بولا۔

''ہاہاہا..... ہاں یار موٹا ہو گیا ہوں میں مگر تم ویسے کے ویسے ہی ہو بس چہرہ ذرا زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا ہے۔ اینی وے یار تم نے کافی کا آرڈر دیا؟''

''ہوں دے دیا ہے۔''

''How Is Shizza?'' سوال بالکل غیر متوقع تھا۔

''She Is Not In My Life Any More'' جواب اس سے بھی زیادہ غیر متوقع تھا۔

''What?'' اُسے دھچکا لگا۔

''Love Again'' سلیم کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ حیان کے الفاظ ہیں وہ حیان جو اس کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔

''I Divorced Her & Please Do Not Ask Any Question About Her... It Hurts'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''OK.....'' سلیم نے کہا۔

''ہاں تم نے بتایا تھا کہ تمہیں یہاں پر بہت ضروری کام ہے۔'' اس نے موضوع بدلا۔

حیان نے گہرا سانس لیا اور ماضی کی یادوں سے پھر پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

''ہاں یار.....تمہیں میرے چاچو کا تو یاد ہو گا ناں..... پرویز فاروقی.....''

''ہاں ہاں..... وہ جن کا گھر ہم نے بہت

مشکلوں سے ڈھونڈا تھا۔'' اس نے ذہن پر زور ڈالا۔

''ہاں یار مجھے انہیں پھر سے ڈھونڈنا ہے۔''

''لیکن یار تم نے تو کہا تھا کہ بڑے بابا نے ان سے تمام رشتے ختم کر دیے ہیں اور تم ان سے اپنے طور پر ملنے والے ہو۔'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں مگر اب مجھے بڑے بابا نے ہی بھیجا ہے..... ان کے لانے کے لیے..... وہ شاید کسی بہت بڑی پرابلم میں ہیں۔'' وہ کافی پی کر بولا۔

''ہوں! ڈھونڈ لیں گے..... ہم کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''ویسے تمہیں پتہ ہے کہ ہم لاسٹ ٹائم ان سے کس ایریا میں ملے تھے کیونکہ مجھے یاد نہیں ہے۔'' وہ کیک کا پیس لے کر بولا۔

''ہاں..... ایسٹ لندن میں تھا اُن کا گھر..... اسٹریٹ نمبر تو یاد نہیں ہے البتہ اُن کے گھر والی لائن میں ایک سپر اسٹور تھا وہ یاد ہے۔''

''ہم صرف دو دفعہ ہی تو گئے تھے یار..... اتنا بھی یاد ہے تو بہت ہے۔'' سلیم مسکرایا۔

''If You Have Time, Than Lets Go Now''۔

''ہوں..... ٹھیک ہے..... ابھی چلتے ہیں۔'' وہ بولا۔

انہیں گھر ڈھونڈنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی سپر اسٹور کی وجہ سے کام آسان رہا تھا۔ برف پڑ رہی تھی شام میں بالکل رات کا سا سما تھا۔

''یار یہ ہی ہے ناں؟'' حیان ایک گھر کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''ہوں یہ ہی ہے۔'' سلیم اردگرد کا جائزہ لے کر بولا۔

اس نے بیل بجائی تو دروازہ ایک شلوار قمیض پہنے ہوئے عورت نے کھولا۔

''پرویز فاروقی سے ملنا ہے۔'' وہ قدرے حیرت سے بولا۔

''سوری جی' مگر یہاں تو کوئی پرویز فاروقی نہیں رہتے۔'' عورت نے معذرت کی۔

حیان کو ایک دم مایوسی نے آن گھیرا۔

''آپ لوگ کب سے ہیں یہاں؟'' سلیم نے سوال کیا۔

''او جی کوئی چار سالوں سے۔'' وہ جلدی میں لگ رہی تھی جواب کے ساتھ ہی دروازہ بند کر دیا۔

''اب.....؟'' حیان مڑا..... وہ مایوس لگ رہا تھا۔

''Take It Easy..... تو تو پریشان ہو گیا ہے۔'' سلیم مسکرایا۔

''ساتھ والے گھر سے پوچھ لیتے ہیں ویسے بھی یہاں پردیسی کے لوگ ہیں یقیناً کوئی نہ کوئی جانتا ہوگا۔''

''ہوں چلو۔'' وہ آگے بڑھا۔

انہوں نے ساتھ والے گھر کے دروازے پر بیل دی تو ایک بزرگ نکلے۔

''لیں.....!'' وہ بولے۔

''انکل آپ کے ساتھ والے گھر میں پرویز فاروقی رہا کرتے تھے۔''

" Do You Know Any Thing About Him Where Is He Now?"

سلیم بولا۔ انہوں نے سر سے پاؤں تک دونوں کا جائزہ لیا۔

''تم دونوں کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ایکچوئلی انکل یہ اُن کا بھتیجا ہے۔'' اُس نے حیان کی طرف اشارہ کیا۔ جو جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا ان دونوں کی طرف متوجہ تھا۔

''پاکستان سے ان سے ملنے آیا ہے...... یہ اس لیے پوچھ رہا ہے۔''

''ہوں...... اندر آجاؤ'' وہ مسکرائے۔ اور اندر کی طرف بڑھ گئے۔

''چل آجا لگتا ہے کام بن گیا ہے انکل یقیناً کچھ جانتے ہیں۔'' وہ مسکرایا تو حیان بھی مسکرا دیا۔

وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے کہ انکل دوبارہ آگئے۔

''یہ اُس کا ایک سال پہلے تک کا پتہ ہے میرے پاس چانس ہیں کہ وہ اب بھی یہیں رہتا ہوگا۔ کیونکہ پچھلے ایک سال سے میری کوئی ملاقات نہیں ہوئی ہے اس سے۔'' وہ ہاتھ آگے بڑھا کر بولے۔ حیان نے فوراً وہ چٹ پکڑ لی۔

''انکل کوئی نمبر ہوگا۔'' وہ ایڈریس دیکھ کر بولا۔

''ہاں شاید ہوگا تم رُکو...... بیگم بچے آئے ہیں اُن کے لیے کچھ لاؤ۔'' وہ آواز دے کر بولے۔

''نو انکل، تھینکس...... اس کی ضرورت نہیں۔'' حیان نے کہا۔

مگر وہ اَن سنی کر کے ٹیبل پر موجود کتابوں کو کھنگالنے لگے۔

''رہنے دے یار تیرے چکر میں دوپہر کا کھانا مس کر دیا میں نے' اب مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

سلیم نے کہا اور ہنس دیا۔

''تو نہیں بدلا پیٹو۔'' وہ ہنسا۔

اتنے میں ایک خاتون ٹرالی گھسیٹے آگئیں۔

انہوں نے سرو کیا۔

''شکریہ آنٹی بہت بہت...... مگر آپ نے بہت زیادہ تکلف کیا۔'' حیان بولا۔

''لو......! اس میں تکلف کیسا؟ اتنے عرصے بعد اپنے وطن کا کوئی مہمان آیا ہے۔'' وہ مسکرائیں۔

''سنیں یہ کس کا پوچھ رہے ہیں؟'' وہ اپنے خاوند سے مخاطب ہوئیں۔

''وہ اپنا پرویز نہیں تھا...... جو پہلے یہاں رہتا تھا۔'' وہ مصروف انداز میں بولے۔

''وہ پرویز جس کی بیٹی گھر سے بھاگ گئی تھی۔'' وہ بے اختیار بولیں۔

''حیان اور سلیم کے منہ میں جاتے ہاتھ رُک گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔

''اوہ......'' خاتون اپنی بے اختیار پر خود بھی شرمندہ سی لگیں۔

''بیٹا آپ لوگوں کو کچھ اور چاہیے؟'' وہ ادباً بولیں۔

''نہیں، نہیں پلیز بہت ہی زیادہ تکلف کر دیا آپ نے۔'' حیان نے کہا۔

اور خاموشی سے چائے پینے لگا۔

''لو مل ہی گیا نمبر۔'' انکل بولے۔

''شکریہ انکل بہت بہت شکریہ آپ نے ہمارا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔'' حیان مشکور ہوا۔

''کوئی نہیں...... بیٹا اگر ملو تو میری طرف سے بھی سلام کہنا۔'' وہ بولے۔

''جی ضرور۔'' وہ بولا اور اُٹھ گیا۔

وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے تو سلیم نے سوال کیا۔

''تیرے چچا کی کوئی اولاد بھی ہے کیا؟''
''ہاں ایک بیٹی تھی۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔
''تو یقیناً یہ خاتون اُن ہی کا ذکر کر رہی ہوں گی۔''
''ہوں......'' وہ بولا۔
''اچھا ایڈریس دیکھ کہاں کا ہے؟''
''یار یہ تو ویسٹ لندن کا ایڈریس ہے۔'' حیان بولا۔
سلیم نے ٹائم دیکھا۔
''10 بج رہے ہیں یار کل چلیں۔ مجھے گھر جانا ہے اب۔'' وہ بولا۔
''آخر کو بیوی بچوں والا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔
''ہاں یار کل چلیں گے۔ میں خود بھی تھک گیا ہوں۔'' وہ بولا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ واقعی بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔
اپنے روم میں آتے ہی وہ بے ہوشی کی جو نیند سویا تو آنکھ پھر صبح دس بجے کھلی تھی۔ وہ اٹھا اور فریش ہو کر ناشتے کا آرڈر دیا۔
ہاتھ میں چٹ پکڑے ایک بار پھر ایڈریس کو ذہن نشین کر رہا تھا۔
''اگر چاچا یہاں بھی نہ ملے تو...... شاید مسئلہ ہو جائے۔'' وہ سوچ رہا تھا کہ موبائل فون بج اٹھا۔
''ہاں سلیم یار کیسا ہے؟'' وہ کال ریسو کر کے بولا۔
''میں گیارہ بجے تک آؤں گا تو تیار رہنا۔'' وہ بولا۔
''ہوں' ٹھیک ہے۔'' وہ مشکور ہوا۔
''اگر تو نہ ہوتا نا یار تو مجھے بہت مسئلہ ہو جاتا تیرے ہونے سے میں بہت مطمئن ہوں۔'' حیان نے مشکور انداز میں کہا۔
''یار دوست ہوتے کس لیے ہیں اور یہ کہہ کر میری دوستی کو شرمندہ نہ کر او کے۔'' وہ خفا ہوا۔
''چل ویٹ کر میری بیگم گرما گرم ناشتہ لے آئی ہے کر کے آتا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔
''او کے......'' وہ بھی مسکرا دیا۔
گیارہ بجے کے قریب وہ اپنے ہوٹل کے باہر کھڑا اُس کا انتظار کرتے ہوئے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ سڑکیں اب بھی ویسی ہی مصروف تھیں۔ ویسے ہی لوگ بھاگم بھاگ سے تھے۔
گاڑیاں اب بھی اتنی ہی رواں دواں تھیں۔
موسم' لوگ' سڑکیں' ماحول کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ بدلا تھا تو وہ حیان فاروقی تھا۔
اس نے لندن میں آ کر ہی تو جینا سیکھا تھا۔ زندگی کا لطف اٹھانا اسے اس جگہ نے ہی سکھایا تھا۔
''زندگی...... آہ......'' اُس کے منہ سے سسکی نکلی۔
''میری زندگی...... میری شزا تھی۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔
''کاش تم وہ نہ کرتیں...... کاش شزا......'' وہ بے اختیار بولا۔
اتنے میں گاڑی اس کے سامنے رُکی۔ تو سلیم نے ہاتھ ہلایا۔
وہ مسکراتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔
''یار دعا کر کہ آج مجھے چاچا مل جائیں۔'' حیان نے سلیم کی طرف رُخ کیا۔
''ہوں...... ویسے کتنے عرصے کے لیے آیا ہے تو؟''
''15 دنوں کے لیے۔''
''اور آج تو تیرا دوسرا دن ہے یار مل جائیں

گے وہ۔'' سلیم مسکرایا۔

''ویسے ہوا کیا تھا کہ بڑے بابا نے اپنا فیصلہ بدل لیا'' وہ حیرانی سے بولا۔

''ٹھیک سے نہیں پتہ یار لیکن یقیناً بات بہت بڑی ہی ہوگی ورنہ بابا جان اپنے کیے ہوئے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے کے عادی نہیں ہیں۔''

''ہوں..... ٹھیک کہتا ہے تُو.....'' سلیم بھی متفق تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ ویسٹ لندن کے ایریا میں داخل ہوئے۔

''یار علاقہ تو آ گیا ہے اب آگے؟'' سلیم نے کہا۔

''تُو کبھی پہلے آیا ہے یہاں۔'' حیان نے سوال کیا۔

''ہاں آیا ہوں مگر ٹھیک سے جانتا نہیں ہوں اس علاقے کو۔'' وہ مسکرایا۔

''حد ہے بھئی اتنے سالوں سے رہ رہا ہے یہاں ابھی تک پورا لندن نہیں گھوما ہے۔'' حیان نے سر مارا۔

''جی بالکل' یہ تمہارے شہر کی طرح چھوٹا شہر تو ہے نہیں جو دو تین دن لگا کر گھوم لوں اور میں تمہاری اور شزا کی طرح گھومنے پھرنے کا شیدائی بھی واقع نہیں ہوا ہوں۔'' وہ معصوم شکل بنا کر بولا۔

شزا کا نام سنتے ہی حیان کے چہرہ پر موجود مسکراہٹ ایک دم غائب ہوگئی۔

سلیم کو ایک دم اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

''سوری یار..... وہ بس منہ سے پھسل گیا تھا'' وہ شرمندہ ہوا۔

''Its Ok۔''

حیان نے سامنے نگاہیں مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

''ویسے یار میرا خیال ہے کہ خود ڈھونڈنے سے بہتر ہے کہ کسی رہائشی سے پوچھ لیں؟ کیا خیال ہے؟''

''ہوں ٹھیک ہے۔'' حیان نے سر ہلایا۔

''وہ سلپ لایا ہے نا جو کل انکل نے دی تھی؟''

''ہاں..... یہ لے.....'' حیان نے پیپر سلیم کو پکڑا دیا البتہ فون نمبر والا پیپر دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ سلیم گاڑی سے اترا اور سامنے کھڑے شخص سے پوچھنے چلا گیا جبکہ حیان جگہ کا جائزہ لینے لگا۔

دو منٹ کے بعد وہ مسکراتا ہوا واپس آ گیا۔

''چل یار کام بن گیا بڑا لکی ہے تُو جو تجھے خجل خوار نہیں ہونا پڑا ہم بالکل صحیح جگہ پر ہیں۔''

''اگلے موڑ پر جو اسٹریٹ ہے وہ ہماری منزل ہے۔''

''شکر ہے خدا کا۔'' حیان بے اختیار بولا۔

پانچ منٹ کے بعد وہ اپنے مطلوبہ مقام کے سامنے کھڑے تھے۔

''یار گھر کی حالت تو کافی خستہ ہے۔'' سلیم نے مکان کا جائزہ لیا۔

''ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کوئی مکین کبھی رہا ہی نہ ہو'' گھر کا رنگ و روغن بالکل ماند پڑ چکا تھا۔ گھر کے باہر دونوں اطراف راہداری کی جو جگہ تھی وہاں پودے بالکل مرجھا گئے تھے۔ جیسے کافی عرصے سے توجہ کے منتظر رہے ہوں۔

البتہ کھڑکیوں کے اوپر پردے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ یہاں کوئی رہتا ہے۔

آس پڑوس کے گھروں میں وہ گھر بالکل مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگ رہا تھا۔

حیان نے تفصیلی نگاہ ڈالی۔

''چل یار دیکھتے ہیں۔'' وہ گھر کی حالت سے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ اگر یہاں چاچا رہتے ہیں تو اُن کی حالت کیا ہوگی۔ اس نے افسوس سے سر کو جنبش دی اور آگے قدم بڑھائے۔

حیان نے گلفو پہنے ہاتھوں سے دروازہ بجایا۔ اور انتظار کرنے لگا۔ جبکہ سلیم گھوم پھر کر گھر کا جائزہ لینے لگا۔

دوبار' تین بار یہاں تک کہ 10 بار انہوں نے دروازہ پیٹا مگر جواب ندارد تھا۔

''کیا ہے؟ کہاں ہیں یہ لوگ؟'' حیان نے غصے میں آ کر ہاتھ زور سے دیوار پر مارا۔

''ریلیکس یار..... کیا پتہ وہ یہاں رہتے ہی نہ ہوں۔'' سلیم نے کہا۔

''ہوں یہ بھی ہوسکتا ہے..... یا پھر کہیں گئے ہوں۔'' اس نے دوسرا جواز سوچا۔

''ہوں.....'' سلیم نے کندھے اچکائے۔

جھاڑیوں کے بیچ اسے دیوار پر کچھ چمکتا نظر آیا۔

''یار حیان وہ کیا ہے جو ہلکا سا شائن کررہا ہے؟'' اس نے حیان کو متوجہ کیا۔

دروازے کے ساتھ لگی بیل جو سوکھ چکی تھی ماتم کناں لگ رہی تھی اس کی مردہ شاخوں نے دیوار پر اب بھی قبضہ جما رکھا تھا۔

حیان نے خشک شاخوں کو توڑا تو نیم پلیٹ پر سنہری حروف میں لکھا تھا۔

''پرویز فاروقی.....'' حیان کو نام پڑھ کر انجانی سی خوشی ہوئی۔

''شکر اللہ کا.....'' بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا۔

''سلیم چاچا کا نام لکھا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''اوہ گڈ..... مطلب گھر تو یہ ہی ہے۔'' اس نے لمبا سانس لیا۔

''مگر ہیں کہاں؟'' حیان اس کے سامنے گیا۔ سلیم نے کندھے اُچکائے۔

''ہاں یار یاد آیا چاچا کا نمبر ہے میرے پاس..... اس نے فوراً جیب ٹٹولی..... اور نمبر نکالا اور سرعت میں ڈائل کرنے لگا۔

آگے سے فون بند ملا.......

''یار بند ہے فون.....'' حیان کو پھر مایوسی ہونے لگی۔

''چل یار دوبارہ ٹرائی کرلے.....'' سلیم نے حوصلہ دیا۔ حیان نے کئی بار ٹرائی کیا۔ مگر ندارد.......

سلیم اتنی دیر میں اردگرد سے پتہ کرتا رہا۔ کسی کو کوئی خبر نہیں تھی۔

''یار کوئی چانس نہیں ہے' اب؟'' سلیم بھی مایوس ہوگیا۔

''چل بھئی واپس چلتے ہیں۔'' حیان مایوس ہوکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''شکریہ یار تُو نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔'' وہ شرمندگی سے بولا۔

''چل کوئی نہیں۔'' سلیم نے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''اب کیا کرے گا؟''

''ہوں سوچا نہیں..... ہوٹل چھوڑ دے مجھے۔''

''چل یار پھر گھر چل تجھے اپنی فیملی سے ملواتا ہوں اور اچھا سا ڈنر کراتا ہوں۔ کیونکہ دوپہر کا کھانا تو گول ہوگیا ہمارا۔'' وہ مسکرایا۔

''نہیں یار..... شکریہ پھر کسی وقت ابھی میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ ممنون ہوا۔

''چل جیسے تیری مرضی......''
''تھینکس......'' وہ مسکرایا۔
ڈنر کرنے کے بعد ایک بار پھر اس نے کوشش کی مگر فون بند ہی ملا تھا۔

☆......☆......☆

''حیان کا کوئی فون آیا ہے؟'' رات کو کھانے کی میز پر ناصر فاروقی نے سب سے دریافت کیا۔
''اُن کا پہلے کبھی فون آیا ہے جواب آئے گا۔'' عثمان نے سلاد ڈالتے ہوئے کہا۔
''جی بالکل...... میں بالکل متفق ہوں۔'' شانزے نے ہامی بھری۔
''چپ رہا کر لڑکی بہت بولتی ہے تو......'' سائرہ نے آنکھیں دکھائیں۔
''بھئی اس نے ہمیں فون کر کے کیا کرنا ہے۔ بلکہ وہ اس گھر میں شاید ایک ہی کو اپنا کچھ سمجھتا ہے اور وہ ہیں بابا جان۔'' شہلا نے بھی حصہ لیا۔
''لیکن وہ لندن گیا کیوں ہے پاپا؟'' شہریار نے نذیر فاروقی سے پوچھا۔
''بیٹا تمہارے چاچا ہیں ناں پرویز انہیں لینے گیا ہے۔'' نوجوان پارٹی کا ہاتھ جہاں جہاں تھا وہیں رُک گیا۔
''کیا کہا پاپا؟'' شہزاد بولا۔
''ہوں صحیح سنا ہے تم سب نے۔'' عالیہ نے کہا۔
''بڑے پاپا نے معاف کر دیا کیا؟'' سائرہ نے کہا۔
''ظاہر ہے باجی کیا ہوگا تبھی لینے گئے ہیں ناں......'' ریحان ریلیکس لگ رہا تھا۔
''حیرت ہے بھئی......'' شہریار دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔
''بھئی مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ آخر بڑے بابا کے دماغ میں یہ بات آئی کیسے۔'' گیارہ بجے کے قریب گھر کی جوان ٹولی سٹنگ روم میں بیٹھی تازہ مسئلے پر ڈسکس کر رہی تھی۔ جبکہ سبھی بڑے آرام کی غرض سے اپنے اپنے روم میں چلے گئے تھے۔
''مجھے بھی سمجھ نہیں آیا۔'' شانزے کے سوال پر ریحان کا بھی ردِعمل وہی تھا۔
''جو بھی ہو بات تو بڑی ہی ہوگی۔'' عثمان نے چینل چینج کیا۔
''لیکن کیا؟'' شہزاد نے کہا۔
''ہوسکتا ہے چاچا کا فون آیا ہو۔'' سائرہ نے کہا۔
''آپ کو کیا لگتا ہے باجی کے دادا صرف ایک فون پر ہی پگھل جائیں گے۔'' شہزاد نے سوال داغا۔
''چلو جو بھی ہو...... حیان ہی کو کیوں بھیجا ہے؟'' عثمان نے کہا۔
''لو......اس میں حیرت کس بات کی ہے۔ وہ بڑے بابا کا سب سے لاڈلہ بچہ ہے، بقول اُن کے سب سے ذمہ دار۔'' شانزے نے جل کر کہا۔
''نہیں مجھے لگتا ہے بات کچھ اور ہے۔'' سائرہ پُرسوچ انداز میں بولی۔
''یقیناً حیان کو پتہ ہوگا کہ چاچا کہاں رہتے ہیں اور عین ممکن ہے کہ وہ ملا بھی ہو چاچا سے۔'' یہ صرف وہ سوچ سکی مگر بولی نہیں۔
''ویسے چاچا کا کوئی بچہ وغیرہ ہے کیا؟ کیونکہ اس سے پہلے ذکر ہی نہیں ہوا اُن کا۔'' ریحان ایکسائیٹڈ ہوگیا۔
''میرا خیال ہے کہ ایک بیٹا اور بیٹی ہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

شاید.....'' شہزاد نے کہا۔

''نہیں جی صرف ایک بیٹی ہے۔'' شانزے نے تردید کی۔

''تمہیں کیسے پتہ؟'' شہریار حیران ہوا۔

''بھئی پتہ ہی ہوگا بڑوں کی باتیں ہمارے گھر میں چھپ چھپ کر کون سنتا ہے۔'' عثمان نے ٹانگ کھینچی..... تو سب ہنس دیے۔

''اڑا لو مذاق مگر جو بھی کہو مزا بہت آتا ہے اور میرے پاس ایسی خبر بھی ہے کہ سب کے ہوش اڑ جائیں گے۔'' شانزے فخریہ انداز میں بولی۔

'' بتانا نا..... موٹو.....'' سب متوجہ ہوئے۔ ریحان نے جلدی سے ٹی وی بھی بند کر دیا۔

''ویسے بنتا تو نہیں ہے بتانا لیکن بات ہی ایسی ہے۔'' وہ مزید تجسس بڑھا رہی تھی۔

''بول بھی پڑو..... نا یار.....'' عثمان سے رہا نہیں جا رہا تھا۔

''یار وہ میں نے مما اور چاچی کی باتیں سنی تھیں۔'' وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔

''اونچا بولو تھوڑا لڑکی۔'' شہریار ذرا دور بیٹھا تھا اس لیے اسے پریشانی ہو رہی تھی۔

''بھائی اونچی آواز میں بتانے والی بات ہوتی نا تو بتا دیتی۔ اگر مما نے سن لیا نا تو جوتے پڑ جائیں گے مجھے۔'' وہ شہلا فاروقی کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''اوہ..... اچھا اچھا.....'' وہ قریب کھسک آیا۔

سارے بھی قریب ہوئے۔

''ہاں بولو۔'' سائرہ نے کہا۔

''پتہ ہے مما کے کزن ہیں جو باہر چاچا کے قریب ہی کہیں رہتے تھے انہوں نے مما کو بتایا تھا کہ.....''

وہ بولنے ہی والی تھی کہ سامنے کا دروازہ کھلتے دیکھ کر اس کا سانس رُک گیا۔

شہلا فاروقی کمرے سے نکلیں اُن کے ہاتھ میں جگ تھا وہ شاید پانی لینے جا رہی تھیں...... چونکہ صرف شانزے کا منہ اس طرف تھا اسی لیے صرف اسی نے دیکھا تھا۔

''بول بھی پڑ شانزے تجھے کیوں سانپ سونگھ گیا ہے۔'' شہزاد نے اُسے چٹکی کاٹی۔

''آؤ وچ بھائی۔'' وہ سسکی۔

''ارے تم لوگ یوں اس طرح کیوں بیٹھے ہو رات کے 12:30 بجے؟'' شہلا کچن میں جانے کی بجائے اُن کی طرف آ گئیں۔

وہ سب ایک دم بوکھلا گئے جیسے چوری پکڑی گئی ہو..... کیونکہ اُن کے گھر میں یہ اصول رائج تھا کہ بچے بڑوں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتے۔

''ایسے ہی تائی جان۔'' عثمان نے سب سے پہلے کہا۔

''کچھ چل رہا ہے تم لوگوں کے درمیان؟'' وہ مشکوک ہوئیں۔

''ن..... نہیں ماما..... بالکل نہیں۔'' شانزے نہایت معصومیت سے بولی۔ کیونکہ اگر انہیں ذرا بھی بھنک ہو جاتی تو اُس کی شامت آنی تھی۔

''آپ کو کچھ چاہیے تھا ماما..... سائرہ نے جگ کی طرف اشارہ کیا۔

''ارے ہاں تمہارے پاپا کے لیے پانی لانے جا رہی تھی۔ تم لوگوں کو یوں سر جوڑے دیکھا تو چلی آئی۔'' وہ جگ کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔

''لائیں میں لادوں۔'' سائرہ اٹھنے لگی۔
''نہیں ...... میں لے لوں گی۔'' وہ کہہ کر واپس پلٹ گئیں۔
''شکر ہے......'' سب کا رُکا ہوا سانس بحال ہوا۔
''بال بال بچی میں تو۔'' شانزے کمر سیدھی کر کے بولی۔
''جاؤ میں نہیں سن رہی بات تمہاری۔'' سائرہ قدرے ڈرپوک تھی وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ جبکہ باقی ڈھیٹ بنے بیٹھے تھے۔
''نا...... سنو تمہاری مرضی بعد میں نہ کہنا بتایا نہیں تھا۔'' شانزے 'نا' پر بہت زور دیتے ہوئے بولی۔
سائرہ چند قدم چلی ...... پھر واپس مڑ آئی تجس کے مارے......
سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔
''باجی ڈرپوک تم جہاں کی ہو اور رہا تم سے جاتا نہیں ہے۔'' ریحان ہنستے ہوئے بولا۔
''بکواس نہ کرو۔'' وہ غصے سے بولی۔
''جلدی بتاؤ اس سے پہلے کہ کوئی اور آجائے۔'' شہزاد بے زار نظر آنے لگا تھا۔
''مجھے بھی صبح کالج جانا ہے...... مجھے آپ سے زیادہ جلدی ہے۔'' شانزے گھڑ کو دیکھ کر بولی تو ایک بجے کا ہندسہ بتا رہی تھی۔
''ہاں میں کہاں تھیں؟''
''تائی کے کزن......'' عثمان جلدی سے بولا۔
''ہاں ہاں...... وہ بتا رہے تھے کہ چاچا کی جو بیٹی ہے وہ گھر سے تھوڑے عرصے پہلے بھاگ گئی تھی۔'' اس نے اپنے تئیں دھماکا کیا۔
''What......'' شہریار کو شاک لگا۔

''اور چاچی......وغیرہ......'' ریحان نے اگلا سوال کر دیا۔
''بھئی اب اتنا نہیں پتہ ہے کہ چاچی ہیں کہ نہیں ہیں وہ واپس آئی کہ نہیں آئی۔'' شانزے پلو جھاڑ کر بولی۔
''جتنی انفارمیشن تھی اتنی دے دی ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
''کب پتہ چلا تمہیں؟'' شہزاد نے کہا۔
''کوئی مہینہ پہلے......'' وہ کندھے اُچکا کر بولی۔
''اور کسے بتایا ہے تُو نے؟'' سائرہ ابرو اُچکا کر بولی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شانزے پیٹ کی ہلکی ہے۔ اس سے رہا نہیں جاتا بتائے بغیر۔
''بس عیشاء کو بتایا ہے؟'' وہ شرمندگی سے بولی۔
''بہت بری بات ہے شانزے تمہیں نہیں بتانا چاہیے تھا۔'' سائرہ ڈانٹتے ہوئے بولی۔
''باجی اگر اسے نہ بتاتی نا تو اس رات سے اب تک سو نہیں پاتی نا۔'' وہ بچوں کی طرح بولی۔
''اچھا بھئی شب بخیر بڑی دیر ہوگئی ہے صبح جانا بھی ہے۔'' وہ دامن بچا کر نکل جانا چاہتی تھی مبادا اوروں سے بھی سننا پڑے۔
''کب بڑی ہوگی یہ لڑکی......'' سائرہ نے سر تھام لیا۔
''ویسے عجیب سی نیوز نہیں ہے یہ۔'' شہریار نے سبھی کا دھیان اپنی جانب کیا۔
''بھائی آپ ایویں اس کی باتوں میں آرہے ہیں پتہ نہیں ہے کیا اس کا ہوتا کچھ اور ہے وہ سنتی کچھ اور ہے اور اصل بات کچھ اور ہی ہوتی ہے۔'' عثمان ہنسا۔
''اور اگر ہم فرض کر بھی لیں کہ چاچا کی اکلوتی

بٹی بقول شانزے کے بھاگ گئی تھی تو جہاں وہ رہتی ہے پلی بڑھی ہے اس ماحول میں یہ کون سی نئی بات ہے۔'' شہزاد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''ہوں ایگری.....'' ریحان نے ساتھ دیا۔

''جو بھی ہے.....اللہ بہتر ہی کرے۔'' سائرہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''آمین.....'' عثمان نے کہا۔

☆.....☆.....☆

اگلا سارا دن وہ ہوٹل میں ہی رہا۔ سلیم نے معذرت کر لی تھی اسے آفس کا بہت ضروری کام تھا جس کی وجہ سے وہ آ نہیں سکتا تھا۔

حیان ہر تھوڑی دیر بعد فون ٹرائی کرتا تھا۔ مگر جواب میں مایوسی تھی۔

شام کے سائے لہرانے لگے تو وہ کھڑکی میں آ کر دیکھنے لگا۔

نیچے سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ ساتھ میں پیدل چلنے والوں کا بھی رش تھا۔ وہ ابھی یہ ہی سوچ رہا تھا کہ رابطے کا یا ڈھونڈنے کا کوئی اور ذریعہ کیا ہو کہ اُس کا سیل فون بج اٹھا۔

نمبر دیکھ کر مسکان اُس کے ہونٹوں پر سج گئی۔

''السلام علیکم بڑے بابا.....''

''وعلیکم السلام بابا کی جان..... کیسا ہے یار تُو؟ تُو نے تو ایک بار بھی فون نہیں کیا۔''

وہ شکوہ کناں تھے.....

''بھول گیا کیا اپنے بابا کو؟''

''نہیں بابا جان ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو بھول جاؤں..... ایک آپ ہی تو ہیں میری زندگی کے محور.....'' وہ تڑپ اٹھا۔

''بس بابا جان میں چاچا جان کو ڈھونڈنے میں کچھ زیادہ ہی مصروف رہا تھا۔'' وہ بے تابی سے بولا۔

''ہاں یار میں خود بھی تیرے بغیر اداس ہو گیا ہوں..... تُو نے پرویز کو ڈھونڈ لیا کیا؟'' وہ اس سے زیادہ شدت سے بے تاب محسوس ہوتے تھے۔

''جی بڑے بابا..... میں نے گھر تو ڈھونڈ لیا ہے..... اللہ کا شکر ہے زیادہ مسئلہ نہیں ہوا ہے..... مگر.....''

''مگر کیا؟'' وہ یکدم بولے۔

''وہ ملے نہیں ہیں مجھے..... اُن کا فون نمبر بھی ہے مگر ریسیو نہیں کیا گیا ہے ابھی تک.....'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

وہ جانتا تھا کہ بڑے بابا کا کیا حال ہو رہا ہوگا.....

''یار کہیں وہ کسی مصیبت میں تو نہیں ہے؟'' وہ پریشان لگ رہے تھے۔

''نہیں بابا جان مجھے لگتا ہے شاید کہیں گئے ہوں گے ویسے بھی یہاں پر آج کل چھٹیاں ہیں ناں۔'' وہ جھوٹ بول گیا۔

''ہوں..... اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔'' اُن کی آواز میں واضح پریشانی تھی۔

''بالکل ایسا ہی ہوگا بابا جان آپ فکر نہ کریں۔'' وہ مسکرایا۔

''اچھا بابا جان مجھے ذرا کام ہے میں بعد میں کال کرتا ہوں۔'' اس نے اجازت چاہی۔

''حیان میرے پرویز کو لے کر لوٹیں یار..... میرا دل تڑپ رہا ہے اس سے ملنے کو.....'' وہ بولے۔

''انشاء اللہ بابا جان لے کر ہی آؤں گا۔'' اس نے ہمت بندھائی اور رابطہ منقطع کر دیا۔

فون بند کرنے کے بعد اس نے لمبا سانس لیا۔

''اللہ چاچا جلدی مل جائیں اور وہ بھی صحیح سلامت۔'' بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا۔

☆......☆......☆

حیان سے بات کرنے کے بعد اُن کا دل بوجھل سا ہوگیا تھا۔ وہ بے اختیار اٹھے اور مصلہ بچھا کر زاروقطار اپنے خدا کے آگے رونے لگے۔

''یا خدا...... میرا بچہ بہت مشکل میں ہے یہ میرا دل کہتا ہے۔ تو اُس کی حفاظت فرما میرے مالک...... تُو سب جانتا ہے میں نے کس طرح اپنے کلیجے پر پتھر رکھا ہے اتنے عرصے اُس کی جدائی کا...... مجھے تُو اس سے ملا دے میرے مالک...... ملادے......'' وہ سربسجود ہوئے بس روئے جارہے تھے۔

☆......☆......☆

اگلے روز حیان پھر اکیلا ہی اُن کے گھر کی طرف گیا مگر ایک بار پھر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے اردگرد سے پھر سے اپنے طور پر معلوم کرنا چاہا تو اسے صرف اتنا پتہ چل سکا کہ وہ کوئی ہفتے بھر پہلے سے یہاں نہیں ہیں...... حیان کو کچھ اطمینان ہوا کہ چلو کم از کم یہ تو کنفرم ہوا کہ وہ یہیں رہ رہے تھے۔

مگر گئے کہاں؟ یہ سوال تشویشناک تھا۔ اس شام وہ کیفے میں سلیم سے ملا...... سلیم معذرت کررہا تھا کہ وہ اُس کا ساتھ بھرپور طریقے سے نہیں دے پارہا۔

''یار جو میری گوری باس ہے ناں وہ بہت ہی......'' وہ نازیبا الفاظ نکالنے والا ہی تھا کہ حیان نے روک دیا۔

''جانتا ہوں یار......کوئی نئی بات بتا...... مجھے بھی تجربہ ہے اس بات کا تو بھول گیا شاید۔'' حیان ہنس پڑا۔

''ارے ہاں وہ جاب ناجو ہم تینوں نے مل کر کی تھی۔'' سلیم کچھ یاد آنے پر ہنس دیا۔

''ہاں وہی۔'' حیان بھی ہنس دیا۔

''یار کیا دن تھے ناں وہ بھی...... سچ لگتا تھا کہ واقعی زندگی جی رہے ہیں اب تو لگتا ہے کہ زندگی ہمیں الٹا جی رہی ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''صحیح کہتا ہے یار تُو اب تو واقعی زندگی ہی ہمیں جی رہی ہے۔'' وہ بیزار دکھائی دیا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھ کر سلیم نے موضوع بدل دیا۔

''اچھا یار یہ بتا کہ فون مل گیا ہے؟ کوئی اطلاع ملی ہے؟''

''ہوں یار میں آج گیا تھا دوبارہ بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ چند دن پہلے تک وہ تھے مگر اب نہیں ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ گئے کہاں اور فون کیوں نہیں اٹھا رہے۔'' وہ کافی کا سپ لیے ہوئے بولا۔

''یار مجھے لگتا ہے تُو زیادہ ٹینشن لے رہا ہے۔ کہیں بھی جاسکتے ہیں وہ......کوئی کام ہوسکتا ہے انہیں بھی اور ہوسکتا ہے کہ فون نمبر بدل لیا ہو۔'' سلیم نے کیک کھایا۔

''یار مجھے بڑے بابا کی پریشانی ہے وہ بہت پریشان ہیں ان کے لیے اور بقول بڑے بابا' چاچا کسی مصیبت یا پریشانی سے دوچار ہیں' مجھے اس لیے ٹینشن ہورہی ہے۔''

''ہوں...... ایسی بات ہے؟'' سلیم نے استفسار کیا۔

''ہاں......''

''اگر کل تک کال ریسیو نہ کی تو پھر کوئی اور راستہ نکالنا پڑے گا۔'' حیان بولا۔

''صحیح کہہ رہا ہے تُو......لیکن مجھے لگتا ہے کہ

کام جلد ہو جائے گا تو فکر نہ کر۔'' سلیم بولا۔
''انشاءاللہ......'' حیان بے اختیار بولا۔
☆......☆......☆
اگلے دن وہ دیر تک سوتا رہا...... پھر اٹھا تو سب سے پہلے فریش ہو کر اس نے نمبر ڈائل کیا۔
''اب اگر نہ ہوا تو پولیس سے مدد لینی پڑے گی۔'' وہ سوچ رہا تھا۔
''ہیلو......'' کسی لڑکی کی آواز آئی۔ جیسے اسے شدید زکام ہو۔
''پرویز فاروقی؟'' حیان کو انجانی سی خوشی نے آن گھیرا...... امید کی کرن نظر آئی۔
''یس......'' جواب مختصر تھا۔
''I Want To Talk To Him'' حیان بولا۔
''Who Are You'' سوال مختصر تھا۔
''Hayan Farooqi'' وہ مختصر بولا۔
''فاروقی...... یہ تو ہمارا سر نیم ہے۔'' لڑکی نے سوچا۔
''ہیلو......'' وقفہ لمبا ہوا تو حیان بے تابی سے بولا۔ ساتھ ہی وہ کمرے کا چکر لگا رہا تھا۔
''آپ......؟'' وہ کچھ بولنا چاہ رہی تھی مگر سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے بولے۔
''آپ کون ہو؟'' حیان نے سوال کیا۔
''میں...... میں ان کی بیٹی ہوں۔'' جواب مختصر تھا۔
''اوہ......'' حیان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''چاچا کہاں ہیں؟ میں اُن کا بھتیجا ہوں پاکستان سے آیا ہوں۔'' حیان نے تعارف کروایا۔
''اچھا آپ پاکستان سے آئے ہو......''

آواز میں عجیب سی کھنک پیدا ہوئی۔
''جی...... چاچا؟'' حیان بولا۔
''بابا...... کیا آپ سٹی ہاسپٹل آ سکتے ہو۔'' آواز یکدم اُداس ہو گئی۔
''خیریت تو ہے ناں چاچا ٹھیک ہیں۔'' حیان کے قریب خطرے کی گھنٹی بجی۔
''پلیز آ جائیں۔'' دوسری طرف سے درخواست کی گئی آواز میں واضح تھی جیسے اسے کسی کی شدت سے ضرورت ہو۔
''میں آ رہا ہوں او کے......'' اس نے فون بند کر دیا۔ وہ تیزی سے بڑھا ضروری چیزیں رکھیں کوٹ کی جیب میں اور سرعت سے کمرے سے نکلا۔
ہاسپٹل پہنچ کر وہ تیزی سے ریسپشنسٹ کے پاس گیا۔
''پرویز فاروقی۔'' وہ تیزی سے بولا۔ نرس اسے دیکھ کر مسکرائی۔
''Wait A Second Sir'' وہ نرمی سے بولی۔ اور ساتھ ہی سامنے لگی اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی۔
''Sir Could You Please Tell Me The Name Please'' وہ بولی۔
''Perveez...Perveez Farooqi'' وہ بولا۔
''OK......'' وہ تیزی سے دیکھنے لگی۔
''Sir Third Floor ICU''
''Thanks'' وہ بولا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔
وہ تیزی سے کمروں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر سامنے لکھے ہوئے ICU پر پڑی۔
وہ تیزی سے بڑھا۔ دروازے پر شیشے لگے

تھے جس سے اندر کا منظر نظر آ رہا تھا۔ سامنے چاچا پڑے تھے انہیں وینٹی لیٹر پر مصنوعی سانس دیا جا رہا تھا اور ڈاکٹر اُن کے گرد کھڑے تھے۔

''Mr Farooqi؟'' پیچھے سے ایک نسوانی آواز آئی۔ وہ تیزی سے پلٹا۔

سامنے ایک 23'24 سال کی لڑکی کھڑی تھی۔ کھلی سی جینز اور شرٹ میں ملبوس' وہ شکل سے پریشان اور روئی روئی لگ رہی تھی۔

''ہوں......'' اُس نے تیزی سے سر ہلایا۔

''تم؟ چاچا کی بیٹی ہو شاید......''

''ہوں......'' اس نے بھی سر ہلایا۔

جب وہ پہلے ملا تھا' چاچا سے تب بس اس نے جھلک ہی دیکھی تھی اُس کی......

ڈاکٹرز جیسے ہی کمرے سے باہر آئے۔ وہ حیان کو نظر انداز کر کے تیزی سے اُن کی طرف بڑھی۔

''Doctor My Father?''۔

''Miss Arvisha Your Father's Condition Is Still Critical''۔ یہ سن کر اُس کا چہرہ بالکل مرجھا گیا۔ وہ الٹے قدموں پلٹی اور جا کر چیئر پر بیٹھ گئی۔

حیان کا دماغ تیزی سے معاملات کو جانچ رہا تھا۔ وہ بھی چلتا ہوا آیا اور اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

وہ بہت تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ آنکھ لال اور سوجی ہوئی تھیں۔ سنہری گھنگھریالے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ باندھے اُن پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔

حیان ذہن میں الفاظ ترتیب دے رہا تھا کہ گفتگو کس طرح شروع کرے کہ وہ بول پڑی۔

''میرے بابا ٹھیک نہیں ہیں...... مسٹر فاروقی۔''

''وہ ٹھیک نہیں ہیں بالکل بھی۔'' اُس کی آواز نم ہو گئی۔

''کب سے ہیں وہ ہاسپٹل میں؟''

''5 دن ہو گئے ہیں۔''

''اوہ......ہوا کیا ہے چاچا کو؟''

''فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ اس کے تھوڑے دن بعد نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔'' وہ پہلی دفعہ سر اُٹھا کر بولی۔

''اوہ گاڈ......'' حیان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ڈاکٹر نے کیا کہا ہے اُن کی حالت کے بارے میں؟'' وہ تشویش سے بولا۔

''کہتے ہیں انہیں شدید صدمہ ہوا ہے۔ حالت نہیں سنبھل رہی ہے اُن کی۔'' وہ رو پڑی۔

حیان کو اس سے ہمدردی ہونے لگی۔

اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا...... ایسا لگتا نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کوئی ہو۔

''آپ کے ساتھ کوئی ہے نہیں؟'' وہ تعجب سے بولا۔

اس کا سر نفی میں ہلا۔

''آپ کی مدر؟'' وہ بولا۔

''نام مت لیں اس عورت کا...... نفرت ہے مجھے اس سے میرے بابا کی حالت کی وہ ہی ذمہ دار ہے۔ I Hate Her۔'' وہ ہنکاری۔

اُس کا ری ایکشن بالکل غیر متوقع تھا حیان کے لیے وہ حیران ہوا۔

اتنے میں اس کا سیل فون بج اٹھا۔

وہ ایکسکیوز کر کے دوسرے کونے میں گیا۔

''ہاں یار کیا بات ہے؟''

''تیرے ہوٹل کے سامنے ہوں کہاں ہے

تُو۔'' سلیم بولا۔

''یار چاچا مل گئے ہیں...... وہ سٹی ہاسپٹل میں ہیں تُو آ جا۔'' اس نے مختصر کہا اور فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

''یار واقعی تیرے چاچا کی حالت تو نازک ہے۔'' سلیم نے پرویز فاروقی کو دیکھا تو بولا۔

''انہیں واپس کیسے لے کر جائے گا؟'' وہ ہاسپٹل کے کیفے ٹیریا میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''میں بھی حالات سے تھوڑا ہل گیا ہوں یار...... مجھے نہیں پتہ تھا کہ معاملات اتنے سیریس ہیں۔'' حیان بولا۔

''اب کیا کرنا ہے...... بڑے بابا کو بتائے گا؟'' وہ بولا۔

''نہیں ہرگز نہیں۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''پھر؟'' وہ پریشانی سے بولا۔

''پتہ نہیں یار......'' وہ کندھے اُچکا کر بولا اور سر تھام کر بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

اگلے دو دن بھی اسی طرح گزر گئے...... چاچا کو ہوش نہیں آیا تھا۔ اس نے ڈاکٹرز سے بھی بات کی اُن کے خیال میں چاچا کا بچنا بہت مشکل تھا۔

اروشیہ مسلسل وہیں تھی۔ وہ ہاسپٹل سے کہیں بھی نہیں جاتی تھی۔ اس کی اپنی حالت بھی بہت خراب تھی۔ مسلسل جاگنے اور پریشانی کی وجہ سے اسے بھی بخار ہو گیا تھا۔

بہت اصرار کر کے آج اس نے اروشیہ کو گھر تھوڑا ریسٹ کرنے کو بھیجا تھا۔

ان تین چار دونوں میں حیان نے کسی کو ہاسپٹل آ کر چاچا کی خیریت پوچھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لگتا تھا چاچا کے یہاں زیادہ لوگوں سے تعلقات نہیں تھے۔

اس نے چاچا کی بیوی کے بارے میں دوبارہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی وہ اروشیہ کو بالکل بھی پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ کوریڈور میں بیٹھا آنے والے حالات کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا...... کہ ڈاکٹر نے آ کر بتایا کہ چاچا کو ہوش آ گیا ہے۔

وہ تیزی سے کمرے میں گیا۔

''چاچا جان!'' وہ بے تابی سے اُن کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''کون؟'' وہ بہت کمزور لہجے میں بولے۔

کمزوری کے باعث اُن کی آنکھیں بھی کھل نہیں رہی تھیں...... فالج کی وجہ سے انہیں بولنے میں شدید دقت کا سامنا تھا۔

''میں ہوں حیان چاچا...... پہچانا میں آپ کا بھتیجا ہوں۔'' وہ قریب ہوا۔

''ح...... ا...... ن......'' وہ کوشش کر رہے تھے اسے پہچاننے کی......

''وہ...... پہلے بھی...... تم......؟''

''جی جی وہی ہوں میں مجھے بابا جان نے بھیجا ہے آپ کے لیے...... بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں پھر آپ کو لے کر چلوں گا پاکستان......'' وہ نرمی سے مسکرایا۔

''با...... ب...... ا...... جان...... نے'' الفاظ بے ربط سے نکل رہے تھے اُن کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگے مگر آدھے بے جان سے وجود کے ساتھ وہ ناکام رہے۔

''پلیز چاچا جان آپ لیٹے رہیں آپ کی حالت ٹھیک نہیں۔'' حیان انہیں پکڑتے ہوئے

بولا۔

''مع......ا......ف...... کر......د......یا......

ب......ا۔''

''جی جی......کر دیا ہے معاف......'' وہ فوراً بولا۔ وہ باقاعدہ رو رہے تھے۔

''چاچا جان خود کو سنبھالیں پلیز ورنہ طبیعت پھر خراب ہو جائے گی۔'' وہ گھبرا گیا۔

اچانک اُن کا سانس اکھڑنے لگا......

''پلیز ریلیکس ہوں چاچا جان......'' حیان فوراً اُن کے قریب ہوا۔ انہیں سانس لینے میں مشکل ہونے لگی تو حیان ڈاکٹر کو لینے کے لیے جانے لگا کہ انہوں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ا......ر......ویشہ...... کو...... لے...... جانا...... اور...... با...... با...... کو دے......'' وہ بولنے کی پوری کوشش کر رہے تھے کہ اچانک خاموش ہو گئے۔ حیان کا تھاما ہوا ہاتھ خود بخود آزاد ہو گیا۔

''چاچا جان......'' وہ چلایا۔

''ڈاکٹر......'' وہ تیزی سے باہر بھاگا۔

ڈاکٹر نے آ کر معائنہ کیا اور پھر حیان کی طرف مڑ کر بولا جو بے تابی سے دیکھ رہا تھا۔

''آئی ایم سوری سر......'' ڈاکٹر نے حیان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور چلا گیا۔

''او خدایا......'' اس کے منہ سے نکلا۔

وہ تھکے قدموں سے روم کے باہر آیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اور سر دیوار سے ٹکا دیا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے......

حیان فاروقی جو کب سے یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا دل مردہ ہو گیا ہے اس کے احساسات ختم ہو گئے ہیں وہ کچھ بھی محسوس نہیں کر سکتا...... اسے کسی کی پرواہ نہیں ہے...... وہ آنسو بہا رہا تھا۔

''مسٹر فاروقی۔'' وہ آنکھیں بند کیے کھڑا تھا کہ ارویشہ بولی۔

''آپ یہاں اس طرح کیوں کھڑے ہیں؟ اور ڈاکٹر نے بابا کے بارے میں کچھ کہا ہے کیا۔'' وہ غیر متوقع طور پر جلدی آ گئی تھی شاید صرف کپڑے چینج کر کے ہی آ گئی تھی۔

''چاچا......'' وہ سسکا...... اور نفی میں زور سے گردن ہلانے لگا۔

''نو نو نو...... مسٹر فاروقی...... Do Not Say That۔''

وہ التجائی انداز میں بولی۔

''پلیز پلیز مسٹر فاروقی۔'' وہ تیزی سے بولی۔ ساتھ آنکھیں برسنے لگیں۔

وہ تیزی سے کمرے میں بھاگی وہ بھی پیچھے لپکا سامنے چاچا کی باڈی پڑی تھی۔ جن کے چہرے پر بھی کپڑا تھا۔

''بابا جان...... پلیز اٹھیں...... پلیز WakeUp...... پلیز......'' وہ انہیں جھنجوڑ رہی تھی۔

''اپنی اروی سے بات کریں بابا...... میں ہوں یہاں پلیز......'' وہ اُن کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔

حیان آگے بڑھا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر پیچھے کیا۔

''مسٹر فاروقی...... میرے بابا...... میرے بابا......'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''حوصلہ کریں آپ پلیز ارویشہ'' وہ بولا۔

آگے کے معاملات بہت جلد نمٹتے چلے گئے چاچا کی تدفین وغیرہ جیسے جھٹ پٹ ہی ہو گئی ہو۔

حیان کو بھی سمجھ نہیں آئی۔ وقت بہت تیزی سے سمٹنے لگا تھا۔

چاچا کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا...... اُن کی بیوی نے طلاق کا مطالبہ کیا تھا...... کاروبار تو ویسے ہی تباہ ہوگیا تھا بس رہ کر ایک گھر ہی تھا اور وہ بھی اُن کی بیوی کے نام تھا۔

اروی بس خالی ہاتھوں حیان کے ساتھ پاکستان کے لیے روانہ ہونے کو تیار تھی۔

''تھینکس یار تُو نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔'' ایئر پورٹ پر حیان سلیم سے گلے ملتے ہوئے بولا۔

''شرمندہ نہ کر یار تُو......'' سلیم مسکرایا۔

''اگر تیرے چاچا زندہ ہوتے ناں تو دعوت کھلائے بغیر جانے نہیں دیتا۔'' وہ اروی کی طرف دیکھ کر بولا۔ جو دونوں سے کچھ فاصلے پر کھڑی گم سم سی تھی۔

''اسے چاچا کی موت کا بہت دکھ ہے یار...... اوپر سے اُن کی بیوی نے بھی کچھ اچھا نہیں کیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ کل ہی انہوں نے دوسری شادی کی ہے۔'' حیان افسوس سے بولا۔

''یہ گوریاں ہوتیں ہی ایسی ہیں یار۔'' سلیم نے کہا۔

فلائٹ کی اناؤسمنٹ کی طرف دونوں متوجہ ہوئے۔

''چل یار پھر چلتا ہوں۔'' حیان مسکرایا۔

''بابا کو سلام کہیں۔'' سلیم ایک بار پھر گلے ملا۔

''ضرور...... تُو بھی بھابی کو سلام دی اور بچوں کو پیار......'' وہ بولا اور اندر کی طرف بڑھنے لگا اروی اُس کے قدموں کی خاک پر اس کی پیروی کرنے لگی۔

☆......☆......☆

آج سنڈے تھا اسی لیے سارے گھر والے گھر میں موجود تھے۔ آج سنبل اور ثمرین بھی آئی تھیں۔

عیشاء کو دیکھ کر شانزے خوش ہوگئی تھی۔ عیشاء ثمرین کی اکلوتی بیٹی تھی۔

''یار تم تو اوپر چلو ناں ذرا میرے ساتھ۔'' شانزے اسے کھینچتی ہوئی اوپر کی طرف بڑھ گئی۔

رمضو بابا کے ساتھ سائرہ مل کر چائے کی ٹرالی لے آئی تھی۔

''بھابی حیان کا کوئی فون آیا ہے؟'' ثمرین نے پوچھا۔

''کہاں بی بی...... وہ ہمیں کیوں فون کرے گا۔'' شہلا چائے کا کپ تھامتے ہوئے بولی۔

''حیرت ہے بھابی 15 دن ہونے کو آئے ہیں اور اس نے کوئی خبر ہی نہیں دی۔'' سنبل نے حصہ لیا۔

''باجی آپ کو تو پتہ ہے اس کا...... وہ ہمیں کبھی فون نہیں کرتا ہے...... ہاں یقیناً بابا کو وہ تمام حالات سے آگاہ کرتا رہا ہوگا۔'' عالیہ نے کہا۔

''میری تو سمجھ سے بالاتر ہے یہ لڑکا۔'' سنبل نے کہا۔

''ارے رہنے دیں باجی وہ شروع سے ایسا تو نہیں تھا۔'' ثمرین بھتیجے کے پیار میں بولیں۔

''وہ تو جب سے شزا والا حادثہ ہوا ہے تب سے وہ تھوڑا اروڈ ہوگیا ہے بس......''

''اب ایسا تو نہ کہو ثمرین۔ وہ شروع ہی سے سر پھرا ہے...... کسی کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا وہ۔ ہاں شزا کے بعد تو حد ہی ہوگئی ہے۔ شہلا نے ہنکارا۔

☆......☆......☆

''ہم کدھر جارہے ہیں مسٹر فاروقی......''

ایئرپورٹ سے نکلتے وقت یہ پہلا جملہ تھا جو پورے سفر کے دوران اروی نے پوچھا تھا۔

ورنہ وہ چپ کر کے آئی تھی۔ بس کچھ دیر بعد اپنی آنکھوں کی نمی صاف کر لیتی تھی یا فضا کو گھورتی رہتی تھی۔

حیان کچھ پریشان تھا اس نے چاچا کے انتقال کی اطلاع کسی کو نہیں دی تھی۔ حالانکہ بڑے بابا نے اسے متعدد بار فون کیا تھا۔ مگر وہ سب کچھ نارمل ہے بابا کہہ کر ٹالتا رہا تھا۔

''مسٹر فاروقی!'' اُس کا جواب نہ پا کر وہ دوبارہ تھوڑا قریب ہو کر بولی۔

''ہوں...... کچھ کہا تم نے؟'' وہ ایسے چونکا جیسے بہت گہری سوچ سے اسے نکالا گیا ہو۔

''ہم کدھر جا رہے ہیں؟'' وہ پھر دھیمے لہجے میں بولی۔

''گھر......'' جواب مختصر تھا۔

''او کے......'' اس نے کہا اور اپنے سامان کی طرف متوجہ ہوئی جو صرف ایک بڑے بیگ پر مشتمل تھا۔

☆......☆......☆

دوپہر کا کھانا کافی اچھے موڈ میں کھایا گیا تھا۔ اس کے بعد سبھی لاؤنج میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بڑے پاپا بھی سب میں شامل تھے۔ لڑکے آپس میں تازہ ہونے والے میچ پر گفتگو کر رہے تھے۔ جبکہ شانزے فیشن میگزین پکڑے سائرہ اور عیشاء کو ڈیزائن دکھا رہی تھی۔ باقی بڑوں نے اپنی محفل جمائی ہوئی تھی۔

''فاروقی ولا......'' اس نے بڑی سی کوٹھی کے باہر نیم پلیٹ پڑھی۔ بوگن ویلیا کی بیل نے باہری دیوار اور گیٹ کے اوپری حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔

گیٹ کھلا اور حیان اور اروی اندر داخل ہوئے۔

حیان نے آنے کی اطلاع کسی کو بھی نہیں دی تھی۔ اس لیے اُسے لینے کوئی نہیں گیا تھا۔ اندر راہداری میں بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سیدھے ہاتھ پر بڑا سا لان تھا جس میں مختلف انواع کے پودے تھے۔ سامنے بہت خوبصورت سی بلڈنگ تھی۔ پرانے اور نئے امتزاج کا آرکیٹیکٹ ورک تھا۔

اس نے تفصیلی نگاہ ڈالی اور بیگ سنبھالتے حیان کی پیروی کرنے لگی۔

گلاس ڈور سے پہلے حیان نے توقف کیا...... اروی بہت غور سے اُس کا مشاہدہ کر رہی تھی۔

حیان نے لمبا سانس لیا...... خود کو آنے والے حالات کے لیے وہ تیار کر رہا تھا۔ یہ بات اروی نے بہت شدت سے محسوس کی۔

اُس کی اپنی حالت بھی غیر تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دل میں ہلکی سی خوشی کی رمق تھی اپنی فیملی سے ملنے کی مگر بابا کو کھونے کا غم ہر چیز سے بڑا تھا۔

''کاش آپ بھی میرے ساتھ ہوتے بابا......'' اس نے سوچا اور آنکھوں کے گوشوں سے نمی کو سمیٹ لیا۔

حیان اندر داخل ہوا...... اور چلتا ہوا سامنے سٹنگ ایریا میں آ گیا۔

اروی اس سے چند قدم پیچھے تھی۔

''بڑے بابا......'' اس نے کہا۔ تو اچانک سب متوجہ ہوئے۔

''حیان...... بابا کی جان آ گیا تو......'' وہ لاٹھی کے سہارے کھڑے ہوئے اور مسکرا کر اُس کی طرف بڑھنے لگے۔ گھر کے سبھی افراد متوجہ تھے۔

حیان تیزی سے آگے بڑھا اور اُن کے گلے لگ گیا۔
''بابا جان......'' وہ زیر لب بولا۔
''یار اتنے دن لگا دیے تُو نے...... کیسا ہے تُو اور میرا پرویز کہاں ہے؟'' وہ انہیں ناپا کر پوچھنے لگے۔
اروی گھبراتی گھبراتی آگے بڑھی اور حیان کے پہلو سے نکل کر سامنے آئی۔
سب حیان سے اروی کی طرف متوجہ تھے۔
کھلا سا ٹراؤزر اور شرٹ پہنے گھنگھریالے بالوں میں وہ بہت معصوم سی لگ رہی تھی۔
''یہ...... یہ کون ہے...... حیان؟'' بڑے بابا اروی کی طرف اشارہ کر کے بولے۔
''یہ...... بابا جان پرویز چاچا کی امانت ہے۔'' حیان نے اُس کی طرف اشارہ کیا۔
''میرے پرویز کی بیٹی ہے یہ۔'' وہ خوشی سے بولے۔
''جی......!''
''ادھر آؤ بیٹا......'' انہوں نے اروی کو بلایا۔اس نے حیان کی طرف دیکھا۔
''یہ تمہارے دادا جان ہیں......'' حیان نے مختصر تعارف کروایا۔
اروی نے اثبات میں سر ہلایا اور بڑے بابا کی طرف بڑھی۔
انہوں نے اُسے سینے سے لگا لیا...... اور اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔
''میری بچی......'' وہ بولے اور ماتھا چوم لیا۔
''بھائی آپ نے تو کہا تھا کہ اُن کی بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے۔'' عالیہ شہلا کے کان میں بولی۔
''ہوں...... سنا تو میں نے بھی یہ ہی تھا۔''
شہلا بھی اس آنے والی سے کچھ زیادہ متاثر نہ لگتی تھیں۔
''لو جی...... آ گئی چاچا کی لخت جگر......''
شانزے نے کہا تو سائرہ نے چپت اُس کے سر پر لگا دی۔ جسے دیکھ کر ریحان کی ہنسی نکل گئی۔
''حیان پرویز کہاں ہے؟'' نذیر صاحب آگے بڑھے اور حیان سے استفسار کرنے لگے۔
''ہاں...... یار کہاں ہے وہ؟'' بڑے بابا نے بھی پوچھا۔
''وہ...... بابا......'' حیان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے بتائے۔
''بول نا یار میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔'' وہ اروی کو چھوڑ کر حیان کی طرف بڑھے۔اروی کے اشک جاری ہو گئے۔
''مجھے معاف کر دیں بابا جان مگر میں چاچا کو نہیں لا پایا۔'' وہ شرمندہ لگ رہا تھا۔
''کیا کہہ رہا ہے یار تُو......'' وہ گھبرا گئے۔
''کہاں ہے وہ؟'' بول حیان وہ اسے کندھوں سے تھام کر بولے۔
''بابا جان...... وہ...... اب اس دنیا میں نہیں رہے۔'' حیان نے بابا کو دیکھ کر کہا۔
''حیان کیا کہہ رہے ہو تم؟'' سنبل فوراً اُس کے پاس آئیں۔ جبکہ بابا جان کو شدید صدمہ ہوا تھا۔نذیر نے فوراً بڑھ کر انہیں تھاما اور بٹھا دیا۔
سبھی افراد کو شاک لگا...... وہ حیان کی طرف بڑھے۔
''جی پھوپو چاچا کی ڈیتھ ہوئے ہفتہ ہو گیا ہے۔''
''نہیں...... میرا بھائی......'' پھوپو رونے لگیں اور ساتھ میں ثمرین بھی......
''اور تم نے کسی کو بتایا بھی نہیں حیان؟''

چھوٹے چچا نے کہا۔
''سب کچھ بہت جلد ہی ہوگیا تھا چاچا جان...... مجھے موقع ہی نہیں ملا۔'' وہ ناراض لگ رہے تھے جبکہ حیان شرمندہ ہوگیا گھر کے سبھی افراد افسردہ ہوگئے تھے۔
''بابا کمرے میں چلتے ہیں۔'' بڑے چچا انہیں تھام کر لے گئے۔
بچے آپس میں بات کرنے لگے اور شہلا اور عالیہ سنبل اور ثمرین کو سنبھال رہی تھیں جبکہ مرد سارے اندر بابا جان کے پاس تھے۔
حیان نے اپنا مختصر سا سامان اٹھایا اور اوپر کی جانب بڑھ گیا۔
اروی ایک کونے میں کھڑی تھی اُس کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔
سنبل کی نظر اُس پر پڑی تو فوراً اُس کی طرف لپکی۔
''بیٹا آؤ ناں......'' وہ آنسو پونچھ کر بولیں۔
تو وہ اُن کے ساتھ بڑھی۔
''کیا نام ہے تمہارا؟'' شہلا نے پوچھا۔
''ارویشہ......'' جواب مختصر تھا۔
''ماں کہاں ہے تمہاری؟'' وہ بے لچک ہوکر بولیں۔
''جی......'' اروی گھبرا گئی شہلا کے لہجے پر......
''ماں کہاں ہیں بیٹی...... سوال تو آسان سا ہے۔''
''جی...... جی وہ اب ہمارے ساتھ نہیں تھیں۔'' وہ شرمندہ سی بولی۔
''ہوں...... یہ گوریاں ہوتیں ہی ایسی ہیں۔'' شہلا نے ناک سے مکھی اڑائی تو اروی کا سر مزید جھک گیا اور ماں کے لیے نفرت ایک درجہ اور بڑھ گئی۔
''رہنے دیں بھابی کیا سارے سوال ابھی کرنے ہیں؟''
''جاؤ بیٹا تم آرام کرو......'' ثمرین نے اروی کو پریشان دیکھا تو بولیں۔
''سائرہ' شانزے' عیشاء بھئی اُسے روم میں لے جاؤ اتنا سفر کر کے آئی ہے۔''
''جی پھوپو کیوں نہیں۔'' سائرہ مسکرا کر بولی۔
''آؤ ارویشہ......'' وہ ہاتھ بڑھا کر بولی۔ تو اروی نے مسکرا کر ہاتھ تھام لیا۔
''میں تو اس کے ساتھ روم نہیں شیئر کروں گی۔'' شانزے نے عیشاء کے کان میں کہا۔ اور چلنے لگی۔ وہ کمرے میں آ کر بھی بہت گھبرا رہی تھی۔
''تم ریلیکس کرو۔'' سائرہ نے کہا اور مسکرائی۔
جواباً اروی نے بھی مسکرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔
''ہائے میں عیشاء ہوں......'' عیشاء نے خوشدلی سے ہاتھ آگے کیا۔
جبکہ شانزے کو یہ بات بالکل پسند نہ آئی تھی۔ مگر عیشاء نے سر کو ہلا کر کہا۔
''ریلیکس کرو یار......''
''اروی...... ارویشہ......'' اس نے بھی ہاتھ بڑھایا۔
''Cool Name یار۔'' عیشاء نے مسکرا کر کہا۔
''تھینکس......'' وہ مسکرائی۔
''میں سائرہ ہوں۔'' وہ بیڈ پر بیٹھ کر بولی۔
جواباً اروی بھی مسکرادی۔

شانزے کو اُن کا اس سے اس طرح گھلنا ملنا بالکل بھی پسند نہیں آ رہا تھا۔ لہٰذا وہ کھسکنے والی تھی کہ عیشاء نے کہا۔

''شانزے تم اروی سے نہیں ملوگی؟'' وہ پلٹی اور کھسیانی ہنسی ہنسی۔

''کیوں نہیں۔'' وہ دانت چبا کر بولی۔

''ہائے۔'' اس نے عیشاء کو گھورتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ عیشاء زیر لب مسکرا رہی تھی وہ اس سچویشن سے خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔

اس نے سائرہ کی طرف دیکھا وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

''یہ کمرہ آپ کے ساتھ ہی شیئر کرے گی ناں۔'' شانزے نے سائرہ کو جیسے آگاہ کیا۔

''کیوں نہیں مجھے خوشی ہوگی۔'' وہ خوشدلی سے بولی۔

''شکر اللہ کا.....'' شانزے کے سر سے بوجھ اترا۔

''میرا خیال ہے باجی انہیں آرام کرنے دیتے ہیں۔'' عیشاء اٹھتے ہوئے بولی۔

اروی ان سب کی طرف متوجہ ضرور تھی مگر وہ ذہنی انتشار کا شکار لگ رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کہ کیا چل رہا ہے اُن سب کے درمیان کیونکہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر رہی تھیں۔ روی کو لگا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہوں۔

''اروی تم آرام کرو یقیناً تھک گئی ہوگی۔'' سائرہ اٹھی اس سے پہلے ہی عیشاء بستر خالی کر چکی تھی۔

''جی.....'' وہ بس اتنا ہی بولی۔

وہ تینوں کمرے سے نکل گئیں۔ پیچھے وہ بالکل تنہا رہ گئی۔ اور اس کے اندر اٹھنے والے خدشے شدت اختیار کر گئے۔

اس نے اپنا سر تھام لیا۔

''اللہ جی..... کیا کروں۔'' اس کا سر درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا اور ساتھ ہی آنکھیں برس پڑیں۔

''شانزے.....'' سائرہ غصے سے داخل ہوئی۔

وہ بیڈ پر عیشاء کے ساتھ آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی کہ اچانک یوں افتاد پر گھبرا گئی۔

''کیا ہے باجی؟'' وہ سیدھی ہوئی۔

''کیا رویہ تھا تمہارا اروی کے ساتھ؟'' وہ بلا کسی لحاظ سے بولی۔

''میں بھی یہ ہی پوچھ رہی ہوں باجی؟'' عیشاء نے بھی کہا۔

دونوں نے شانزے کو دیکھا جو منہ بسورے بیٹھی تھی۔

''کیا ہے؟'' وہ منہ چڑا کر بولی۔

''کیا مطلب کیا ہے شانزے، مجھے تمہارے رویے نے بہت دکھی کیا ہے۔'' سائرہ اُس کے قریب بیٹھ کر بولی۔

''باجی اب ایسا بھی کچھ نہیں کیا میں نے۔'' وہ بدستور اپنی بات پر قائم تھی۔

''مگر تمہارے رویے کی وجہ؟ پوچھ رہے ہیں ہم۔'' اب عیشاء بھی سیریس ہوئی۔

''بس ایسے ہی۔'' شانزے تھوڑا ڈھیلی پڑی۔

''یار مسئلہ کیا ہے؟ اور یہ کیا بات ہوئی کہ بس ایسے ہی۔'' عیشاء اسی کے انداز میں بولی۔

''یار سچی بات ہے مجھے اسے دیکھ کر کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' سائرہ بولی۔
''وہ پہلی بار ہم سے ملی ہے اور تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔''
''باجی آپ لوگ شاید بھول رہے ہیں کہ اُس کا کردار ذرا مشکوک ہے۔'' شانزے کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اسے دیکھ کر اسے برا کیوں لگا تھا مگر اُن کے سامنے کوئی تو بہانہ بنانا ہی تھا ناں..... سو بول گئی۔
''کیسی بے وقوفوں والی بات کررہی ہو تم شانزے.....''
''کسی کے کردار پر شک کررہی ہو تم!'' سائرہ کو اُس کی سوچ پر دلی دکھ ہوا تھا۔
''باجی میں نے خود امی کو بات کرتے سنا تھا شاید.....'' وہ ناراض سی بولی۔
''بس کرو تم.....'' سائرہ غصے سے بولی۔
''تمہیں اپنے کانوں پر اتنا یقین کیونکر ہے۔ ہاں..... اور تمہیں کیسے پتہ کہ امی کو خود اس بات پر یقین ہے بھی کہ نہیں۔'' وہ بیڈ سے ایک دم کھڑی ہوگئی۔ سائرہ کے یوں ایک دم بھڑکنے پر وہ تھوڑی ٹھنڈی ہوئی۔
''سوری.....'' وہ شرمندہ تھی۔
''مجھے تمہاری سوچ پر حقیقتاً بہت دکھ ہوا ہے شانزے، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری چھوٹی بہن دوسروں کے متعلق یوں بدگمانیاں پالتی ہے۔'' وہ کہہ کر چلی گئی۔ شانزے اسے روکتے ہی رہ گئی مگر وہ نہیں رُکی۔
''حد ہے شانزے ویسے۔'' عیشاء نے بھی ٹانگ کھینچی۔
''اب تم مت شروع ہوجانا۔'' وہ اسے گھور کر بولی۔
''اوکے فائن.....'' وہ تڑخ کر بولی اور کمرے سے واک آؤٹ کر گئی جبکہ شانزے منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ جیسے ہی اپنے کمرے میں آیا بیڈ پر ڈھ سا گیا اسے لگا جیسے بہت کٹھن سفر سے لوٹا ہو۔
بڑے بابا کے ری ایکشن کا اسے اندازہ تھا اسی لیے اس نے صرف اُن کی موت کی خبر ہی دی تھی۔ باقی چچا کے بیوی سے متعلق اور دوسرے معاملات نہیں بتائے تھے۔
اسے خود بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا حالات کا..... اسے بس اتنا پتہ تھا کہ چچا کا سارا بزنس بالکل برباد ہوگیا تھا۔ اُن کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ سوائے اس گھر کے جو اُن کی بیوی کے نام تھا۔
اسے ارویشہ سے متعلق صرف اتنا ہی معلوم تھا جتنا ان انکل کی بیگم کے منہ سے پھسلا تھا جن کی بدولت وہ چچا تک رسائی حاصل کر پائے تھے۔
اس نے ارویشہ سے کسی چیز کے متعلق سوالات نہیں کیے تھے۔ اس نے بھی اپنی ذات کے متعلق اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔
اس نے واحد بات یہ بتائی تھی کہ اُس کی ماں نے چچا سے طلاق لے کر دوبارہ شادی کرلی ہے۔
سوچ سوچ کر اُس کا دماغ شل ہوتا ہوا محسوس ہوا اسے تو وہ فوراً فریش ہونے چلا گیا۔
''بابا کا کیا حال ہے اب؟'' سنبل نے جیسے ہی نذیر فاروقی اور باقی سب کو کمرے سے نکلتے دیکھا تو فوراً لپکی۔
''ابھی کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر بھی اُن کا معائنہ کر کے گئے تھے۔''
''ہوں..... صدمہ ہوا ہے بابا کو بہت اس لیے طبیعت بگڑ گئی ہے۔'' وہ بولے۔

''بڑے بابا کو آرام کی بہت ضرورت ہے انہیں کوئی بھی ڈسٹرب نہ کرے۔'' شہریار نے کہا۔

سبھی نے سر اثبات میں ہلایا۔

''حیان کہاں ہے ...... ماما......'' عثمان نے عالیہ سے دریافت کیا۔

''اپنے کمرے میں ہوگا۔'' انہوں نے کہا۔

''بیگم کھانے وغیرہ کا انتظام ہے یا نہیں۔'' نذیر فاروقی نے پوچھا۔

''جی ...... دیکھتی ہوں۔'' شہلا نے کہا۔ ساتھ ہی باقی خواتین بھی اُن کے ہمراہ کچن کی طرف چلی گئیں۔

''ریحان دیکھو اگر حیان کمرے میں ہے تو بلاؤ اسے۔'' ناصر فاروقی نے کہا۔

''جی پاپا......'' وہ چلا گیا۔

ناک کر کے وہ کمرے میں آیا تو حیان شیشے کے سامنے کھڑا اپنے گیلے بالوں میں برش کر رہا تھا۔

''بھائی پاپا بلا رہے ہیں۔'' اس کے چلتے ہاتھ رُک گئے اور ساتھ ہی ریحان کی سانس بھی ...... کیونکہ حیان کے تاثرات بدل گئے تھے۔

وہ مڑا چہرہ بے حد سپاٹ تھا۔

''پاپا نے کہا ہے ...... کہ ...... آپ کو بلا لاؤ۔'' وہ بمشکل بولا۔

اسے پتہ نہیں کیوں حیان سے بات کرنا دنیا کا سب سے مشکل ترین کام لگتا تھا۔

''ہوں......'' اس نے گردن ہلائی۔

ریحان فوراً واپس پلٹ گیا۔

''اب ان لوگوں کو ساری تفصیل بتانی پڑے گی۔'' وہ ہنکارا...... اور برش زور سے بیڈ پر پھینک دیا۔ وہ نیچے اترا تو سبھی کو اپنا منتظر پایا۔

گھر کے تقریباً سبھی افراد موجود تھے۔ اس کے تیکھے نقوش کچھ اور تیکھے ہو گئے۔

''لو آ گیا انگری مین۔'' عثمان نے زیرلب کہا۔ جیسے شہزاد نے باآسانی سنا دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

''آپ لوگوں نے بلایا؟'' لہجہ سرد تھا۔ وہ کھڑے کھڑے بولا۔

''بیٹا بیٹھو تو۔'' ناصر فاروقی نے پیار سے کہا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

سفید ٹراؤزر اور کُرتے میں وہ نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔

''جی کہیے۔'' وہ بلاتمہید بولا۔ اسے یوں دوسروں کو صفائیاں دینے سے ہمیشہ چڑ رہی تھی۔ یہ صرف وہی جانتا تھا کہ وہ کس قدر ضبط سے بیٹھا تھا۔

''ہمیں ذرا تفصیل بتاؤ کہ ہوا کیا تھا پرویز بھائی کو۔'' سنبل پھوپو نم آواز سے بولیں۔

''پھوپو جانی...... میں جب ان سے ملا تب وہ آئی سی یو میں تھے۔ اُن کی حالت بہت نازک تھی۔

''مجھے زیادہ موقع نہیں مل پایا ان سے بات کرنے کا۔'' اس نے صاف کہا۔

''کیا ہوا تھا انہیں؟'' ثمرین نے پوچھا۔

''فالج تھا انہیں۔'' جواب پھر مختصر تھا۔

''تمہیں یہ لڑکی کہاں سے مل گئی ہاں؟'' شہلا بے حد چبھتے انداز میں بولیں۔

''ہاسپٹل میں تھی۔'' جواب مختصر تھا۔

''ہاسپٹل میں؟'' لہجہ اب بھی معنی خیز تھا۔

''جی!'' وہ بہت ضبط سے بولا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسایا ہوا تھا۔ ہاتھوں کے رنگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خود کو

کتنا کنٹرول کر رہا تھا۔ اتنی زور سے ہاتھ دبائے تھے کہ خون کی گردش تھم سی گئی تھی اور ہاتھ کالے پڑ رہے تھے۔

''بھئی ہم نے تو سنا تھا کہ لڑکی بھاگ گئی ہے اپنے عاشق کے ساتھ۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔

وہاں موجود بھی لوگوں کو سانپ سونگھ گیا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟'' نذیر صاحب حیرانگی سے بولے۔

''بھئی سچ کہہ رہی ہوں جو سنا وہ بتا دیا۔''

''بھابی پلیز کچھ تو موقع محل دیکھ لیا کریں۔'' سنبل ناگواری سے بولیں۔

''سچ بولنے میں کیا موقع محل ہاں۔'' انہیں اِس طرح ٹوکنا بالکل بھی اچھا معلوم نہیں ہوا تھا۔

حیان اُن کی معلومات پر دل ہی دل میں داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

''بس خاموش رہو تم......'' نذیر فاروقی قدرے غصے میں بولے۔ تو وہ چارو ناچار چپ ہو گئیں۔

''تمہیں کیسے معلوم تھا کہ چچا کہاں ہیں؟'' شہریار پُرسوچ انداز میں بولا۔

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے......'' حیان بے لچک بولا۔

''کچھ اور پوچھنا ہے یا جاؤں؟'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ جس سے صاف ظاہر تھا کہ اب اُس کا کچھ بھی بتانے کا موڈ نہیں ہے۔

سارے خاموش رہے تو وہ چلا گیا۔

شہلا بھی غصے سے چلی گئیں۔

''حد ہے بھابی کی...... ذرا جو سوچ سمجھ کر بات کرلیں۔'' ثمرین کو ان کا یوں بولنا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

''رہنے دو ثمرین کیا فائدہ ہے دل جلانے کا...... وہ نہ کبھی ٹھیک ہوئیں تھیں اور نہ ہو گئیں۔'' سنبل نے بے دھڑک بلند آواز میں کہا۔

وہ وہاں بیٹھے لوگوں کو جتانا چاہتی تھی کہ اُن کا رویہ ہمیشہ تکلیف کا باعث ہی رہا ہے۔

جب وہ سو کر اٹھی تو رات کے گہرے سایے لہرا رہے تھے۔ وہ بستر چھوڑ کر واش روم میں گھس گئی۔

اس نے اپنے بیگ سے کپڑے نکالے اور زیب تن کر کے کمرے سے ڈرتے ڈرتے باہر آئی۔ گھر میں سناٹا تھا۔ وہ دبے قدموں نیچے اتری تو وہاں بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے اُس کی نظر گھڑی پر گئی...... ایک بج رہا تھا رات کا......

''اوہ...... یہ تو کافی ٹائم ہو گیا۔'' اسے افسوس ہوا کہ وہ اتنی دیر تک سوتی رہی تھی۔

اسے شدت سے بھوک لگی ہوئی تھی۔ مگر اسے کچن کا معلوم نہیں تھا کہ وہ کس طرف ہے۔

وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھی کہ کسی نے لاؤنج کا دروازہ کھولا۔

ڈر کے مارے اُس کی دبی دبی چیخ حلق سے برآمد ہوئی۔

''یہاں کیا کر رہی ہو؟'' حیان اسے اس طرح لاؤنج کے بیچ دیکھ کر قدرے حیرانی سے بولا۔

''د...... وہ مسٹر فاروقی۔'' وہ سنبھلتے ہوئے بولی۔

''مجھے...... بھوک لگی تھی۔'' وہ شرمندہ سی بولی۔

''تو جاؤ کچن میں......'' وہ گاڑی کی چابیاں جیب میں ڈال کر بولا۔

وہ سب سے بات کرنے کے بعد شام سے

باہر گیا ہوا تھا اور اب لوٹا تھا۔
''کس طرف؟'' وہ سوالیہ نگاہوں سے بولی۔
''اوہ......'' حیان اُس کی حالت سے آشنا ہوا۔
''آؤ......'' وہ کہہ کر آگے بڑھا اور وہ اس کی پیروی میں چلنے لگی۔
وہ کچن میں لایا۔
''دیکھو جو مل جائے کھالینا۔'' وہ کہہ کر پلٹنے لگا۔
''مسٹر فاروقی۔'' وہ بے اختیار بولی۔
''ہوں......'' وہ قدرے بیزاری سے پلٹا۔
''پلیز تھوڑی دیر رُکیں...... مجھے ڈر لگتا ہے یہاں۔'' وہ بہت معصومیت سے بولی کہ وہ انکار نہیں کر سکا۔
''اوکے......'' وہ اسٹول کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اور اُس کا مشاہدہ کرنے لگا۔
بلیک کلر کے ٹراؤزر اور شرٹ میں ملبوس گیلے بالوں کے ساتھ وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ گھنگھریالے بالوں کے گچھوں سے پانی کی ننھی ننھی بوندیں گر کے قمیض میں جذب ہو رہی تھیں۔ وہ فریج کھول کر کچھ کھانے کو تلاش کر رہی تھی کہ سائرہ کی نظر کچن میں پڑی تو اسے دیکھ کر اندر آ گئی۔
''ارے تم یہاں......'' سائرہ کی آواز پر وہ بے اختیار اچھل پڑی۔
حیان چونکہ دروازے کی اوٹ میں تھا لہٰذا اُسے نظر نہ آیا۔
''کچھ چاہیے تھا تو مجھے بلالیتیں اروی۔'' وہ مشفقانہ انداز میں بولی۔
''جی......'' وہ بس اتنا ہی بولی۔

سائرہ کی نگاہیں جیسے ہی حیان پر پڑیں تو بہت حیرانگی سے بولیں۔
''آپ یہاں حیان؟'' آنکھوں اور لہجے دونوں میں حیرت بہت نمایاں تھی۔ کیونکہ حیان جیسا انسان کا یہاں ہونا ناممکنات میں سے تھا۔
''وہ...... میں نے ہی مسٹر فاروقی کو روک لیا تھا سائرہ باجی۔'' وہ نرمی سے بولی۔
''اکچوئیلی مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا اکیلے۔''
وہ شرمندہ تھی۔ سائرہ کے لیے یہ اس سے بڑی حیرانی تھی کہ حیان کسی کے کہنے پر رُک گیا ہو۔ کیونکہ وہ دنیا میں ایک ہی انسان کے لیے کچھ کر سکتا تھا اور وہ ذات بڑے بابا کی تھی باقی سب کو وہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ وہ شروع سے ایسا نہیں تھا شروع سے بس ضدی تھا اور بہت موڈی تھا مگر وقت اور حالات نے اسے بے مروت اور بے حس انسان بنا دیا تھا۔
''اوکے......اب چلتا ہوں سائرہ تمہیں اچھی کمپنی دے دے گی۔'' وہ کہہ کر چلا گیا تو سائرہ اپنی حیرانی چھپائے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
''تم بیٹھو میں کھانا گرم کرتی ہوں۔'' وہ اپنائیت سے بولی۔
''اوکے......'' وہ پہلی بار مسکرائی اُس کی ہنسی بھی بہت معصوم اور پیاری تھی۔ کھانا اوون میں رکھ کر وہ اس کی طرف مڑی۔
''حیان کہاں ملے تھے تمہیں؟'' نجانے کیوں اس نے ایسا سوال کیا تھا یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔
حالانکہ وہ جانتی تھی کہ حیان جھوٹ نہیں بولتا اور یہ عادت اُس کی بہت پختہ تھی ورنہ وہ سائرہ کا دل یوں نہیں توڑتا جیسے وہ توڑ چکا تھا۔
''ہاسپٹل میں ملے تھے مسٹر فاروقی۔'' وہ

پیرومرشد

جب سے یہ دنیا بنی ہے تب سے حضرت آدم کو اپنی ہدایت کے لیے ایک پیر کی ضرورت رہی ہے۔ اسی پیرومرشد کے رشتے سے ہدایت کے سرچشمے ہے۔ اور اب تک لوگ اُن باتوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ ازل سے ابد تک پھیلے اِس سلسلے کو بہت جلد ہم آپ کے روبرو لا رہے ہیں۔
اک ایسے پیرومرشد کی داستانِ حیرت، جو کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکے لیکن اُن کے درمیان رابطے کا پُل اک آدھی ملاقات ہوتی تھی۔
مرشد نے اپنے پیر سے زندگی کے ہر مسئلے کے حل کے لیے خط و کتابت روا رکھی۔ اُن خطوط سے جڑا سچا سلسلہ، جو یقیناً ہماری راہنمائی کرے گا۔
پیرومرشد کے سچے خطوط سے مزین یہ ایمان افروز سلسلہ بہت جلد...... آپ کی کہانیاں کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں گے۔

افسردہ لہجے میں بولی۔
''ہوں......'' سائرہ نے کہا۔
''اچھے ہیں مسٹر فاروقی انہوں نے وہاں پر سارے کام نبٹائے ہیں میرا بہت ساتھ دیا تھا۔''
وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔
جبکہ سائرہ خاموش رہی۔
''یہ لو تم کھانا کھاؤ اور میں تمہارے لیے چائے بنا دیتی ہوں۔'' وہ بولی۔
''باجی آپ کافی بنا دیں گی۔ وہ کیا ہے میں چائے نہیں پیتی۔'' وہ مسکرائی۔
''Sure Why Not......'' وہ مسکرائی
اس نے تین کپ کافی بنائی ایک اپنے لیے' ایک اروی کے لیے اور ایک کپ لے کر اوپر آئی۔
''تم چلو میں یہ کافی دے آؤں۔'' وہ مسکرائی۔
''جی......'' اروی روم کی طرف بڑھ گئی۔
اس نے دروازہ ناک کیا۔
''آ جاؤ......'' اندر سے آواز آئی۔ تو وہ اندر داخل ہوئی۔
''آپ کے لیے کافی......'' وہ بیڈ کے قریب پہنچ کر بولی۔
حیان اس طرح اس کے یوں آنے پر چونکا ضرور مگر ظاہر نہیں کیا۔
''تھینکس...... مگر تم نے ناحق زحمت کی۔'' وہ بولا اور دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جیسے اُس کی شخصیت بالکل غیر اہم ہو۔
سائرہ کو لگا جیسے اس نے آ کر غلطی کر دی ہو۔ وہ خاموشی سے کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر پلٹ گئی۔
حیان نے جاتے اُسے دیکھا تو افسوس سے سر ہلایا۔
''میں اس اچھی لڑکی کے ساتھ ہمیشہ زیادتی کر جاتا ہوں۔'' وہ زیرِلب بولا اور کپ تھام لیا۔
کمرے میں آ کر اس نے اروی سے بہت سی باتیں کیں مگر اس معاملے کے بارے میں بالکل بات نہیں کی تھی جو زِدعام تھا۔ اُسے لگا کہ یہ لڑکی بہت معصوم سی ہے بالکل بچوں کی سی معصومیت ہو جیسے اس میں...... سائرہ سے باتیں کر کے اروی بھی تھوڑی ریلیکس ہو گئی تھی۔ سائرہ نے اُسے تمام گھر والوں کے متعلق بتایا تھا۔
کہ کون کون اُس کا کیا لگتا ہے...... وہ بہت دلچسپی سے سائرہ کو سن رہی تھی۔

☆......☆......☆

صبح ناشتے کے لیے سائرہ نے اروی کو جگا دیا۔
''اٹھو اروی سب ڈائننگ ٹیبل پر ہیں تم بھی آ جاؤ۔'' صبح فجر کے بعد ہی تو اس کی آنکھ لگی تھی اور ابھی آٹھ بج رہے تھے۔ وہ بے حد تھکن محسوس کر رہی تھی تھوڑا سا جٹ لائٹ کا مسئلہ تھا اسے...... مگر وہ اٹھ گئی۔

(جاری ہے)

بُش اور بُشرا

تحریر کی روانی اور گیرائی لیے یقیناً یہ یادگار افسانہ آپ کے دل کے تار جھنجھوڑ کر رکھ دے گا

آج میں آپ کو ایک لو اسٹوری سناتا ہوں۔ اس کہانی میں تین کردار پیش پیش ہیں Love`s triangle ایک لڑکا' ایک لڑکی اور ایک ۲۵۰ طاقت کا موٹر سائیکل۔

آپ کہیں گے کہ لڑکا لڑکی تو خیر' موٹر سائیکل کو بیچ میں کیوں لے آئے؟ جناب والا' میں مجبور ہوں' موٹر سائیکل کو بیچ میں' میں نہیں لایا' وہ خود بخود آ گیا ہے۔ آج کل جدید گھرانوں میں موٹر سائیکل بہت ایکٹو ہے۔ جہاں محبت کی بات سنی' شڑاپ سے بیچ میں آ گھستا ہے۔ موٹر سائیکل عصری تقاضہ ہے جس طرح پرانے زمانے میں وفا ہوتی تھی' جہاں محبت کی بھنک پاتی' یوں دھرنا مار کر بیٹھ جاتی جس طرح قرض خواہ کے دروازے پر مہاجن آ بیٹھا ہو...... تو جناب' اس کہانی میں محبت کو چلانے کی ساری ذمے داری موٹر سائیکل پر ہے بلکہ یوں کہیے کہ اگر موٹر سائیکل نہ ہوتا تو لڑکا لڑکی جتنا زور چاہے لگا لیتے' محبت پیدا ہی نہ ہوتی۔

آج کل محبت میں رفتار کو بڑی اہمیت حاصل ہے' پرانے زمانے میں بہلی میں بیٹھ کر ڈھینچوں ڈھینچوں چلتی تھی۔ آج کل موٹر میں زناٹے سے نکل جاتی ہے' فٹاک سے منزل کو جا لیتی ہے' بس ایک ہی مشکل ہے کہ منزل پر پہنچ کر بھی نہیں رکتی۔

ہاں تو صاحبو' کہانی یوں ہے کہ ایک تھی لڑکی بش اور ایک تھا لڑکا ذولف' بش کو ذولف سے محبت تھی۔

معافی چاہتا ہوں' محبت ایک پرانا لفظ ہے' یہاں بیٹھتا نہیں لیکن کیا کیا جائے' کوئی اور لفظ میسر نہیں۔ مطلب ہے کہ بش کو ذولف سے والہانہ لگاؤ تھا' infatuation تھی بلکہ یوں کہیے کہ ان فچوایشن اپنی شدت کی وجہ سے compulsion بن چکی تھی۔ یہ مجبوری بش کے گلے میں خوامخواہ پڑ گئی تھی' ساری شرارت موٹر سائیکل کی تھی۔

ہوا یوں کہ ایک دن جب وہ گھر کی ٹیرس پر کھڑی تھی تو دفعتاً ایک شور اٹھا' بھونچال سا آ گیا'

الماریوں میں رکھے ہوئے برتن بجنے لگے' میزوں پر گل دان جھولے' ٹی وی کا ایریل تھرایا' اسلام آباد کی سڑک نما گلی گڑگڑاہٹ سے بھر گئی اور آخر کوئی چیز 'زوں' سے گلی سے یوں گزر گئی جیسے ہوائی چل گئی ہو۔

یہ ہوائی ذولف کا موٹر سائیکل تھا۔

بش دیکھتی' کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

دل اچھل کر باہر نکل آیا' جسم گویا سکتے میں رہ گیا۔

ہائے...... اتنی تیزی' اتنی تڑپ جیسے بجلی گری ہو پھر اسے پتا چلا کہ یہ بجلی ہر روز شام کے پانچ بجے گلی پر گرتی ہے اس لیے وہ روز پانچ بجے اس کا انتظار کھینچنے لگی۔

جب ذولف گلی میں سے زوں سے نکل جاتا تو بش کو دکھتا دکھاتا کچھ نہ تھا' صرف موٹر سائیکل کی ایک سرخ سی لکیر اور ہیلمٹ کا ایک سلیٹی دھبہ۔

تو جناب' بش کو اس سرخ لکیر اور سلیٹی دھبے سے محبت ہو گئی۔ جب بھی سرخ لکیر اور سلیٹی دھبہ زناٹے سے گزرتے' اس کا دل اچھل کر باہر آجاتا اور جسم میں سوئیاں چبھ جاتیں۔

دراصل بش کو رفتار سے عشق تھا۔ پتا نہیں کیوں شاید عصری تقاضہ ہو یا شاید ذہن میں کوئی غدود زائد لگ گیا ہو جیسے پائلٹوں میں یا موٹر ریسوں میں ہوتا ہے' شاید اسی وجہ سے بش میں ایک بے نام اضطراب بھی تھا جو اس کے بند بند کو جھلاتا رہتا تھا۔

اول تو وہ ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ ابھی یہاں بیٹھی تھی' اب وہاں کھڑی گنگنا رہی ہے' لو وہ تو ٹیرس پر ٹہلنے لگی' یہاں سے وہاں جا بیٹھنے کے لیے اسے اڑنے کی چنداں ضرورت نہ پڑتی تھی۔

بیٹھتی تو جسم کا ''رواں رواں'' دھنکی کی طرح بجتا اور کچھ نہیں تو پاؤں چلتا چلے جاتا' اتنی تیزی سے جیسے انڈہ پھینٹتے ہوئے چمچہ چلتا ہے' مختصر یہ کہ بش بڑی ہی بے تاب روح تھی۔ جو کام ذہن میں آتا' چاہتی کہ ابھی ہو جائے۔ ابھی اسی وقت جھٹ پٹ' خیال ذہن میں اس قدر تیزی سے آتے کہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے جیسے تصویر ملٹی ایکسپوژرز کی وجہ سے blur ہو جائے مثلاً نام ہی کو لیجیے' اس کا نام بُشرا تھا جو اسے پسند نہ تھا۔ توبہ' اتنا لمبا نام بش......را......اونہوں' نام ایسا ہو جو چھوٹا ہو' ترت ہو' خستہ ہو کر کرا کے دار ہو' اسی وجہ سے اس نے نام کو کاٹ کر 'بش' رکھ لیا تھا۔ 'بش' کے صوتی اثر میں تیزی تھی اور پھر جھٹکا بھی اور معنوی طور پر بھی وہ...... لیکن چھوڑیئے' بش کو معنوی پہلو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے ذوالفقار کو بھی ذولف کہنا شروع کر دیا تھا' اتنا لمبا نام ذوالفقار توبہ ڈریگ کرتا ہے۔

اگرچہ بش روز ذولف کا انتظار کرتی تھی تاکہ گزرتے ہوئے اسے دیکھے لیکن اس نے ذولف کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیسے دیکھتی' قیام کے عالم میں ہوتا تو دیکھتی اور اگر ذولف قیام کے عالم میں ہوتا تو وہ ایک عام سا لڑکا بن کر رہ جاتا۔ سارا رومینس تو اسپیڈ نے پیدا کر رکھا تھا۔

بش کو تو یہ بھی علم نہ تھا کہ ذولف کے خدوخال کیسے ہیں؟ لیکن ہٹایئے' محبت میں آج کل خدوخال کون دیکھتا ہے؟

بش کو ذولف سے اس لیے محبت نہ تھی کہ وہ ذولف تھا بلکہ اس لیے کہ وہ جدیدیت کا سمبل تھا اور جدیدیت سے اسے عشق تھا' عشق۔ اس کی نظر میں ہر چیز' ہر بات جو دورِ جدید کی نشاندہی کرتی تھی۔ اس قابل تھی کہ خود کو اس پہ نثار کر دیا جائے

اور ذولف میں جدیدیت کی ایک نہیں' تین باتیں تھیں۔ ایک تو وہ رفتار کا دیوانہ تھا' حرکت اس کے لیے زندگی تھی اور قیامت موت پھر وہ اضطراب کا بادشاہ تھا' اضطراب بھی تو حرکت ہی ہوتی ہے' گرداب زدہ حرکت' بس ذرا رنگ مختلف ہوتا ہے' تیسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ نتائج سے بے پروا تھا' بے نیاز تھا' یوں کیا تو یہ ہو جائے گا' کہیں وہ نہ ہو جائے' پڑا ہو' جو ہو' سو ہو' ٹو ہیل ود اٹ (to hell with it.)

ذولف ایک کھاتے پیتے 'بنے سجے گھر کا فرزند تھا۔ باپ ایک اعلیٰ افسر تھا۔ ماں سوشل سرکلز کی جان تھی۔ گھر کی فضا Live let live کے جذبے سے اس حد تک بھری ہوئی تھی کہ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ وہ گھر نہیں بلکہ بے تعلقی کی جنت تھا پھر بھی کبھی کبھار ماں باپ کی بچوں سے ملاقات ہو ہی جاتی اور انہیں احساس ہوتا کہ وہ ان کے اپنے بچے ہیں۔ سوشل ماں کے لیے یہ احساس بہت تکلیف دہ ہے' خصوصاً جب بچے جوان ہو جائیں تو وہ ماں کی عمر کی گواہی دینے لگتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ سوشل ماں کے لیے عمر کا مسئلہ بڑا نازک ہوتا ہے' بہرصورت ذولف کی ماں اس بات پر بہت خوش تھی کہ بیٹے نے موٹر سائیکل رائیڈنگ کی ہابی کو اپنا رکھا ہے اور شام میں گھر میں نہیں بلکہ سڑک پر گزارتا ہے' باپ بھی خوش تھا کہ بیٹے میں ڈیش ہے اور جب وہ کیریئر کے سائیکل پر چڑھے گا تو کچھ کر دکھائے گا۔

دراصل ماں باپ دونوں ہی آزاد خیال تھے اور اپنے لبریٹڈ ہونے پر فخر محسوس کیا کرتے تھے۔ ان کے دلوں میں صرف دو بندھن باقی رہ گئے تھے' اسٹیٹس اور کیریئر' شاید یہ بندھن لبریٹڈ ہونے کے لیے ازبس ضروری ہوتے ہیں۔

ذولف کو بچپن ہی سے رفتار سے عشق تھا اور یہ عشق اتنا شدید تھا کہ مزید کسی عشق کی گنجائش نہ رہی تھی۔ وہ صبح انسٹیٹیوٹ میں حاضری دیتا جہاں وہ مینجمنٹ کورس کے آخری دور میں تھا پھر شام کو پانچ بجے موٹرسائیکل رائیڈنگ پر نکل جاتا' ایکسیلیٹر دباتا...... اور دباتا حتیٰ کہ موٹرسائیکل ہوا میں تیرنے لگتا' بس یہی اس کی جنت تھی۔

سات آٹھ روز تو بش ٹیرس پر کھڑی ہوکر ذولف کی زوں سنتی رہی' دیکھتی رہی' سن سن کر نہال ہوتی رہی پھر وہ مضطرب ہوگئی' یوں جیسے شیر پنجرے میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہل لگاتا ہے' مقصد نہ اِدھر آنا ہوتا ہے نہ اُدھر جانا' ذولف کی زوں بش کے دل میں ایک زوں چلا دیتی' وہ زوں اس کے بند بند میں گونجتی۔

بش کے دل میں وصال کے لیے تڑپ پیدا نہ ہوتی تھی جس طرح پرانے زمانے کے عشق میں پیدا ہوا کرتی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ بش کے ذہن میں وصال کا تخیل سرے سے وجود ہی نہ رکھتا تھا' اسے پتا ہی نہ تھا کہ وہ کیا ہوتا ہے' کوئی کیفیت یا منزل؟ اس کے دل میں یہ آرزو بھی نہیں تھی کہ ذولف آنکھوں کے سامنے رہے اور میں اسے دیکھتی رہوں' نگاہوں کے سامنے رہنے یا اسے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا چونکہ سامنے رہنا تو قیام کی صورت ہے اور قیام تو اس کے نزدیک بوریت تھا' رہا دیکھنے کا سوال تو اگر آپ کے سر پر ہیلمٹ سوار ہو' منہ پر پلاسٹک کا چھجہ چڑھا ہو' جسم پر چمڑے کا جیکٹ ہو' ہاتھوں پر دستانے ہوں تو دیکھنا کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟

ذولف کی زوں دیکھ کر بش کے دل میں صرف ایک آرزو پیدا ہوتی تھی کہ اس لال لکیر اور سلیٹی دھبے کے ساتھ اس کے بال ویر ہوا میں لہرائیں' وہ بھی اس متحرک تصویر کا ایک حصہ بن جائے۔ اگر وہ پرانے دور کی یا پابند گھرانے کی لڑکی ہوتی تو بیٹھ کر آہیں بھرتی یا دل بہلانے کے لیے فلمی گانے سنتی لیکن بش تو جدید گھرانے کی پیداوار تھی' گھر والے لڑکی پر نظر رکھنے کے قابل نہ تھے' اڑوس پڑوس والے ذاتی معاملے کو کچھ زیادہ ہی ذاتی سمجھتے تھے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

ان حالات میں بات چھپانے کی کیا ضرورت تھی اس لیے بش نے شام کے پانچ بجے کی اس لذت میں چھوٹی بہن کو بھی شریک کرلیا۔ چھوٹی بہن سے بات ممی تک پہنچی' ممی نے بھلا کیا کہنا تھا' مسکرا کر چپ ہو رہیں لہٰذا ایک شام بش ٹیرس کی بجائے گلی میں جا کھڑی ہوئی۔ ذولف آیا تو اس نے انگڑائی کی صورت دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ رکنے کا اشارہ کیا۔ ذولف نے موٹرسائیکل روک لیا۔ ''اے' لفٹ پلیز......'' وہ بولی۔

''اوکے' جمپ آن......''

وہ اچھل کر بیک سیٹ پر جا بیٹھی۔ موٹرسائیکل چل پڑا۔ اگر وہ روایتی ماحول میں پلے ہوئے کسی نوجوان کے موٹرسائیکل کی بیک سیٹ پر بیٹھ جاتی تو مشکل پڑ جاتی۔ نوجوان کے لیے سورج سوا نیزے پر آ ٹکتا پھر پسینہ ہی پسینہ' کنفیوژن ہی کنفیوژن' ذہن میں بریک اور ایکسیلیٹر گڈمڈ ہوجاتے لیکن ذولف کو کچھ بھی نہ ہوا جیسے پیچھے بھس کی بوری دھری ہو البتہ اس نے اسپیڈ سلو کردی کہ بوری گر نہ جائے۔

''سلو کیوں ہوگئے......؟'' وہ چلائی۔

''سڑک بمپی ہے۔'' وہ بولا۔

''پڑی ہو......''

''گر جائے گی.....''

''سوواٹ.....''

ذولف کو بات سمجھ میں آ گئی کہ اسے کہیں جانا یا پہنچنا نہیں' Joy ride ہے۔ ذولف نے ایکسیلیٹر کھولا اور موٹر سائیکل ہوا میں تیرنے لگا پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ ذولف آ کر رک جاتا' ٹوٹ بجاتا' بش دوڑ کر آتی' اچھل کر بیک سیٹ پر چڑھ جاتی' ذولف ایکسیلیٹر کھولتا' کھولے جاتا اور موٹر سائیکل ہوا میں اڑنے لگتا۔

ٹریفک پولیس ذولف سے واقف تھی۔ جب ذولف گزرتا تو چوک کا سپاہی منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا' ہم نہیں دیکھ رہے' کی صورت۔

ابتدائی ایام میں جب وہ ذولف سے آشنا نہ تھے تو سپاہی لپک کر آگے بڑھا تھا' سیٹی بجا کر اسے روکا تھا پھر تحکمانہ شان سے جیب سے کاپی پنسل نکالے تھے اور حسب دستور فرعونی لہجے میں پوچھا تھا۔ ''کیا نام ہے تیرا؟ باپ کا نام؟ کیا کرتے ہیں وہ؟''

جواب سن کر سپاہی کا کلف اتر گیا تھا' گردن جھک گئی تھی اور کاپی پنسل دوبارہ جیب میں جا چھپی تھی۔ اس روز کے بعد وہ ذولف کو پہچاننے لگے تھے یوں کہ جب بھی وہ گزرتا' سپاہی منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا' ہم نہیں دیکھ رہے' کی صورت۔

چار ایک دن تو بش بیک سیٹ پر اسٹریپ سے چمٹی رہی پھر جو ایک زوردار جمپ لگا تو اس نے چیخ مار کر اپنی بانہیں ذولف کے گرد حمائل کر دیں۔ ذولف کو پھر بھی کچھ نہ ہوا البتہ بش کو ہوا' کچھ کچھ اور اس کی بانہیں ذولف کا سہارا لینے کی عادی ہو گئیں پھر وہ بانہیں گھسیٹ کر اسے اپنے گھر میں لے گئی۔ ممی ڈیڈی سے تعارف ہوا' یوں دونوں کنبے ایک دوسرے سے ملنے لگے۔

جدید گھرانوں میں یہ عیب ہے کہ وہاں لو اسٹوری جنم لینے میں تو بڑی بے تاب ہوتی ہے مگر پھلتی پھولتی نہیں یا شاید محبت میں یہ عیب ہے کہ پابندیاں نہ ہوں تو وہ چلتی نہیں' گویا تو ختم ہو جاتا ہے' صرف اسٹوری باقی رہ جاتی ہے یا وہ افیئر میں بدل کر اپنی عظمت کھو دیتی ہے۔ محبت میں انسان کے لیے محرومی لازم ہے' محرومی شامل ہو جائے تو محبت عشق بن جاتی ہے' عشق انسان کو مادی دنیا کی گرفت سے نکال کر نہ جانے کہاں لے اڑتا ہے۔

بش اور ذولف کی دنیا میں پابندیاں نہیں تھیں' رکاوٹوں کا وجود نہ تھا' دونوں گھرانوں کے ہاں اسٹیٹس بھی تھا اور کیریئر کے مواقع بھی لہٰذا بش نے ممی کے ذریعے بات چلائی۔ ذولف کے گھر والوں نے پیغام بھجوا دیا جو منظور کر لیا گیا اور وہ ایک دوسرے سے منسوب ہو گئے۔

منگنی سے ان کی زندگی میں کوئی فرق نہ پڑا نہ خوشی کا احساس تھا نہ پا لینے کا۔ پا لینے کی خوشی تو تب ہی ہوتی ہے جب پا لینے میں دشواریاں حائل ہوں' یہ عشق بھی عجیب عشق تھا۔ ذولف حرکت کا دیوانہ تھا اور بش متحرک کی مداح تھی' وہ تماشہ تھا' یہ تماشائی تھی' تماشے کو تماشائی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔

اگر ان تینوں کرداروں تک محدود رہتی تو یہ کہانی شادی پر شہنائی کے ساتھ ختم ہو جاتی اور اس کے بعد دونوں روٹین زندگی بسر کرنے لگتے اور کہانی سننے والے ناک چڑھا کر کہتے۔ 'یہ کہانی تو بالکل سطحی ہے کھوکھلی' بے لذت' بے جان' اس میں تو زندگی کا زیر و بم ہی نہیں' صرف زیر ہی زیر' بم کا نشان نہیں ملتا۔'

وہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ چوتھے کردار نے غیر متوقع طور پر آ سر نکالا اور واقعے کو کہانی بنا دیا۔

ہوا یوں کہ ایک شام جب وہ گول چوک کے

قریب پہنچے تو وہ رک گیا۔ بش اتر گئی۔ ذولف نے موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کر دیا اور پھر گول چوک سے ملحقہ پارک کی طرف چل پڑا۔ بش حیران تھی کہ بات کیا ہے؟ دفعتاً ذولف بولا۔

''بش وی آر ڈوئنگ اٹ''

''ڈوئنگ......واٹ؟'' وہ چلائی۔

''کراچی' گلگت نان اسٹاپ ریس......'' اس نے جواب دیا۔

جب بش کو بات سمجھ میں آئی تو خوشی سے اس کے تن بدن پر چیونٹے دوڑنے لگے۔

''کیا میں بھی ساتھ ہوں گی؟'' بش نے پوچھا۔

''سیکنڈ مین کے بغیر یہ ریس ہو ہی نہیں سکتی۔''

بش کی باچھیں کھل گئیں۔

''تمہیں پریکٹس کرنی پڑے گی۔''

''پریکٹس' کیسی پریکٹس؟''

''سیکنڈ مین بننے کی پریکٹس' موٹر سائیکل کی پوری میکینکی سیکھنی پڑے گی' پہیہ بدلنا' پنکچر لگانا' چلتے چلتے تیل بھرنا' الیکٹرک وائرنگ کو سمجھنا' پلگ صاف کرنا' بدلنا' سیکنڈ مین کا کام بہت رف ہوتا ہے۔''

بش تن کر کھڑی ہوگئی' بولی۔ ''آئی ول شور......'' اس نے پوچھا۔

''شور ایز دی سن شائنز۔''

''اٹ از اے چیلنج۔''

''آئی ٹیک اٹ۔'' وہ دانت بھینچ کر بولی۔

''یہ سلک اسٹف نہیں چلے گا۔'' ذولف نے اس کے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''اے ورک مین کٹ' اسپکس ہیلمٹ گلوز سب ہی کچھ۔''

''او کے۔''

''ٹھیک۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کل سے ٹریننگ شروع۔''

ابھی وہ موٹر سائیکل کے قریب پہنچے تھے کہ گول چوک سے ایک شور سنائی دیا۔ ایک ٹرک راہگیر کو چل کر بھاگا آرہا تھا۔ چوک کا سپاہی روکنے کے لیے سیٹیاں مار رہا تھا۔ آس پاس لوگ چلا رہے تھے۔

''روکو......روکو......پکڑو......''

یہ منظر دیکھ کر ذولف پر وحشت سوار ہوگئی۔ ایک ہی جست میں وہ موٹر سائیکل پر سوار ہوگیا اور ٹرک کے پیچھے ہوا ہوگیا۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان ریس ہوتی رہی لیکن ذولف بجلی کی طرح آگے نکل گیا اور ٹرک کا رستہ روک کر کھڑا ہوگیا پھر ایک دھماکہ ہوا اور ٹرک درخت سے ٹکرا کر لڑھکتا ہوا نیچان میں جا گرا۔ بش نے آنکھیں بند کر لیں' اس کا دل ڈوب گیا۔

ذولف کو اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ دو دن امید و بیم کا آرا چلتا رہا۔ آخر امید غالب آئی۔ ذولف بچ گیا لیکن اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئیں۔

اس پر چند ایک روز تو بش یوں ادھ موئی پڑی رہی جیسے اس کی دنیا ہی لٹ گئی پھر آہستہ آہستہ اس کے اندر کا سوواٹ بیدار ہوا۔ سہیلیوں نے اسے سمجھایا۔ ایک بولی۔

''زوں سے لگن لگاؤ گی تو زناٹا تو ہوگا''

دوسری بولی۔ ''مری کیوں جاتی ہے زوں تو ختم نہیں ہوا۔ سڑک پر بڑا بڑا زوں پڑا ہے ابھی۔''

تیسری نے کہا۔ ''منگیتر کا غم کھائی ہے کیا؟ منگنی کو بھول جا' تیرے گھر والے اب کوئی اور منگیتر ڈھونڈ لیں گے۔''

چوتھی بولی۔ ''لفٹ کا کیا ہے' جس سے مرضی ہے' مانگ لے' جس سے مانگے گی' وہ پھولے نہیں سمائے گا۔''

ان باتوں کے باوجود وہ روز ہسپتال جاتی رہی۔ دو مہینے گزر گئے' اس کی اس باقاعدگی کو دیکھ کر می

ڈیڈی گھبرا گئے۔ ایک روز جب وہ ہسپتال جانے کے لیے تیار ہورہی تھی تو ممی نے اسے آواز دی۔

''بش...... ذرا ادھر آنا۔''

جب وہ ممی کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ ڈیڈی بھی وہیں بیٹھے پائپ پی رہے ہیں۔

''بش......'' ممی نے کہا۔ ''تو کیوں خود کو ہلکان کررہی ہے؟''

''میں نہیں سمجھی ممی......'' وہ بولی۔

''بھئی' ہسپتال کی فضا بڑی ڈیپریسنگ ہوتی ہے' ذہن پر برا اثر کرتی ہے۔'' ڈیڈی نے کہا۔

''اگر جانا ضروری ہے تو ہفتے میں ایک دفعہ ہو آیا کر۔'' ممی بولیں۔

''بش......'' ڈیڈی نے کہا۔ ''اب اس انگیجمنٹ کو ختم کردینا چاہیے' تو ایک سمجھدار لڑکی ہے' ایک معذور کے ساتھ زندگی بسر نہیں ہوسکتی۔''

''وہ تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ممی بولیں۔

''ہاں' فارگٹ اٹ۔'' ڈیڈی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تو کیا کہتی ہے بش؟''

''ٹھیک ہے۔'' وہ بولی۔ ''ساری عمر میں وہیل چیئر سے تو بندھی نہیں رہ سکتی۔'' بش کا حلق بند ہوگیا' آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''سمجھدار لڑکی ہے۔'' ڈیڈی نے بش کو تھپکتے ہوئے کہا۔

''ڈیڈی...... آج تو مجھے جانا ہی ہوگا البتہ کل......'' بش رک گئی۔

''ضرور' ضرور۔'' ڈیڈی نے جواب دیا۔

''بلکہ اچھا ہے......'' ممی بولیں۔ ''آج خدا حافظ کر آؤ۔''

اس شام جب وہ ذولف کے پاس پہنچی تو وہ بڑی حسرت سے پورٹیکو میں کھڑے موٹر سائیکل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برآمدے کے سامنے پلاٹ میں وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔

''ہیلو......'' وہ بولی۔

ذولف چونکا' اس نے نگاہ اٹھائی۔ ''اوہ بش......''

''آج اکیلے بیٹھے ہو؟''

''ہوں......''

''گھر والے نہیں آئے؟''

''کوئی انگیجمنٹ ہوگی۔ صرف تم ہی روزانہ آتی ہو۔''

''اچھا......'' اس نے حیرت سے کہا۔

''کل سے شاید تم بھی نہ آؤ۔'' وہ بولا۔

''کیوں؟''

''کل میں گھر جارہا ہوں۔''

''کیا واقعی؟''

''ہاں' بیساکھیاں آ گئی ہیں۔''

''کہاں ہیں؟''

''اندر پڑی ہیں۔''

''ہوں......'' وہ چپ ہوگئی۔ دیر تک وہ دونوں چپ بیٹھے رہے۔

''ذولف......'' بش بولی۔ ''آرٹیفیشیل لمبز نہیں لگتے ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''صرف دیکھنے دکھانے کے لیے لگتے ہیں' ویسے نہیں۔''

''اوہ......'' وہ آہ بھر کر خاموش ہوگئی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولی۔ ''ٹانگیں تو ٹھیک ہوگئیں نا؟''

''ہاں' ٹانگیں تو ٹھیک ہیں لیکن......''

''لیکن کیا......؟'' اس نے پوچھا۔

''دی لیگز آر آل رائٹ۔'' وہ بولا۔ ''بٹ

ایوری تھنگ اباؤٹ دیم شل نیور بی آل رائٹ۔''

وہ پھر خاموش ہوگئی' دل پر بوجھ پڑ گیا پھر اس نے خود کو جھنجوڑا۔

''مجھے اب جانا چاہیے۔''

''ہاں......'' وہ بولا۔ ''تمہیں جانا ہی پڑے گا' کب تک اپاہج کے ساتھ بندھی رہوگی؟''

بش کو ایک چکر سا آیا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''خدا حافظ!'' وہ بولی۔

راستے میں وہ سوچتی رہی۔ 'سچ کہتا تھا' اپاہج سے کون بندھا رہے؟ ڈیڈی بھی ٹھیک کہتے ہیں' اس دلدل سے بچ نکلنا لازم ہے۔ میری سہیلیاں' نوم' بیدہ' پوپوسب میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ چلو اچھا ہوا' آج خدا حافظ کہہ دیا۔'

جب وہ گھر پہنچی تو بہت خوش تھی۔ گھر والوں نے اسے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

اس رات بش بڑے اطمینان کی نیند سوئی لیکن پتا نہیں آدھی رات کو کیا ہوا' گویا کسی نے اسے جگا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھی' کمرہ کسی کی موجودگی سے بھرا ہوا تھا اور وہ موجودگی گویا بہت ہی مانوس موجودگی تھی۔

اس کے ذہن میں ایک احساس ابھرا یوں جیسے ہفتوں بھولی ہوئی بات یکلخت ذہن میں ابھر آتی ہے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ذولف کے پیچھے ہوا میں تیر رہی ہو' موٹر سائیکل گھاؤں گھاؤں کر رہا تھا پھر وہ گھاؤں گھاؤں مدھم پڑتی گئی حتیٰ کہ خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں ہوا میں تیرتے ہوئے جا رہے تھے۔ موٹر سائیکل کا نشان باقی نہ رہا تھا۔ جو پہلے موٹر سائیکل سے وابستہ تھی' اب ذولف کی ذات سے وابستہ ہوگئی' ذولف کی ذات ابھری' ابھرتی چلی گئی۔ سارا کمرہ ذولف کے پسینے کی خوشبو سے بھر گیا۔

بش گھبرا گئی' اس موجودگی کے احساس سے گھبرا گئی' وہ موجودگی اس کے اندر سے یوں نکل رہی تھی جیسے اس میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہو رہی ہو' جیسے سنڈی' تتلی بنتی جا رہی ہو' جیسے لڑکی' عورت میں بدل رہی ہو...... بش پھیل رہی تھی' بھاری درخت بنتی جا رہی تھی' اس کے دل میں وسعتیں ابھر رہی تھیں' اتھاہ گہرائیاں انگڑائیاں لے رہی تھیں' جسم حسیات سے لت پت ہوا جا رہا تھا' حسیات میں رشتوں کے بندھن ابھر رہے تھے' اس کی بانہیں ذولف کے گرد یوں پیوست ہوگئی تھیں جیسے بیل بوٹے کے ارد گرد بل کھا کر لپٹ جاتی ہے۔ ذولف کا ہیلمٹ سر سے گر گیا تھا' جیکٹ تار تار ہوگیا تھا' آنکھوں پر چڑھے ہوئے پلاسٹک کے چھجے ریزہ ریزہ ہوگئے تھے' اس کی ذات ننگی ہوگئی تھی اور ذات کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک اٹھا تھا۔

اگلے روز وہ بے دھڑک ڈیڈی کے کمرے میں داخل ہوئی' بولی۔ ''ڈیڈی...... میں نے فیصلہ کرلیا ہے' میں ذولف سے اپنی انگیجمنٹ نہیں توڑوں گی۔'' باپ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں ذولف سے شادی کروں گی۔'' وہ بولی۔

''لیکن بیٹی......'' باپ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ہی نیڈز می ڈیڈ......'' وہ بولی۔

''بٹ ڈو یو نیڈ ہم؟'' باپ نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''آئی ڈو' آئی ایم ہز تھ اینڈ تھر واٹ از اے لینڈ آف نو ریٹرن۔''

ڈیڈی نے چونک کر بش کی طرف دیکھا' اس کے سامنے بش نہیں' بشرا کھڑی تھی۔

☆☆......☆☆

ابھی امکان باقی ہے

اُن کرداروں کی کہانی، جو ہر معاشرے میں بکھرے پڑے ہیں مگر
جب یہ کردار امر ہو جائیں تو مزید کا بھی امکان باقی رہتا ہے **قسط نمبر 11**

''ذرا اپنے دل سے پوچھیں یہ آسان ہے کیا؟''

''یہ مشکل بھی کٹ ہی جائے گی۔ کچھ عرصے کی بات ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو زبدہ...... ہم حوصلہ ہاریں گے تو بچوں کو ہمت کون دے گا۔''

''نظر سے اوجھل تھا تو ہمت بندھی ہوئی تھی۔ ایک امید تھی کہ میرا بچہ مکمل صحت کے ساتھ واپس آئے گا۔ اُسے وہیل چیئر پر دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا مجھ سے۔'' وہ ایک بار پھر سسکنے لگیں۔ اُن کا احساس چھلکنے لگا تھا۔

''اپنی امید قائم رکھو زبدہ انشاء اللہ ہمارا بیٹا صحت یاب ہو جائے گا۔ اُس کی ٹریٹمنٹ مکمل ہوگی تو وہ پہلے کی طرح نارمل زندگی جیے گا۔ اب تم ہی اُس کی ڈھارس ہو...... خود کو سنبھالو۔'' شریح خان نے اپنے ساتھ جیسے بیوی کو بھی حوصلہ دیا۔

☆......☆......☆

سیڑھیاں اترتے ہوئے ثمن بے ساختہ ابھرتی سسکی کو منہ پر ہاتھ رکھ کر روکنے کی کوشش کی۔ ضیغم کے لیے بھی یہ لمحہ اذیت ناک تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی کو وہیل چیئر سے بستر پر منتقل کرتے ہوئے وہ کس تکلیف سے گزرا تھا یہ وہی جانتا تھا۔ حادثہ تو ہو کر گزر گیا تھا۔ مگر اُس کے اثرات زندگی کی ساری توانائی کو صفر پر لے آئے تھے۔ اُن کا جوان زندگی سے بھرپور بھائی کسی نومولود بچے کی طرح زندگی کے پہلے قدم پر محسوس ہو رہا تھا۔ جہاں سے اُسے دوبارہ نئے سرے سے ابتدا کرنی تھی۔

''ضیغم...... اصم...... چلنے لگے گا نا؟'' ثمن اُس کی محبت سے بے بس ہو کر بولی۔ ضیغم کو اُس کی بات بچکانہ سی لگی۔

''انشاء اللہ...... کیوں نہیں...... ڈاکٹرز نے کہا ہے بس چند ہفتوں کی بات ہے۔''

''آمین...... آج اُسے ایسا بے بس دیکھا ہے تو دل بھر آیا...... ہم سوچ سکتے تھے؟ کبھی وہ اس طرح بیڈ پر نظر آئے گا۔'' ثمن نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اظہار کیا۔

''پلیز ثمن...... اپنا اظہار اب اپنے تک ہی رکھنا۔ یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ وہ ہمیں کس طرح آزماتا ہے۔ یہ ہم نہیں جان سکتے۔'' ضیغم نے باقی سیڑھیاں عبور کیں اور ثمن سے بھی پہلے سیڑھیاں اُتر کر چلا گیا۔ شارم تو پہلے ہی جا چکا تھا۔

☆......☆......☆

اروی اصم کی کمر کے پیچھے تکیے لگا کر اُسے بمشکل بیٹھنے والی پوزیشن میں لے کر آئی تھی۔ اروی نے محسوس کیا تھا کہ اصم کمرے میں آکر کچھ چپ چپ سا ہو گیا ہے۔ وہ نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ کیا محسوس کر رہا تھا اُسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ کیونکہ اُس کی آنکھیں بھی بے تاثر تھیں اور چہرے پر بھی سرد سا احساس تھا۔

''کیا بات ہے اصم...... آپ جب سے اپنے روم میں آئے ہیں بالکل چپ ہیں۔ کیا سوچ رہے ہیں؟''

اروی نے ثمن کا بھیجا ہوا سیب کے تازہ جوس کا گلاس قریب بیٹھ کر اُس کے لبوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ تو وہ اُسے دیکھ کر رہ گیا۔ اُس کے ملیح چہرے کی ملاحت قدرے ماند تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے بھی نمایاں تھے۔

''کچھ بھی نہیں...... میں کیا سوچوں گا۔'' اصم نے گہری سانس کھینچ کر جواب دیا۔

''کچھ تو سوچ رہے ہیں؟ روم میں کچھ تبدیلی کی ہے یقیناً آپ کو وہ اچھی نہیں لگ رہی ہوگی۔''

''اچھی...... مجھے تو کچھ چینج نہیں لگا۔ اگر ہے بھی تو کوئی بات نہیں...... ضرورت کے تحت آنے والی چینجنگ محسوس نہیں ہوتیں۔'' اصم کا لہجہ معمول کا سا تھا۔

''میں تو گھبرا رہی تھی کہ کہیں یہ اضافی چیزیں آپ کو اچھی نہ لگیں۔'' اروی نے سہولت سے سانس لیتے ہوئے کہا۔

اس دوران اصم اپنے ایک ہاتھ میں اُس سے جوس کا گلاس لے کر اسٹرا کے ذریعے گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔

''تم تو ہر وقت ہی گھبرائی ہوئی رہتی ہو۔ پرابلم کیا ہے۔''

''مجھے......'' وہ خالی گلاس لے کر اُٹھتی ہوئی حیرانگی سے استفسار کر رہی تھی۔

''ظاہر ہے تمہی سے پوچھ رہا ہوں' اور کون ہے یہاں۔'' اصم نے اُس کا بڑھایا ہوا ٹشو تاول لے کر اپنے منہ کو صاف کیا۔

''مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے۔ آپ کو ایسے ہی محسوس ہو رہا ہے۔'' اروی اُس کے اطمینان کے لیے مسکرا کر بولی۔

''میں ایسے ہی فیل نہیں کرتا اروی...... تم بھی کچھ اپ سیٹ ہو اور گھر والے بھی...... بس مجھے وجہ سمجھ نہیں آرہی۔ کیا بات ہے...... سب کیوں پریشان ہیں؟ تم مجھے بتا سکتی ہو؟''

وہ اُس سے پوچھ رہا تھا۔ مگر وہ کیا کہتی۔ اپنی محسوسات اُسے بتا کر وہ اصم کو پریشان نہیں کرنا چاہتی

تھی۔

اور گھر والوں کو درپیش انعم کی فکر سے آگاہی دے کر بھی وہ باقی سب کے ساتھ اصم کو کوئی بدگمانی نہیں دینا چاہتی تھی۔ نجانے اُس کی بات سن کر اصم کا ردِعمل کیا ہوتا۔

''میں..... آپ کو کیا بتاؤں..... جبکہ میں بھی بے خبر ہوں کہ گھر والے کیوں پریشان ہیں۔'' اروی نے اپنے طور پر بات ختم کی۔

''کہیں تمہا.....ری وجہ سے تو کوئی ایشو نہیں ہے۔'' اصم نے اگلوانے کی کوشش کی۔ اروی گلاس میز پر رکھ کر بے ساختہ حیرت لیے پلٹ کر سامنے آئی۔

''میرا کیا ایشو ہوسکتا ہے۔'' اُس کے ذہن میں بجلی سی کوندی..... انعم کی بات اُسے یاد آئی۔ وہی ایک دن کہہ رہی تھی کہ وہ اصم سے اِس کی شکایت لگائے گی۔

''کیا کسی نے..... میر.....ی شکایت کی ہے؟'' وہ کچھ توقف سے ڈرتے ڈرتے بولی۔

''کیا تم نے کسی کو شکایت کا موقع دیا ہے؟'' اصم نے اُلٹا اُسی سے سوال کیا۔ اروی کا دم اُلجھنے لگا۔ رنگت اڑنے لگی۔

''اصم..... بخدا..... میں نے جان بوجھ کر کبھی ایسا کچھ نہیں کیا..... جس سے کسی کو کچھ تکلیف ہو۔ میں تو سبھی کی بہت عزت کرتی ہوں..... سبھی میرے لیے محترم ہیں اور.....'' اُس کی آنکھوں میں ٹھہری نمی اندرونی خوف کے باعث چھلکنے بکھرنے کو تیار تھی۔

''اچھا بابا..... اچھا..... میں کب کہہ رہا ہوں کہ کسی کو ریسپیکٹ نہیں دیتی ہو..... میں ایک بات پوچھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہے تم کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دوگی۔'' اصم نے اُس کی چھلک پڑنے والی آنکھوں میں بسا خوف دیکھ کر اپنا اعتماد بخشا.....

''جی..... میں نہیں دوں گی موقع۔'' اُس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔ اصم کے موبائل فون پر رنگ ٹون بجنے لگی تھی۔ اُس کے کسی دوست کی کال آرہی تھی۔ وہ میز پر پڑا اُس کا فون اُسے تھما کر خود ذرا دیر کے لیے ٹیرس پر چلی آئی۔ اپنے حواس بحال کرنے کے لیے یہ ضروری تھا۔

☆.....☆.....☆

فائق آفس سے نکل کر سیدھا زیب خالہ کی طرف چلا آیا۔ جہاں شہرینہ اُس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ فائق نے خود اُسے چائے کی دعوت دی ہے۔ خوابیدہ جذبوں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تھیں۔

وہ واقعی مجسم حقیقت بن کر اُسے ہمراہ لینے آیا تھا۔

''فا.....ئق یہ ٹریٹ کس خوشی میں دی جارہی ہے۔'' وہ اندرونی خوشی چھپاتے ہوئے کچھ بے نیازی سے پوچھ رہی تھی۔

''ہماری دوستی کا Renewal (تجدید) سمجھ لو۔'' فائق کی مسکراہٹ میں آج بھی وہی سحر محسوس ہوتا جو اُسے خود فریبی میں مبتلا کر دیا کرتا تھا۔

''کیا ایسا ہوسکتا ہے؟'' گاڑی سڑک پر رواں دواں تھی۔ شہرینہ نے پلکیں جھپکتے ہوئے اُس کے ساتھ

کا ایک بار پھر یقین کرنا چاہا۔

''دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے شہری۔'' فائق نے ڈرائیونگ کرتے کرتے اُسے دیکھا اور پھر اپنی نگاہ اسکرین پر مرکوز کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

''اور ہم میں کوئی ایسی جانی دشمنی تو نہیں ہوگئی تھی کہ ہمارا Relation Renweal نہ ہو سکے۔''

فائق کا دلفریب لہجہ اُس پر اثر کر رہا تھا۔ وہ کیا کچھ سوچ کر آئی تھی کہ فائق پر گزشتہ عرصے کی لاتعلقی اور موجودہ التفات کو اچھی طرح جتا کر اپنے ذہن و دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد ساری امیدیں ختم کر کے اپنے قدم واپس موڑ لے گی مگر فائق کا سامنا ہوتے ہی خود سے کیا گیا عہد ریت کی طرح پھسل کر مٹھی سے نکل گیا تھا۔

وہ فائق کے بدلے لہجے اور انداز پر خوش امیدیوں کی آہٹیں محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ اُن آہٹوں کو کھوجتی اُس کے پیچھے ریسٹورنٹ میں اُس کے سامنے بیٹھی بہت کچھ سننے کی منتظر تھی۔ فائق نے چائے کے ساتھ کافی لوازمات منگوا لیے تھے۔

''فائق...... اتنا کچھ؟ میں کہاں کھا پاؤں گی۔''

''کیوں بھئی...... پہلے تو تم فرمائشیں کیا کرتی تھیں۔'' فائق نے میزبانی نبھاتے ہوئے خود اِس کی پلیٹ میں چکن بریڈ کے ٹکڑے منتقل کیے۔

''پہلے کی بات اور تھی...... پہلے فرمائشیں پوری ہو جاتی تھیں اور اتنی سمجھ بھی نہیں تھی۔''

''کس بات کی سمجھ نہیں تھی؟'' فائق نے قدرے چونک کر پوچھا۔ شہری کا لہجہ ذومعنی سا تھا۔

''یہی کہ عادتیں خراب کرنے والے...... جب اپنی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔ اُن کا تو کچھ نہیں جاتا' اپنا جینا مشکل ہو جاتا ہے۔'' شہرینہ نے ٹھہر ٹھہر کر اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آج وہ بات کہہ دی تھی جو اُس کے اندر چھپی بیٹھی تھی۔

فائق نے اُس سے نظریں چراتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سرسری لہجے میں بات کا رخ بدلا۔

''کون ہے بھئی ذرا ہمیں بھی تو پتہ چلے جو اپنی دنیا میں گم ہو گیا تمہاری عادتیں خراب کر کے۔''

''یہ آپ پوچھ رہے ہیں؟'' شہرینہ نے اُسے برملا احساس دلا دیا تھا۔ اِس لمحے سے تو وہ عرصہ دراز سے بچتا آیا تھا۔ انعم کو شریکِ زندگی کرنے کے فیصلے کے بعد اُس پر شہرینہ کی محبت اور زیب خالہ اور اپنی ماما کے ارادوں کا بھید کھلا تھا۔

لیکن وہ اپنی محبت کو پانے کے جنون میں مبتلا تھا۔ اُس وقت اُسے نہ کسی کے ارادوں' وعدوں کی پرواہ تھی اور نہ ہی کسی کی محبت کی کشش نے باندھا تھا۔ شہرینہ اُس کے لیے صرف دوست تھی اور کزن' اب وہ شہرینہ کی باتیں سن اور سمجھ کر کچھ کچھ شرمندہ ہو رہا تھا۔ نجانے شہرینہ نے کب اور کیسے اُس کے دوستانہ رویے کو محبت کا رنگ سمجھ لیا تھا۔ وہ تو عادتاً دوست نواز اور خیال رکھنے والا تھا۔ یہ تو انعم ہی اُسے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''ہاں شاید! مجھے نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ کچھ باتیں اَن کہی رہنے دینی چاہیے۔'' فائق یکدم سنجیدہ ہو کر

بولا۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ اَن کہی کی اذیت صرف ایک جھیلتا ہے دوسری صورت میں کہہ کر بھی اگر کوئی نہ سمجھے تو دوہری اذیت اور ندامت حصے میں آتی ہے۔'' شہرینہ نے ایک بار پھر واضح طور پر اپنا خیال ظاہر کیا۔ فائق کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اب اُس سے کیا کہے۔

''تمہیں معلوم ہے زیب خالہ نے مجھے ایک ذمہ داری دی ہے۔'' فائق نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بڑی ہمت پیدا کر کے یہ موضوع چھیڑا تھا۔

''جانتی ہوں...... مگر میں انہیں Clearly بتا چکی ہوں کہ مجھے شادی نہیں کرنی......اور پلیز آپ بھی یہ ٹاپک کلوز ہی رہنے دیں۔'' وہ ایکدم اپنے خول میں بند ہوگئی تھی۔ فائق کے پاس مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

☆......☆......☆

اصم کی ذرا آنکھ لگی تھی۔ اروی اسی لیے کچھ دیر کے لیے نیچے چلی آئی تھی۔ سب اپنے اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کرے۔ کسی کے کمرے میں جانے کی اُس کی ہمت نہیں تھی۔ اور لاؤنج میں تنہا بیٹھنا ہی اُسے عجیب لگ رہا تھا' آخر تنگ آکر وہ نیلم کے کمرے کی طرف چلی آئی۔

اُسے یقین تو نہیں تھا کہ وہ اس وقت اٹھی ہوگی۔ کالج سے آکر وہ سو جاتی تھی۔ ابھی وہ اس کے دروازے پر دستک دینا ہی چاہتی تھی مگر وہ ٹھٹک کر دروازے پر ٹھہر گئی۔ نیلم کے ہنسنے کی آواز کے ساتھ اُس کے لہجے کی کھنکھناہٹ بالکل نئی تھی وہ قدرے شوخی سے کہہ رہی تھی۔

''اچھا......! خوبصورت تو میں ہوں۔ I Know Very Well کوئی اور...... خوبی بتائیں۔''

''یا اللہ...... نیلم...... اس طرح کس سے بات کر رہی ہے؟'' اروی کی سوچیں اُلجھ گئی تھیں۔ وہ فوراً کمرے میں جانا چاہتی تھی لیکن سوا ندیشوں نے اُس کے پاؤں جکڑ رکھے تھے۔ اُسے پہلا ڈر تو یہی تھا کہ انعم کی طرح نیلم بھی اُس کی مداخلت کو ناپسند کر کے کوئی ہنگامہ نہ اٹھائے۔

''نہ...... نہ ایسی غلطی مت کرنا...... رات کو کال پک نہیں کر سکتی۔ بی بی جان نظر رکھتی ہیں۔'' اُس کی ہنسی کی آواز تھم گئی تھی۔ اروی کی سماعتیں تو متحرک تھیں باقی وجود غیر متحرک سا ہو رہا تھا۔ اُسے اپنے اردگرد سرد سی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ نیلم جن دنوں میں اُس کے ساتھ اُس کے کمرے میں سوتی تھی اُن دنوں میں اروی کو ایک دوبار کچھ وہم سا تو ہوا تھا کہ وہ لیپ ٹاپ پر چیٹ کرتی تھی۔

نیلم سے پوچھنے پر اُس نے بتا بھی دیا تھا کہ کالج کی دوستوں سے گپ شپ ہوتی ہے لیکن آج...... ابھی اُسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ دوستوں سے ایسی باتیں کی تو جا سکتی ہیں مگر یہ انداز...... اُسے کسی خطرے کی بو آرہی تھی۔

''ظاہر ہے...... اُن سے ڈر لگتا ہے۔ انہیں خبر ہوگئی تو میرے ساتھ آپ کی بھی خیر نہیں ہے مسٹر۔''

''اتنا آسان نہیں ہے انہیں دھوکہ دینا۔'' اروی کی سماعتیں بھی سنسنانے لگیں تھی۔ نیلم کی شوخی' اُس کا

اعتماد اُس کا لب ولہجہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ اپنی ہم صنف نہیں بلکہ مخالف صنف سے محوِ کلام تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کرے۔

قدم بڑھا کر اندر چلی جائے اور اُسے شرمندہ کرنے کے ساتھ سرزنش کرے۔ سمجھائے بجھائے، غلطی کا احساس دلائے لیکن اگلے ہی لمحے ذہن نے اُسے اپنی حیثیت و وقعت کا احساس دلا کر خاموشی سے پلٹ جانے میں ہی عافیت دکھائی۔ اگر نیلم اُسے جھوٹا ثابت کردیتی اور اپنی توہین سمجھ کر ہنگامہ کھڑا کرے تو پھر اُس کا انجام کیا ہوسکتا ہے۔ یہ اندازہ لگانا اُس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر پلٹ تو آئی تھی مگر ذہن و دل میں ایک کانٹا سا گڑ گیا تھا۔ کچھ کرنے کی سکت کے باوجود نہ کرنے کی خلش ضمیر پر کسی بوجھ کی طرح آپڑی تھی۔

☆......☆......☆

''زہیر ابھی کچھ دیر پہلے ہی یونیورسٹی سے واپس آیا تھا۔ اُس کے سی ایس ایس کے امتحان کی ڈیٹ شیٹ آگئی تھی۔ اُسی سلسلے میں وہ یونیورسٹی گیا تھا۔ زہرہ نے بیٹے کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ آیا تو وردہ دونوں کے لیے کمرے میں ہی کھانا لے آئی۔ موسم بدل رہا تھا۔ ذرا گرمی اور گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ وردہ نے کچن سے آکر چھت والے پنکھے کی رفتار میں اضافہ کیا۔

''وردہ...... اتنی گرمی نہیں ہوئی جتنی تم محسوس کرنے لگی ہو۔'' زہرہ نے روز کی نصیحت دہرائی تو وہ اپنے لیے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے منہ بنا کر بولی۔

''امی! اب آپ کو گرمی نہیں لگتی تو میں کیا کروں ذرا باہر نکل کر دیکھیں۔ سورج صاحب کو بھی بس ہم غریبوں پر ہی تپ چڑھتی ہے۔ امیر لوگ تو اپنی اے سی والی کاروں میں سفر کرکے اُن کے عتاب سے بچ جاتے ہیں۔''

اُسے آج کالج سے واپسی پروین کا انتظار کرنا پڑا تھا اسی لیے۔

''تم تو ہمیشہ ناشکری رہنا...... صبر کیا کرو...... اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اے سی والی کار میں بیٹھنا نصیب کردے گا۔ پھر تمہیں بھی غریب لوگ یاد نہیں رہیں گے۔'' زہیر نے پلیٹ میں سالن نکال کر دسترخوان سے روٹی اٹھائی۔

''ہا...... ں میں بھی اسے یہی سمجھاتی ہوں کہ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔ وہ لوگ بھی تو ہیں جو موسم کی شدتوں میں بھی کھلے میدانوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہم تو کروڑوں لوگوں سے بہتر ہیں۔''

''ہا...... ں جی امی...... شکر ہے اللہ نے ہمیں بہت سی نعمتیں عطا کی ہیں۔ گھر، رشتے، محبتیں زندگی گزارنے کے لیے یہ سب ضروری ہیں۔ آسائشات کا کیا ہے؟ دل سے محنت کی جائے تو وقت آنے پر یہ بھی مل جائیں گی۔''

زہیر نے بہت نرمی سے ماں کی بات کی تائید کی۔ وردہ قدرے جھنجلا کر بولی۔

''اور وہ وقت کب آئے گا؟''

''وردہ......'' زہرہ نے سرزنش کی۔

''اللہ...... میں نے تو بس ایک بات کردی تھی۔ آپ لوگ تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔ اُس دن اروٰی

آپی سے کوئی بات کی تھی تو وہ بھی یہی فلسفہ جھاڑ رہی تھیں۔'' وہ بچوں کی طرح روٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ تو زہرہ نے شکایتی انداز میں کہا۔

''عجیب ہی مزاج ہوتا جا رہا ہے اس لڑکی کا...... سمجھانے کی بات کرو تو...... پتہ نہیں کب بڑی ہوگی۔ اروی بھی تو تھی۔ کبھی جو پلٹ کر جواب دیا ہو۔''

زہرہ کو وردہ پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

''چھوڑیں امی...... آ جائے گی اسے بھی سمجھ...... آپ بتائیں آپ کا اروی کے گھر جانے کا پروگرام کیا ہوا؟ بات ہوئی آپ کی۔''

''بات تو ہوتی رہتی ہے اُس سے...... اصم کو ہاسپٹل سے آئے ہوئے بھی کافی دن ہو گئے۔ ہمیں تو فوراً جانا چاہیے تھا۔''

''ہا...... ں تو آپ اور ابو جی چلے جائیں۔'' زہیر نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر گلاس اُٹھا کر لبوں سے لگایا۔

''تمہارے ابو کو چھٹی نہیں مل رہی اور اتوار کو اُن کے دفتر کے ساتھی کے بیٹے کی شادی ہے۔'' زہرہ نے بھی اپنا کھانا موقوف کیا۔

''اِس کا مطلب ہے اِس ویک اینڈ پر بھی آپ لوگ نہیں جا سکیں گے۔''

''تمہارے ابو کہہ رہے تھے کہ میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں۔ تم دوبارہ اصم سے ملنے گئے بھی نہیں تھے۔''

''مگر امی...... میرے تو ایگزام ہونے والے ہیں اور......''

''ایک دن کی تو بات ہے بیٹا...... ابھی تو کچھ دن ہیں۔ پھر تم زیادہ مصروف ہو جاؤ گے۔'' زہرہ نے اُس کا عذر سن کر بھی اصرار کیا۔ تو وہ سر ہلاتے ہوئے ہاتھ دھونے کے لیے اٹھا۔

''ٹھیک ہے...... ایک دو دن میں چلتے ہیں۔ آپ اروی کو بتا دینا۔'' زہرہ نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ ذہن اروی کی طرف جانے کا پروگرام مرتب کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

اروی کے موبائل فون کی بجتی گھنٹی کی آواز پر اصم کی آنکھ کھلی تھی۔ اروی کا فون بیڈ کے دوسرے سرے پر تھا۔ اور اصم کی پہنچ سے دور۔ اُس نے کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اروی واش روم میں ہوگی۔ اِدھر فون کی گھنٹی بند ہوئی اُدھر اروی کمرے میں داخل ہوئی۔ اصم اُسے کمرے کے باہر سے آتے دیکھ کر جھنجلایا۔

''کہاں چلی گئی تھیں تم؟ تمہارا فون بج رہا تھا کب سے...... سو رہا تھا میں سکون سے۔'' اصم کے لہجے میں غصہ بھی تھا اور خفگی بھی...... اُس کا معمول بھی بدلا ہوا تھا۔ رات کو جاگتا تھا اور دن بھر وقفے وقفے سے نیند پوری کر لیتا تھا۔

''سوری اصم...... میں ابھی نیچے چلی گئی تھی۔''

''تو اپنا فون ساتھ لے جایا کرو۔'' اصم کا لہجہ ویسا ہی تھا۔ اُس نے اروی کے گم صم انداز کو نوٹ ہی نہیں

کیا تھا۔
''جی...... میں لے جایا کروں گی۔'' اروی نے تابعداری دکھائی۔
''اب دیکھ تو لو کس کی کال تھی۔'' اروی نے میڈیسن دینا تھی اس لیے وہ میز کے قریب جا کھڑی ہوئی۔
''جی میں دیکھ لیتی ہوں...... آپ پہلے اپنی میڈیسن لے لیں۔'' وہ پانی کا گلاس بھر کر اُس کی دوا لے کر پلیٹ کر قریب آ گئی۔ اصم نے نیم دراز ی میں ہی اپنی دوا نگلی...... پانی پی کر اُس کا ذرا موڈ بدلا تو اروی کو بغور دیکھ کر پوچھنے لگا۔
''کیا ہوا؟ تمہارا موڈ کیوں آف ہے۔ کسی نے کچھ کہا ہے۔''
''نہ...... نہیں...... میرا کیوں موڈ آف ہوگا۔ اور آپ کو یہ وہم کیوں رہتا ہے اصم کہ مجھے کوئی بھی کچھ کہہ سکتا ہے۔'' اروی نے خود کو سنبھال کر اُلٹا اُسی سے پوچھا۔
''یار تم کچھ کہتی نہیں ہو تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا میں کچھ محسوس نہیں کرتا۔''
''مـ...... یں سمجھی نہیں...... آپ کس بارے میں بات کر رہے ہیں۔'' اروی حیرت ظاہر کرتی بیڈ کے دوسرے سرے کی طرف چلی گئی اور بستر پر بیٹھ کر اپنا سیل فون اٹھایا۔
''تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میں کس بارے میں بات کر رہا ہوں۔''
''انعم کا رویہ تمہارے ساتھ کچھ چیلنج ہے۔ انعم فطرتاً تھوڑی صاف گو ہے۔ اُسے اندازہ نہیں رہتا کہ اُس کی بات سیکنڈ پرسن کو کتنا افیکٹ کرتی ہے۔ وہ بس کہہ جاتی ہے پلیز تم مائنڈ مت کرنا۔'' اصم کو احساس تھا کہ انعم کا رویہ کئی بار نا قابل برداشت بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے باوجود اروی نے اُسے پلٹ کر اب تک کچھ نہیں کہا تھا اور نہ ہی اُس سے شکوہ کیا تھا۔
''اصم ایک بات کہوں۔ ایک بار کا رویہ نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ لیکن بار بار ایک ہی بات کا احساس دلایا جائے تو انسان خود پر کتنا کنٹرول رکھ سکتا ہے۔'' اروی نے ڈرتے ڈرتے دل میں آئی بات آخر کہہ دی۔
''میں جانتا ہوں یہ مشکل کام ہے لیکن تمہیں میری خاطر یہ کرنا پڑے گا...... میں انعم کو بھی سمجھاؤں گا کہ وہ ہماری شادی کے ایشو کو اب چھوڑ دے۔''
''ہوں...... شاید وہ آپ کی بات سمجھ جائے۔'' اروی نے خود پڑ بڑھتا اُس کا مان نہیں توڑا۔ پھر اُس نے اپنا موبائل فون چیک کیا تو بے ساختہ بولی۔
''اوہ...... امی کی کال آ رہی تھی۔''
''تم انہیں کال بیک کر لو۔'' اصم نے مشورہ دیا۔
''ابھی وہ عصر کی نماز پڑھ رہی ہوں گی۔ میں بھی نماز پڑھ لوں پھر انہیں فون کرتی ہوں۔'' اروی نے فون واپس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور نماز پڑھنے کے لیے وضو کی خاطر واش روم میں گھس گئی۔ اصم کے چہرے پر خاصا اطمینان نظر آ رہا تھا۔
صالحہ درانی 'انعم اور فائق کی وجہ سے مسلسل اک عالمِ پریشانی میں رہنے لگی تھیں۔ انہیں اپنے گھر کا

شیرازہ بکھرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اکلوتے بیٹے کے حوالے سے انہوں نے کیا کیا خواب دیکھے تھے۔ بہو کو بیٹی کے روپ میں دیکھنے کی انہیں کتنی حسرت رہی تھی۔ اُن کا کوئی خواب، کوئی حسرت پوری نہیں ہوئی تھی۔ اب بھی وہ لاؤنج میں تنہا بیٹھی اِسی نہج پر سوچ رہی تھیں کہ نجانے فائق اور انعم میں نبھاہ ہو پائے گا یا نہیں اور اُن کے آنے والے بچے کا مستقبل کیا ہوگا۔ اُن کے سامنے میز پر پڑی اُن کی چائے بھی ٹھنڈی ٹھار ہو کر بے مزا ہو چکی تھی۔ انہیں ابھی بھی احساس نہ ہوتا اگر فون کی رنگ ٹون انہیں نہ چونکاتی۔ فون اسکرین پر زبدہ کا نام پڑھ کر لمحہ بھر کو انہیں حیرت بھی ہوئی کتنے دنوں بعد اُدھر سے رابطے کی کوشش ہوئی تھی۔ جی میں تو آیا کہ کال ریسیو نہ کریں پھر کچھ سوچ کر انہوں نے رابطہ بحال کیا۔

''جی...... وعلیکم اسلام...... آپ نے آج کیسے یاد کرلیا؟'' سلام کا جواب دیتے ہوئے ہلکا سا طنز خود بخود صالحہ کے لہجے میں در آیا۔

''آپ کا شکوہ جائز ہے صالحہ بھابی...... سچ پوچھیں تو میری ندامت میرا حوصلہ توڑ دیتی تھی...... میں چاہ کر بھی دوبارہ نہ آ سکی۔ انعم نے آپ کو نہیں مجھے تکلیف دی ہے۔'' زبدہ شریح نے واقعی نادم ہو کر کہا۔ کتنی ہمت جوڑ کر انہوں نے صالحہ کو کال ملائی تھی کتنے دنوں سے وہ اس کشمکش میں تھیں۔

''زبدہ بھابی آپ ماں ہیں سمجھ سکتی ہیں۔ اولاد کی دی ہوئی تکلیف تو انسان بھلا دیتا ہے۔ لیکن اِس کی طرف سے عزت نہ ملے تو جینے کی خواہش نہیں رہتی۔ میں انعم کو ہمیشہ بیٹی سمجھتی تھی۔ مگر افسوس اُس نے کبھی مجھے ماں والا مقام دیا نہ ہی ساس والی عزت۔'' دوسری طرف لائن پر موجود زبدہ ندامت سے مزید گڑھ کر رہ گئیں۔

''ہمارے خاندان میں بھی بچیاں ہیں۔ لیکن میں نے کسی میں ایسا زعم، ایسا غرور نہیں دیکھا۔ آپ کی تربیت میں پلی بڑھی لڑکی ایسی ہٹ دھرم اور خود پسند ہوگی میں کیا کوئی بھی نہیں سوچ سکتا۔'' صالحہ نے کچھ توقف کے بعد مزید دل کا غبار نکالا۔ زبدہ ناچار سننے پر مجبور تھیں۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہیں تو کیا کہیں۔ مزید شرمندگی سے گویا ہوئیں۔

''صالحہ بھابی...... میں آپ سے یہی درخواست کروں گی کہ بچی سمجھ کر اُس کی غلطی معاف کر دیں۔ میں...... میں اُسے سمجھاؤں گی...... وہ آپ سے معافی مانگے گی۔ آپ بھی فائق کو سمجھائیں کہ ذرا مصلحت سے کام لے۔''

''زبدہ بھابی! میں صاف بات کہوں گی۔ معاملہ میرے سمجھانے سے آگے پہنچ گیا ہے۔ فائق کا غصہ کم نہیں ہو رہا۔ وہ اُس دن روکتا رہا اور وہ ٹیکسی منگوا کر چلی گئی۔ ایک بار کی بات تو نظر انداز ہو جاتی ہے۔ وہ بار بار یہی کرتی ہے۔ مرد کی بھی عزتِ نفس ہے، انا ہے۔ وہ کب تک برداشت کرتا رہے۔''

''صحیح کہہ رہی ہیں آپ...... دونوں میں برداشت نہیں ہے۔ میں سوچتی ہوں آنے والے بچے یا بچی کو کس بات کی سزا ملے گی کہ وہ ایسے والدین کو برداشت کرے۔'' زبدہ قدرے چڑ کر ہارے ہوئے انداز میں بولیں۔

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ فائق نے ہمیشہ کمپرومائز کیا ہے۔ اب انعم کو سمجھائیں کہ اپنی برداشت بڑھائے۔ ورنہ نتیجہ بچے ہی بھگتتے ہیں۔ باقی آپ خود سمجھدار ہیں۔'' صالحہ نے بات ہی ختم کر دی تھی۔ زبدہ

مزید کیا کہتیں۔
''اللہ حافظ۔'' کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ صالحہ درانی کے لب و لہجے اور باتوں نے اُن کی فکریں مزید بڑھا دی تھیں۔ اُن کے اندر انتشار پھیل رہا تھا۔
سارے گھر والے اپنے اپنے معمولات میں مصروف تھے اور انعم اپنے کمرے میں مزے سے لیٹی ٹی وی پر کوئی غیر ملکی ڈرامہ دیکھنے کے ساتھ پہلو میں رکھی کٹے ہوئے پھل کی پلیٹ سے کانٹے کے ساتھ ٹکڑے اُٹھا اُٹھا کر کھانے میں بھی مشغول تھی۔ ارد گرد کشن، تکیے بے ترتیب پڑے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے برتن بھی ایک طرف میز پر پڑے تھے۔ اور تو اور اُس کے چند کپڑے بھی صوفے پر پڑے منہ چڑھا رہے تھے۔
بی بی جان اُس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو یہ پھیلاوا دیکھ کر جیسے چیخ ہی پڑیں۔
''یہ...... یہ سب کیا ہے انعم......!'' بی بی جان کی آواز پر وہ بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔
''کمرے کی حالت دیکھو......؟ یہ برتن...... یہ کپڑے...... اُف میرے خدا...... سارا سلیقہ قرینہ بھول گئی ہو کیا؟'' بی بی جان کی کوفت اُن کے چہرے سے نظر آ رہی تھی۔
''مہ...... میں...... نے تو شمو کو بلا...... یا تھا...... وہ آ...... ئی نہیں اب تک۔'' انعم نے صاف جھوٹ بولا تو وہ سر ہلانے لگیں۔
''میں مان ہی نہیں سکتی کہ شمو بلانے پر بھی نہیں آئی۔''
''آپ کا مطلب ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں۔'' وہ ذرا بگڑ کر بولی تو بی بی جان اُس کی ڈھٹائی دیکھ کر رہ گئیں۔
''میری باتوں کا مطلب اگر تم اتنی آسانی سے سمجھنے والی ہوتیں تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔''
''آپ صاف بات کریں بی بی جان...... آج پھر آپ کا موڈ ہے مجھے نصیحتیں کرنے کا۔'' وہ لیٹی سے اُٹھ بیٹھی تھی۔ اُس کا لہجہ بدتمیز بھی تھا اور انداز بے ادب...... بی بی جان کو صالحہ درانی کی ساری باتیں سچ لگنے لگیں۔ واقعی وہ دن بہ دن بے لحاظ اور بدتمیز ہوتی جا رہی تھی۔
''آخر تم چاہتی کیا ہو انعم...... نہ تم نے شوہر اور ساس کو عزت و مقام دیا ہے اور نہ ہی ہماری عزت کا پاس رکھا ہے۔ کبھی سوچا ہے جب تمہارے بھائیوں اور بابا جان کو تمہاری حرکتوں کا پتہ چلے گا تو کیا انجام ہوگا۔'' بی بی جان جذباتی ہو کر بولیں۔ انعم نے انہیں شدید صدمے سے دوچار کر دیا تھا۔ آج صالحہ سے جو کچھ سنا تھا اُس کے بعد اُن کا دل چاہتا تھا زمین پھٹے اور وہ اِس میں سما جائیں۔ صالحہ نے برملا اُن کی تربیت پر انگلی اٹھائی تھی۔
''انہیں صرف میری حرکتوں کا پتہ چلے گا؟ انہوں نے میرے ساتھ جو زیادتی کی۔ میں نہیں بتاؤں گی؟'' وہ اُسی ڈھٹائی سے بولی۔
''اللہ کا خوف کرو انعم...... اپنا نہیں تو اپنے بچے کے بارے میں ہی سوچ لو...... اس طرح رشتے خراب نہیں کرتے۔ یہ وقت گزر گیا تو بہت پچھتاؤ گی...... ہم سدا تمہارے سر پر نہیں بیٹھے رہیں گے۔ کچھ ہوش کے ناخن لو۔'' بی بی جان تڑپ اٹھی تھیں۔ وہ انعم کو سمجھانے میں ناکام ہو کر بے قرار سی تھیں۔
''بی بی جان کیا میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔ میری تکلیف آپ کو محسوس ہی نہیں ہوتی۔'' وہ اُلٹا انہی

سے خفا ہوئی۔

''بیٹی ہو...... تبھی تو سمجھاتی ہوں۔ اور جس تکلیف کو تم سر پر سوار کر کے یہاں آئی ہو یاد رکھو وہ جی کا روگ بن جائے گا اگر فائق نے ساری زندگی کے لیے تمہیں یہاں بیٹھا دیا۔'' بی بی جان کا پارہ آخر چڑھ گیا۔

''تو بٹھا دے...... مجھے بھی کوئی پرواہ نہیں ہے اُس کی۔'' وہ ہاتھ جھٹک کر بولتی بستر سے کھڑی ہوگئی۔ مزید گوہر افشانی کی۔

''عجیب ماں ہیں آپ...... چار دن برداشت نہیں کر پا رہی ہیں آپ مجھے...... نہیں رہنا ہے مجھے اُس شخص کے ساتھ۔ کرلوں گی میں بابا جان سے بھی بات۔'' بی بی جان اُس کی زبان درازی پر حیران و ششدر سی تھیں۔ انہیں اپنے اردگرد سبھی کچھ گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

اروی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو اصم نے اُسے ایک بار پھر اُس کی امی کو فون کرنے کے لیے کہا۔ بلکہ اپنا سیل فون اٹھایا۔

''اروی...... آنٹی زہرہ کو اب تو کال کرلو۔ وہ پریشان ہوں گی۔ اُن کی کال نہیں ریسو ہوئی تھی۔''

''میں کر لیتی ہوں...... آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ امی کو اندازہ ہوگا کہ کسی وجہ سے ہی کال ریسو نہیں کی ہوگی۔'' اروی جائے نماز تہہ کر کے اُس کی جگہ پر رکھتی بولی پھر مڑ کر اصم کی طرف آ گئی۔

''انہیں غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے کہ شاید میں نے تمہیں منع کیا ہو؟'' اصم نے اپنا خیال فوری ظاہر کیا۔

''اصم...... وہ ایسا نہیں سوچ سکتے۔ اچھا میں ابھی بات کر لیتی ہوں۔'' اروی نے پہلے اپنی بات پر زور دیا پھر اُس کا خیال کر کے فوراً فون پکڑ کر اپنی امی کو کال ملائی۔

دوسری طرف سے زہرہ نے ہی فون سنا۔

''السلام علیکم امی...... کیسی ہیں آپ سب خیریت ہے نا۔''

''جی...... جی...... سوری میں روم میں نہیں تھی۔ اس لیے...... اچھا! آپ آ رہی ہیں۔''

''کب...... ٹھیک ہے...... جب چاہے آئیں۔ نہ...... نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے...... الحمدللہ...... اصم بھی بہتر ہیں...... آپ خود بات کرلیں۔'' اصم اُسی کی طرف متوجہ تھا۔ اروی نے بڑھ کر فون اُس کے کان سے لگایا۔

''السلام علیکم آنٹی!'' اصم کے لہجے میں جھجک سی تھی۔ دوسری طرف سے یقیناً سلامتی کی دعائیں دی گئی تھیں۔

''آپ سبھی کی دعائیں ہی ہیں آنٹی! انکل احمد کیسے ہیں...... آپ جب چاہے آ جائیں یہ آپ کی بیٹی کا گھر ہے...... جی...... ہم انتظار کریں گے...... انشاءاللہ...... آپ ٹائمنگ بتا دیجیے گا۔ ڈرائیور پک کر لے گا...... اس میں پریشانی کی کیا بات ہے آنٹی...... آپ کیب میں آئیں گی؟ تب بابا جان بھی ناراض ہوں گے۔ جی اللہ حافظ۔'' زہرہ نے اُس سے بھی پہلے رابطہ منقطع کیا تھا۔

''یار...... آنٹی زہرہ اتنی فارمل کیوں ہو جاتی ہیں۔'' اصم کا بے ساختہ ردِعمل تھا۔ زہرہ کی روا داری

جھجک اُسے شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

''آفٹر آل میں اُن کا داماد ہوں..... وہ مجھے کیوں شرمندہ کرتی ہیں۔'' اُس کے جھنجلائے سے تاثرات پر اروی گھبرا کر بولی۔

''کہ.....کیا؟ ہوا.....ا.....می نے ایسا کیا کہا' کہ.....؟''

''کہا کچھ نہیں..... مگر I Feel That..... وہ اب تک احسان مندی محسوس ہوتی ہیں۔ اُن کا جب دل چاہے وہ تم سے ملنے آسکتی ہیں۔ مجھ سے اجازت؟ چہ.....''

''اصم..... ہمارے معاشرتی نظام میں ہر بیٹی کے ماں باپ اپنے دامادوں اور بیٹی کے ساس سسر کے احسان مند ہی رہتے ہیں۔ میری امی کا رویہ ایسا نیا تو نہیں ہے۔ وہ بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں اور پھر آپ کا احسان مند ہونا تو جائز بھی ہے آپ نے تو اُس وقت مجھے اپنایا تھا جب.....'' اروی کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بھیگ گئی۔ اصم نے اُسے بات مکمل کرنے سے پہلے ہی ٹوک دیا۔

''اچھا..... پلیز..... ! یہ چیپٹر اس وقت نہ ہی کھولو تو بہتر ہے۔'' اصم کا موڈ خراب ہونے لگا تھا۔

اروی نے فوراً ہی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے لب بھینچ لیے۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔

''ٹھیک ہے..... آپ اپنا موڈ نہ خراب کریں۔ چائے بنالاؤں..... چائے پئیں گے؟'' اروی فون ایک طرف رکھ کر کھڑی ہوگئی۔

''ہاں..... بنالاؤ اور بی بی جان سے کہو آج میرے ساتھ آکر چائے پئیں۔'' اصم نے بھی گہری سانس لے کر موڈ بدلنے کی کوشش کی۔ اروی دھیمی مسکراہٹ دیتی سر ہلا کر کمرے سے نکل کر نیچے کی طرف بڑھی۔

☆.....☆.....☆

بی بی جان انعم کے کمرے سے نکل آئیں تو انہیں اپنے اردگرد بھی کچھ گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اُن کا دل اُلٹ رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کوئی بڑھ کر انہیں تھام لے۔ اروی جو آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ انعم کے کمرے سے نکل کر لاؤنج کی طرف بڑھتی بی بی جان کے رنگ بدلتے چہرے کو فاصلے سے محسوس کرکے ذرا جلدی سے اُن کی جانب بڑھی۔ بی بی جان کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ سے ہی پتہ چل رہا تھا کہ وہ خود کو سنبھال نہیں پا رہی۔ اس سے پہلے کہ وہ چکرا کر گر جاتیں۔ اروی نے تقریباً بھاگ کر انہیں گرنے سے تو بچالیا تھا مگر خود کو چیخنے سے نہیں روک پائی تھی۔

''بی..... بی بی جان..... ا..... صم!'' اُس نے بے ساختہ ہی اصم کو پکارا تھا۔ اصم تک اُس کی آواز پہنچی ضرور تھی مگر وہ صورتِ حال سے بے خبر تھا۔ ثمن فوراً ہی کمرے سے نکل کر آئی تھی۔

''بی بی جان..... بی بی جان کیا..... کیا ہوا ہے؟'' وہ بھی فوراً بی بی جان پر جھکی پوچھ رہی تھی۔ بی بی جان اروی کی بانہوں میں بکھری سمٹی ہوش وخرد سے بیگانہ محسوس ہو رہی تھیں۔

''پتہ نہیں ثمن بھابی..... بی بی جان..... گرنے والی تھیں۔ میں..... بلانے آئی تھی..... اصم..... چائے.....'' اروی گھبراہٹ کی وجہ سے بول نہیں پا رہی تھی۔

''تم جلدی سے کسی کو بلاؤ..... ایمبولینس کو کال کرو جلدی کرو اروی۔'' ثمن نے بی بی جان کو اپنی

بانہوں کا سہارا دے کر اُسے گھبراہٹ میں ہدایت دی۔ اروی بے ساختہ اُٹھ کر پی ٹی سی ایل سیٹ کی طرف بھاگی۔ کچھ ہی لمحوں میں گھر میں پریشانی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ سبرینہ انعم، نیلم اور ملازمین تک گھبرائے ہوئے تھے۔ اروی نے گھبراہٹ کے مارے بابا جان کو فون کر دیا تھا۔ وہ بھی فیملی ڈاکٹر کو فون کر کے فوری گھر چلے آئے تھے۔ ڈاکٹر اُن کے آنے سے پہلے گھر آ چکا تھا۔ شادؤ شمو اور ثمن سبرینہ بی بی جان کو کمرے میں لے آئی تھیں۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد بتا دیا تھا کہ فشار خون بڑھ جانے کے باعث وہ چکرا کر گری تھیں۔ فی الحال تو قابلِ تشویش کوئی بات نہیں تھی مگر آئندہ کے لیے احتیاط کی ہدایت تھی۔

''ڈاکٹر سہیل کوئی قابلِ تشویش بات تو نہیں۔ اس طرح اچانک بلڈ پریشر کا بڑھنا' کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ پلیز کوئی ضرور ٹیسٹ وغیرہ کروانے ہیں تو بتا دو۔'' شریح خان بے قراری سے پوچھتے ڈاکٹر سہیل کو زیر لب مسکرانے پر مجبور کر گئے۔

''یار...... اس عمر میں بچوں کو بیمار دیکھیں تو Stress بڑھ جانے سے اکثر بلڈ پریشر بھی بڑھ جاتا ہے۔ اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس بھابی کو آرام کرنے دو۔ فی الحال کسی ٹیسٹ کی ضرورت نہیں ہے۔'' شریح خان اور ڈاکٹر کمرے سے باہر آ کر باتیں کر رہے تھے۔ باقی سب بھی بی بی جان کے اردگرد کھڑے تھے۔ ثمن کے کہنے پر باری باری نکلنے لگے۔ اروی اور نیلم وہاں رُکنا چاہتے تھے۔ ثمن نے اروی کو اصم کے بارے میں یاد دلایا۔

''اروی...... تم اصم کے پاس جاؤ...... اپنی پریشانی میں ہم اُسے بھول ہی گئے ہیں۔'' اروی کو یکدم احساس ہوا۔ اصم نجانے کیا سوچتا ہوگا۔ وہ فوراً اوپر کی طرف بھاگی۔ بی بی جان اب دواؤں کے زیرِ اثر پُرسکون تھیں۔ سبھی باری باری اُن کے کمرے سے نکل آئے۔

☆......☆......☆

اروی کمرے میں آئی تو اصم متوحش دبے بس سا اپنی وہیل چیئر کو پکڑ کر بیڈ کے قریب کرنے کی ناکام کوشش کر چکا تھا۔ اروی خود بھی پریشان سی تھی۔ اُسے اس طرح دیکھ کر مزید پریشان ہوگئی۔

''اصم...... اصم یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ آپ کس طرح خود......'' اُس کی آواز گھٹ گئی تھی۔

''تم...... ؟ تم کہا......ں تھیں۔ کتنی آوازیں دی ہیں۔ سب کو...... کہاں تھے سب۔'' وہ تقریباً چیخ اٹھا۔

''اصم...... وہ...... بی...... بی...... جان۔'' اروی سے بولا نہیں گیا۔ پہلی بار اصم کو غصے میں چیختے سنا تھا۔ وہ سہم سی گئی۔

''میں...... بی بی جان کو بلانے گئی تھی۔ تو...... وہ...... پتہ نہیں انہیں کیا ہوا وہ گر گئی تھیں اور......''

''کیا؟ کیا ہوا بی بی جان کو...... کہاں ہیں وہ...... مجھے لے کر چلو ابھی۔'' اصم مزید بے قرار ہوا اور بے اختیاری میں اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کے جسم میں جیسے طاقت ہی نہیں تھی۔ اُس کا نچلا دھڑ منجمد سا سر کنے سے بھی قاصر سا محسوس ہو رہا تھا۔

اصم اپنی بے بسی پر ہیجانی کیفیت میں مبتلا سا ہونے لگا۔

''مہ...... میں بستر پر پڑ گیا ہوں تو...... اس کا مطلب ہے...... میں سب سے دور ہو گیا ہوں۔ کہ...... کوئی بھی میری نہیں سنتا...... سب کو آوازیں دے رہا تھا۔ کوئی نہیں آیا...... تہ...... م...... تم بھی......'' وہ اپنی ناکام کوشش پر ہانپنے بھی لگا تھا۔ اروی اُس کے لیے جلدی سے پانی لے کر آئی تھی۔

''اصم سوری...... ہم سبھی بی بی جان کی وجہ سے پریشان ہو گئے تھے۔ اسی لیے کوئی آ نہیں سکا...... اچھا...... آپ پانی پی لیں...... پھر آپ چلیں...... خود دیکھ لیں...... بی بی جان کے لیے ڈاکٹر آ گیا تھا۔ وہ اب سکون سے سو رہی ہیں۔'' اروی نے یکدم خود کو سنبھال کر بہت نرمی سے اُسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

''سکون؟ وہ سکون سے ہوتیں تو کیا چکرا کر گر جاتیں؟ تمہیں اُن کی تکلیف کا کیا پتہ؟'' وہ بے حد چڑ کر بولا۔ اروی اُس کی چڑچڑاہٹ پر دلبرداشتہ ہو کر بھی خود کو سنبھالنے کی کوشش میں پلکیں جھپک کر آنکھوں کی نمی اندر اتارنے لگی البتہ بوجھل آواز میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''اصم مجھے واقعی اُن کی تکلیف کا نہیں پتہ...... اُن کی تکلیف کا تو صرف انہیں ہی پتہ ہو گا یا پھر ڈاکٹر کو۔''

''اب باتوں میں ٹائم ضائع نہ کرو۔ مجھے لے کر چلو گی یا نہیں۔'' اصم کی اپنی بیقراری تھی وہ اس وقت صرف اور صرف بی بی جان کو سوچ رہا تھا۔ اروی نے پانی کا گلاس واپس میز پر رکھا اور اُسے وہیل چیئر پر بیٹھنے کی مدد کر کے اُسے لے کر نیچے کی طرف بڑھی۔

☆......☆......☆

بی بی جان کے کمرے سے نکل کر وہ چاروں لاؤنج میں ہی آ بیٹھی تھیں۔ بابا جان بھی ڈاکٹر سہیل کو رخصت کرنے کے بعد انہی میں آ گئے تھے۔

''کیا کسی کو معلوم ہے کہ آج ایسا کیا ہوا تھا جس کا انہیں اتنا Strees تھا۔'' بابا جان کے استفسار میں بیوی کے لیے فکر نمایاں تھی۔ وہ اُن کے سنجیدہ رویے پر ایک دوسرے کو انجان نظروں سے دیکھنے لگیں۔ نیلم بے ساختہ کہنے لگی۔

''بابا جان دوپہر کھانے تک تو بی بی جان بالکل ٹھیک تھیں۔ اچانک تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔'' ثمن اور سبرینہ کے چہرے پر بھی تائیدی نظر آئی۔ جبکہ انعم کے دل کا چور بول اٹھا۔

''بابا جان...... بی بی جان تو کافی عرصے سے پریشان ہیں۔ اور اُن کی پریشانی کی وجہ تو سبھی جانتے ہیں۔''

''کہ...... کیا؟ جانتے ہیں؟'' اُن کی تشویش بے ساختہ تھی۔ ثمن اور سبرینہ نے بھی قدرے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ وہ بنا جھجکے بات بڑھاتے ہوئے بولی۔

''جب سے اصم بھائی کی شادی ہوئی ہے اُن کی ٹینشن تو اُسی دن سے بڑھ گئی تھی۔ مزید اضافہ اُن کے ایکسیڈنٹ والے واقعے نے کر دیا...... تھا اور پھر لوگو...... ں کی باتیں اُن کے سوال...... آخر بی بی جان کی برداشت کتنا کام کرتی۔''

''انعم...... بیٹا...... ! کتنی فضول بات کی ہے آپ نے۔'' بابا جان کے لہجے کی ٹھنڈک اُن کے رویے کی

ناگواری کو واضح کرنے کے لیے کافی تھی۔ اُن کے تکلف میں اُن کی ناراضگی کی جھلک تھی۔

''آپ کی بی بی جان مقدر پر راضی رہنے والی صابر خاتون ہیں۔ لوگوں کی باتیں اور سوال اُن کی برداشت نہیں آزما سکتے۔ بہرحال...... آئندہ اس قسم کی فضول باتیں میں کسی کے منہ سے نہ سنوں۔'' وہ اپنے اُسی ناراض تاثر کے ساتھ اپنی نشست سے اُٹھ کھڑے ہوئے اُسی لمحے بیرونی دروازہ کھلا اور اروی وہیل چیئر کو آگے بڑھاتی اصم کو لیے آ گئی۔ بابا جان فوراً اُس کی طرف متوجہ ہو کر لپکے۔

''اصم...... تم...... بیٹا......!''

''بی بی جان کو کیا ہوا بابا جان؟ وہ کیسی ہیں؟ مجھے اُن کے پاس جانا ہے۔'' اصم نے بے تابی سے اُن کی بات کاٹی۔

''وہ ٹھیک ہیں بیٹا...... ڈاکٹر نے انجکشن لگا دیا ہے۔ وہ آرام کر رہی ہیں۔''

''م...... میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں بابا جان۔'' وہ بالکل بچہ بنا ہوا تھا۔

''میں...... میں انہیں ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ بس ایک نظر دیکھوں گا۔'' وہ بابا جان کے چہرے پر کشمکش دیکھ کر منت سے بولا۔

''ہاں...... ہاں آ جاؤ...... اروی بیٹا احتیاط کرنا...... انہیں جگانا نہیں۔'' مقصد تو اصم کو سنانا تھا۔ اروی نے اثبات میں سر ہلا کر انہیں مطمئن کیا۔ پھر وہ تینوں ہی بی بی جان کے پاس آ گئے۔ بی بی جان ہوش و خرد سے بیگانہ لیٹی ہوئی تھیں۔ اُن کے دلکش چہرے کے نقوش اس وقت اندرونی تکلیف و تاثر کے باعث کھنچے تنے اُن کی کیفیت کو ظاہر کر رہے تھے۔ بے آواز وہیل چیئر اُن کے بستر کے قریب روک کر اروی نے اُن کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے اُن کی تکلیف کو محسوس کر کے دل میں دعا کی۔

''یا اللہ...... بی بی جان کو کچھ نہ ہو...... اُن کی ساری پریشانیاں دور کر دے۔ انہیں مزید کسی بھی آزمائش سے بچا لے میرے اللہ۔ آمین۔'' اصم بھی بی بی جان کو بس دیکھے جا رہا تھا۔

''بابا جان......'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ اچانک بولا تو بابا جان جو انعم کی باتوں پر اندر ہی اندر پریشان سے تھے۔ یکدم چونک کر پوچھنے لگے۔

''کیا بات ہے اصم...... بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہو تو جا کر آرام کرو۔ تمہاری بی بی جان اب بہتر ہیں۔ اُٹھیں گی تو تم سے فون پر بات کریں گی۔'' انہوں نے اُسے دلاسہ دیا وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

''نہیں بابا جان...... م...... میں بالکل نہیں تھکا۔ بی بی جان کو جب تک ہوش نہیں آتا۔ میں یہیں رہوں گا۔'' وہ بضد ہوا۔ اروی نے بابا جان کو بے بسی سے دیکھا۔ وہ بھی خاموش رہ گئے۔ اصم کی حالت کے پیش نظر اُسے کچھ کہنا محال تھا۔ کچھ توقف کے بعد مسلسل کھڑی اروی کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

''تم بھی بیٹھ جاؤ بیٹا...... کب تک کھڑی رہو گی۔'' اروی بھی اجازت ملنے کی ہی منتظر تھی۔ وہ بھی ایک طرف جا بیٹھی اصم اس وقت اپنے احساسات میں گم تھا۔ بی بی جان کے لیے اُس کے دل میں درد و بیقراری بڑھتی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

شارم اور ضیغم کو بھی جیسے ہی اطلاع ملی وہ بھی گھر چلے آئے تھے۔ بلکہ شارم نے تو راستے میں ہی اپنی

ساس زیب النساء کو بھی کال پر بتا دیا تھا۔ بلکہ انہوں نے ہی معمول کے مطابق داماد کی خیریت معلوم کی تھی اور جواباً اُس نے بی بی جان کی کنڈیشن کا بتا دیا تھا۔ ضیغم ازحد پریشان اور فکر مند تھا۔ آتے ہی بے چینی سے کہنے لگا۔

''بی بی جان کو فوراً ہاسپٹل لے جانا چاہیے تھا۔'' وہ انہیں ایک نظر دیکھ کر باہر آیا تو اپنی بے قراری چھپا نہیں سکا۔ وہ بڑا ہونے کے علاوہ ذمہ دار اور محبت والا بیٹا بھی تھا۔

''بالکل! ہاسپٹل میں زیادہ اچھی ٹریٹمنٹ ہوتی۔ بی بی جان کے سارے ٹیسٹ وغیرہ بھی ہو جاتے۔'' شارم نے بھی تائید کی۔ شارم کی تائید بھی فطری تھی۔

''ڈاکٹر سہیل بروقت آگئے تھے ضیغم...... انہوں نے ہی کہا تھا کہ ہاسپٹل لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ثمن نے تحمل و نرمی سے شوہر کی تشویش ختم کرنا چاہی۔

''ہاں...... ہاں...... میں نے تو ایمبولینس کو بھی کال کر دی تھی۔'' سبرینہ نے دروغ گوئی سے کام لیا۔ اصم کے لیے پانی لینے کے لیے آنے والی اروی بیچ راہ میں ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ سبرینہ تو اُس وقت وہاں تھی ہی نہیں۔ اُسے اُس کے جھوٹ پر حیرت ہوئی۔

''اور بابا جان کو کس نے کال کی؟'' انہیں کیوں پریشان کیا۔ انہیں پریشانی میں کچھ ہو جاتا تو...... وہ خود ڈرائیو کر کے آئے ہیں۔ معلوم تو ہے وہ بی بی جان سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔'' شارم کو یکدم یاد آیا تو وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

انعم نے اروی کو فاصلے پر کچن کے راستے میں کھڑا دیکھ لیا تھا۔ وہ قدرے بلند آواز میں اُسے ہی سنانے کو بولی۔

''ہیں یہاں بھی کچھ ایک بے وقوف' جنہیں اپنی کارکردگی دکھانے کا بہت شوق رہتا ہے۔ شارم بھائی' حالانکہ اُن کی کارکردگی سے ہمیشہ...... دوسروں کو نقصان ہی پہنچا ہے۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ دور کھڑی اروی پر جیسے کئی گھڑوں پانی پڑ گیا۔

''شمو کو سمجھایا کریں...... آئندہ ایسی سچویشن خدانخواستہ ہو تو بابا جان کو ہرگز کال نہ کرے۔'' ضیغم انعم کی باتوں کا اشارہ شمو کی ذات ہی سمجھا تھا۔

''شمو اتنی نادان نہیں ہے ضیغم بھائی...... کافی عقلمند ہے وہ تو ہمار...... ی چھوٹی بھا...... بی ہی ناسمجھ ہیں جو......'' وہ زیر لب ہنستی بات ادھوری چھوڑ گئی۔ دل ہی دل میں اروی کی حالت زار پر محظوظ ہو رہی تھی۔ سبھی لاؤنج کے صوفوں پر براجمان تھے اور چند ایک کو اروی کچن کے قریب تر نظر بھی آرہی تھی۔ ثمن اِس کی موجودگی کا احساس کر کے انعم کو ٹوکے بغیر نہ رہ سکی۔

''انعم...... اگر تم اُس وقت ہوتیں تو شاید تم بھی پہلے بابا جان کو کال کرتیں...... ویسے بھی اب ان باتوں کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ شکر ہے بی بی جان کسی خطرے میں نہیں ہیں۔'' ثمن سنجیدگی سے بولتی اپنی نشست سے کھڑی ہوگئی۔ وہ سب کے لیے چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف آ گئی۔ اروی بھی خود کو سنبھالتی خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ اُسے اس وقت صرف اصم کا خیال رکھنا تھا۔ باقی سب کچھ برداشت کرنا تھا۔

(اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہ جولائی میں ملاحظہ فرمائیں)

ترتیب: راز عدان

خوبصورت یقین

اللہ کبھی بھی دوسرا دروازہ کھولے بغیر پہلا در بند نہیں کرتا۔

............*

99 بیماریوں کی دوا

حضور ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص 'لاحول ولاقوۃ الا باللہ' پڑھے گا تو یہ ننانوے امراض کی دوا ہے جس میں سب سے چھوٹی بیماری رنج و غم ہے۔''
(مندرک حاکم 1990 عن ابی ہریرہ)

............*

بسم اللہ کی برکت

جو شخص سوتے وقت 21 بار پوری بسم اللہ پڑھتا ہے اللہ پاک فرشتوں سے فرماتا ہے کہ ''اس کی ہر سانس کے بدلے نیکی لکھو۔''

لگاؤ

ایک دفعہ ایک مرشد کامل اپنے مرید سے فرما رہے تھے کہ اے بیٹے انسان کو جتنا لگاؤ رزق سے ہے اتنا لگاؤ رزق دینے والے سے ہوتا تو اس کا مقام فرشتوں سے بڑھ جاتا ہے۔

راحیلہ۔ لاہور

تربیت

اپنے بیٹے کو یہ سکھانا کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھے اتنا ہی ضروری ہے جتنا اپنی بیٹی کو بتانا کہ وہ حجاب ہے۔

............*

بڑی مشکل ہوتی رہی تھی جب

1) بائیولوجی کے ٹیچر نے پڑھایا......
''سیل مطلب جسم کے سیل''
2) فزکس کے ٹیچر نے پڑھایا......
''سیل مطلب بیٹری''
3) اکنامکس کے ٹیچر نے پڑھایا......
''سیل مطلب فروخت''
4) ہسٹری کے ٹیچر نے پڑھایا......
''سیل مطلب جیل''
5) انگریزی کے ٹیچر نے پڑھایا......
''سیل مطلب موبائل''

تعلیم ہی چھوڑ دی یہ سوچ کر کہ جس اسکول کے 5 استاد ہی متفق نہیں ایسے اسکول میں پڑھ کر کیا ہوگا۔

فیضان۔ کراچی

پاکستان

شیر کے ریٹائرڈ ہونے پر جنگل کے سارے جانوروں نے بادشاہ کے لیے اجلاس بلایا۔
اجلاس جاری تھا کہ ایکدم ایک گدھا کھڑا ہوا اور بولا۔

''اس بار مجھے جنگل کا بادشاہ بنایا جائے۔''
تب لومڑی مسکرا کر بولی۔
''صدقے جاؤں یہ جنگل ہے کوئی پاکستان نہیں۔''

............*

سنہری بات

اگر آپ اپنی زندگی خوبصورت بنانا چاہتے ہیں تو عیب جوئی اور نکتہ چینی سے دور رہیں۔

سید محمد مکرم۔ دبئی

ریسرچ

جو لڑکیاں شادی کے لیے گنجے لڑکوں کو مسترد کرتی ہیں اُن کے شوہر شادی کے 5 سال بعد ہی گنجے ہوجاتے ہیں اور جو لڑکے شادی کے لیے موٹی لڑکیوں کو مسترد کرتے ہیں اُن کی بیویاں شادی کے دو سال بعد ہی موٹی ہوجاتی ہیں۔

صائمہ۔ رحیم یار خان

غداری

پٹھان واپڈا کے آفس میں...
''نمستے یہ لائٹ کب آئے گی۔''
افسر: ''تم نے نمستے کیوں کہا؟''
پٹھان: ''کیونکہ آپ پر سلامتی بھیجنا پورے ملک سے غداری ہے۔''

رفعت۔ کراچی

نصیب

انسان جتنا مرضی بھاگ لے مگر کس نے کس کو کہاں، کب اور کیسے ملنا ہے یہ فیصلے بہرحال کہیں اور ہی ہوتے ہیں۔

نیازمانہ

پرانے زمانے میں جب کوئی اکیلا بیٹھ کر ہنستا تھا تو لوگ کہتے تھے کہ اس پر کوئی بھوت پریت کا سایا ہے۔ اب اس دور میں کوئی ایسا کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں مجھے بھی Send کرو۔

غزالہ رشید۔ کراچی

انٹرویو

باس: ''اپنی صلاحیتیں بتاؤ؟''
سیکریٹری: ''ینگ ہوں، ڈائنامک ہوں، مخلص ہوں، ایماندار ہوں، پاورڈ ورکنگ ہوں، تعلیم یافتہ ہوں، تجربہ کار ہوں، اس جاب کے لیے ڈیزروکرتی ہوں، ٹائپنگ جانتی ہوں، فائلنگ میں تجربہ کار ہوں، کمپیوٹر جانتی ہوں، اکاؤنٹس بھی جانتی ہوں، بیماریوں سے محفوظ ہوں، پارٹی کرلیتی ہوں، ڈرنک بھی کرلیتی ہوں اور رومانس پسند کرتی ہوں..... اور آخر میں اپنے فلیٹ پر اکیلی رہتی ہوں۔''
باس: ''بس کر پگلی جوائننگ کے دن ہی پروموشن لے گی کیا؟''

راز عدن۔ بحرین

زندگی

زندگی ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی مختلف رنگ بدلتی رہتی ہے وقت گزرنے کے ساتھ بہت سی ایسی باتیں جو بالکل اہمیت نہیں رکھتیں اُن کی اہمیت ہوجاتی ہے۔

............*

معافی نامہ

کہا سنا جو بھی ہو معاف کرنا
کچھ وعدے کیے نہ نبھائے ہوں تو معاف کرنا
کچھ باتیں جو ہم دونوں کے بیچ ہوئیں
اُن میں کچھ برا بھلا کیا ہو معاف کرنا
جب کبھی میں نے تم کو ستایا ہو رُلایا ہو

ان سب غلطیوں کو میری نادانی سمجھ کر معاف کرنا

سنبل۔کوہاٹ

سچے رشتے

زندگی میں صرف ایسے لوگوں کی طرف دوستی اور اپنائیت کا ہاتھ بڑھائیں جو آپ کی ہنسی کے پیچھے چھپے آپ کے غم کو محسوس کرسکیں جو آپ کے غصے کے پیچھے چھپی محبت کو جان سکیں اور جو آپ کی خاموشی کا سبب معلوم کرنے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ ایسے لوگ اور ان سے جڑے رشتے ہی سچے ہیں باقی سب وقت کا زیاں ہیں۔

رضوانہ پرنس۔کراچی

جانتے ہیں محرومی کیا ہے؟

محرومی اور بے توفیقی یہ ہے کہ آپ دیر رات تک فیس بک اور واٹس اپ وغیرہ چلاتے رہیں لیکن اللہ کے لیے ایک سجدہ کرنے کی توفیق نصیب نہ ہو۔''

عقیلہ حق۔کراچی

نماز

جنہیں نماز پڑھنے سے سکون نہیں ملتا انہیں چاہیے کہ سکون سے نماز پڑھیں۔

سلمیٰ۔بحرین

گردے کی پتھری کا آزمودہ علاج

شہد، لیموں کے رس اور زیتون کے تیل کو ایک ایک چمچہ آدھے گلاس پانی میں حل کرلیں اور نہار منہ پی لیں۔ 15 سے 20 دن میں پتھری تحلیل ہوکر نکل جائے گی۔

ارم حمید۔کراچی

کباڑہ

میاں بیوی کھانا کھا رہے تھے۔

کھانے کے بعد شوہر اچانک اٹھا اور اس نے اپنی پلیٹ اور گلاس دھوکر رکھ دیے۔

بیوی غصے سے نیلی پیلی ہوکر حسب عادت بولی۔

''بس کردیا نا بنی بنائی عزت کا کباڑہ ہم گھر پر نہیں ہیں ہوٹل میں ہیں۔''

سعید خان۔لالہ موسیٰ

سوال

جو لوگ سوال نہیں اٹھاتے وہ منافق ہیں، وہ لوگ جو سوال کر نہیں سکتے وہ احمق ہیں اور جن کے ذہن میں سوال ابھرتا ہی نہیں...... وہ غلام ہیں۔

شاہدہ تبسم۔پنڈی

مولوی صاحب سے سوال

اگر بیگم میک اپ کر کے پوچھے۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟ تو کیا جھوٹ بولنا جائز ہے؟''

مولوی: ''شرعی حکم تو یہ ہے کہ ''خود کو ہلاکت میں مت ڈالو...... آگے آپ کی مرضی۔''

کشور زہرہ۔جھنگ

سونے کی چیز

ایک پٹھان کی شادی ہوگئی اس نے منہ دکھائی میں اپنی بیوی کو گلاب کا پھول دیا۔

بیوی: ''مجھے یہ نہیں چاہیے کوئی سونے کی چیز دو۔''

پھر پٹھان نے بیوی کو نیند کی گولی دے دی۔

ام فروا۔جہلم

گانا

ایک پاپ سنگر کو ایک صاحب نے اپنے گھر گانا سنانے کے لیے بلوایا۔ گلوکار نے بڑے

اسٹائل سے پوچھا۔
''سب سے پہلے کون سا گانا سناؤں۔''
''کوئی سا بھی گانا سنا دو ہمیں تو پڑوسیوں سے مکان خالی کروانا ہے۔'' صاحب بولے۔
رشنا علی۔ اسلام آباد

عورت

عورت کی خواہش اور مرد کی تاعمر آزمائش کو شادی کہا جاتا ہے۔
شادی سے قبل مرد کی زندگی حسین و رنگین اور شادی کے بعد غمگین و سنگین ہو جاتی ہے۔
آپ یقین کریں آپ کے راز آپ سے زیادہ آپ کی پڑوسن کو معلوم ہیں۔
عورت کی عقل، امتحان کی نقل، شاعر کی غزل اور مس کنول پر کبھی اعتبار نہ کریں۔
بند کھڑکی سے دور تک دیکھنے والی ایجاد کا نام عورت ہے۔
فاروق احمد۔ کراچی

وزن کم کرنے کا آسان ٹوٹکا

روزانہ نہار منہ دو کپ گرم گرم پانی کے پی لینے سے جسم میں موجود اضافی چربی زائل ہو جاتی ہے اور اگر تین کپ پانی میں آدھا چائے کا چمچہ ہلدی، چٹکی اجوائن، دار چینی اور کڑی پتہ ڈال کر خوب ابال لیں جب پانی دو کپ رہ جائے تو چھان کر فلاسک میں رکھ لیں اور تھوڑا تھوڑا کر کے پی لیں..... 15 دن میں فاضل چربی گھل جائے گی اور چہرے پر چمک اور تازگی پیدا ہو جائے گی۔
افشاں۔ U.K

تھکن اور پیاس سے کیسے بچا جائے

روزے دار کو روزے کی حالت میں پیاس بہت لگتی ہے اور پھر کے الیکٹرک نے جو قیامت برپا کی ہوئی ہے اُس میں نیند کی کمی اور گرمی کی شدت سے دوران روزہ تھکن اور پیاس بہت پریشان کرتی ہے ایسے میں اگر روزہ دار سحری کے وقت دہی میں 1 الائچی ملا کر کھالیں تو سارا دن نہ تو پیاس لگے گی اور نہ ہی تھکن محسوس ہو گی۔
پروین شیروانی۔ کراچی

شعر

میری وفا فریب تھی میری وفا پہ خاک ڈال
تجھ سا ہی کوئی باوفا تجھ کو ملے خدا کرے
مزنہ۔ ٹانک

جنتی لوگ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میری امت میں سے 70 ہزار بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے یہ وہ بندگان خدا ہوں گے جو منتر نہیں کراتے اور شگون بد نہیں لیتے وار نہ فال بد کے قائل ہیں اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں۔
(بخاری و مسلم)

اشعار

جس طرح رنج میں آنکھوں کی نمی کا ہونا
ایسا ہوتا ہے محبت میں کسی کا ہونا
تیرا سورج کے قبیلے سے تو تعلق نہیں
یہ کہاں سے تجھے آیا ہے کبھی کا ہونا
سیما رضا ردا۔ کراچی

مزے

رمضان میں جو بھی بنتا ہے سب مزے لے کر کھاتے ہیں۔ پاکستان بھی رمضان میں بنا۔
فرزانہ آغا۔ اسلام آباد

معمولاتِ رمضان

رمضان المبارک آخرت کی کمائی کا مہینہ ہے' دنیاوی' کاروباری اور ملازمتی مصروفیات کم سے کم کر کے اور غیر ضروری تعلقات ختم کر کے زیادہ سے زیادہ ماہِ مبارک میں اسلامی زندگی اختیار کی جائے جس کے لیے درج ذیل امور کو اپنے اپنے حالات کے مطابق ترتیب دے کر اور ایک نظام الاوقات بنا کر پابندی سے انجام دیے جائیں تو بہت فائدہ ہوگا۔

☆ صدقِ دل سے تمام گناہوں سے توبہ کریں اور کثرت سے توبہ واستغفار کا اہتمام رکھیں۔

☆ روزہ رکھنے اور تراویح پڑھنے کا پورا اہتمام کریں' بلاعذرِ شرعی ترک نہ کریں۔

☆ روزے میں آنکھ' کان' ناک' زبان' دل' دماغ اور تمام اعضاء کو ہر گناہ سے مکمل طور پر بچائیں۔

☆ نماز باجماعت کا مکمل اہتمام کریں۔

☆ اشراق' چاشت' اوابین' صلوٰۃ التسبیح' تحیۃ المسجد' تحیۃ الوضوء اور تہجد کے نوافل کو معمول بنائیں۔

☆ رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کا مطالعہ کریں۔

☆ تلاوت قرآن کریم کا جس قدر زیادہ ہو سکے معمول بنائیں۔

☆ چلتے پھرتے لاالہ الااللہ کا ورد رکھیں' کبھی کبھی پورا کلمہ پڑھ کر پھر درود شریف پڑھ لیا کریں۔

☆ جنت الفردوس مانگیں اور عذاب دوزخ سے پناہ مانگیں' نیز ملک وملت کی صلاح وفلاح کی دعا کریں۔

☆ دکھی انسانیت کی خدمت کو اپنا شعار بنائیں اور لایعنی کاموں میں یہ قیمتی وقت ضائع نہ کریں' شاپنگ' فضول گپ شپ کی محفلیں رمضان کے پرنور ماحول کے لیے نقصان دہ ہیں' یہ آخرت کی کمائی کا وقت دنیا کی فضولیات سے بچا کر رکھیں اور آخرت کے لیے وقف کر دیں۔

☆ جس قدر ہو سکے اس ماہِ مبارک میں صدقہ' خیرات کریں کیونکہ ہر عمل کا اجر بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس ماہ میں غم خواری اور غریبوں کی حاجات پوری کرنے کی رسول اکرم ﷺ نے ترغیب دی ہے۔

☆ یہ مسلمان کی روحانی جسمانی تربیت کا مہینہ ہے' تربیت جتنی اچھی ہوگی عملی میدان میں اتنی ہی کامیابی ملے گی۔ اسی ایک ماہ میں اتنی تربیت ہو جائے کہ پورے سال اس کا رنگ اور اثر دکھائی دے۔

نئے لہجے نئی آوازیں

غزل

عشق کا انتخاب ہیں ہم تم
ایک دوجے کا خواب ہیں ہم تم
عشق اپنی گواہی دیتا ہے
حسن میں لاجواب ہیں ہم تم
استعارے ہیں روز و شب کے ہم
ماہتاب، آفتاب ہیں ہم تم
دنیا والوں کی رائے ہے جیسی
اس قدر سب خراب ہیں ہم تم
ہم سے پھر کیوں سوال کرتے ہو
جب کہ واضح جواب ہیں ہم تم
اپنے احباب کے لیے شوبی
اِک مسلسل عذاب ہیں ہم تم

شاعر: ابراہیم شوبی

غزل

پھر اس دل نے جھیلی بات
سچی بات، پہیلی بات
سارا جنگل جھوم اٹھا
کی تم نے البیلی بات
عشق نے پھر گل پاشی کی
مہکی ایک چنبیلی بات
چندن جیسا روپ مرا
خوشبو جیسی پھیلی بات
کندن جیسا حسن ہوا
لائی صبا رو پہلی بات

جام کے اندر رقص کناں
ساقی، مے، البیلی بات
میرے اس کے بیچ حیا
شازلی یہ ہے ذیلی بات

شاعرہ: شازلی سعید مغل

تجھے ہی دیکھتے ہیں

تیرے پہلو میں اپنی شام دیکھتے ہیں
تاروں کی جھلملاتی رات دیکھتے ہیں
تُو میری دسترس میں نہیں واقف ہوں
پھر بھی تجھے اپنے ساتھ ہر اوقات دیکھتے ہیں
جلتے ہوئے دیے بھی تم بجھا کر چل دیے
گرتے ہیں جب آنسو تو اندھیری رات دیکھتے ہیں
تُو میرے ہاتھوں کی لکیروں میں نہیں تو کیوں؟
بے وجہ اپنی ہتھیلی پر تیرا نام دیکھتے ہیں
تیری جدائی کا اثر ہوا ہے اس قدر
لوگ ڈرتے ہیں جب عشق کا انجام دیکھتے ہیں

شاعرہ: ردا علی

ماں کا دل

جب میں بچی تھی،
تب میرا دل شیر جتنا تھا
مجھے کوئی ڈر اور فکر نہ تھی
لیکن اب!
جب میں سمجھدار ہوں تو......
میرا دل چڑیا جتنا ہو گیا ہے
جب تک سب لوگ گھر نہیں آ جاتے،
تب تک

مجھ پر اک خوف طاری رہتا ہے
کیونکہ اب مجھے انسانوں سے ڈر لگتا ہے
کیا واقعی......
ماں کا دل چڑیا جتنا ہوتا ہے......؟
شاعرہ: جیجل میتلو

نشیمن بنا تو یہ تم نے دل میں
اگر بجلیوں کو خبر لگ گئی تو؟
محبت سے عادل کہاں تک بچو گے
بیماری تمہیں بھی اگر لگ گئی تو؟
شاعر: عادل حسین

دستورِ زمانہ

ہر روز نیا دکھ ہے، ہر روز ہی ہنستی ہوں
دستورِ زمانہ ہے اور سب کو نبھانا ہے
نہ خوشبوؤں کو بھیجے، نہ دے کوئی اُجالا
وہ دل سے مسکرا دے بس اتنا فسانہ ہے
گھاؤ نہیں دکھاتے زخم لگ...... نیا نہ جانے
یاروں نے کہہ دیا جو یہ قصہ...... پرانا ہے
اپنی خوشی و غم سے مشروط کردیا ہے
قسمت کے کٹہرے میں مجرم سا زمانہ ہے
جو لمحے ساتھ بیتے، اب تک رقم ہیں دل پہ
میں مبتلائے دنیا دل اُس کا...... دیوانہ ہے
اب ہاتھ کی لکیروں میں ڈھونڈتی نہیں ہوں
اِس خالی نشیمن میں اس کا ہی ٹھکانہ ہے
شاعرہ: خونہ عرفان

کیوں کسی کا نام لوں

کیوں سوچوں کسی کو کیوں کسی کا نام لوں
توڑ کر ساری حدیں ایک نیا انجام لوں
خود میں سمیٹوں تم کو میں اس قدر
ملا کر لبوں سے چاہت کا جام لوں
ذرا جو پیار سے تم جو دیکھو جانب میری
بھر کر تم کو اپنی بانہوں میں تھام لوں
ملے جو راحت تیری بانہوں میں آکر مجھے
رکھ کر سر تیرے شانوں پر آرام لوں
محبت کی حدوں کو چھو جاؤں میں ایسے
سب سے اعلیٰ حاصل محبت کا مقام لوں
بھول جائے تو دنیا، اتنا میں پیار دوں
تیرے دل میں اک اپنا بلند احترام لوں
تیرے دل میں ہو سدا نینا کے نہ کوئی
میں تجھ سے تیری چاہتیں تمام لوں
شاعرہ: نینا خان

غزل

کسی کی تمہیں گر نظر لگ گئی تو؟
خدا نہ کرے پر اگر لگ گئی تو؟
بہت لاابالی ہے طبیعت تمہاری
کسی کی تمہیں گر فکر لگ گئی تو؟
لہو دینے والے یہ کب سوچتے ہیں
ہوا کو دیے کی خبر لگ گئی تو؟
کسی کی نظر سے بہت پی رہے ہو
یہ عادت اگر تیرے سر لگ گئی تو؟

دعا قبول ہوگئی

دور وادیوں میں اب میرا بسیرا ہے
تم کہتی تھیں نا نہیں مجھ سے ملنا تو واپس نہ آنا
دعا قبول ہوگئی تمہاری
دیکھ لو عید پہ بھی کسی سے مل نہ پاؤں گا
چاہوں بھی تو لوٹ کے نہ آؤں گا
شاعر: شعبان کھوسہ

ڈی خان

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

تماشہ

گلف نیوز کی رپورٹ کے مطابق ٹی وی ہوسٹ نادیہ خان کی 16 سالہ بچی عنیزہ کو دوران دبئی جو امریکہ کی ایک بہت بڑی میوزک میں لے رہی تھی ہراساں کیا گیا... زدوکوب کیا گیا ایسا کہنا ہے نادیہ خان کا... موقع پر پولیس بھی بلائی گئی اور بچی کا معائنہ بھی اسپتال لے جا کر کروایا گیا۔ دبئی کے ڈاکٹرز کے مطابق بچی کے جسم پر زخموں کے نشان پائے گئے ہیں۔ نادیہ جی یقیناً بڑے دکھ اور افسوس کی خبر ہے جب تماشہ بنانے والے خود تماشہ بننے لگیں تو سمجھ جانا چاہیے کہ یہی مکافات عمل ہے۔

شر

پچھلے دنوں سوشل میڈیا پر ٹی وی کی شخصیت

اقرار الحسن کے حوالے سے ایک ویڈیو کلپ وائرل تھی۔ جس میں اقرار کو ہوٹل کے کمرے میں کسی خاتون کے ساتھ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ چند لمحوں کی اس ویڈیو کو دیکھنے کے بعد لوگوں نے اقرار الحسن پر لعن طعن کرنا شروع کردی۔ اتنے برے الزامات لگائے گئے کہ اقرار کو ٹی وی پر آ کر اپنی صفائی دینی پڑی۔ سوشل میڈیا واقعی میں عذاب جان بنتا جا رہا ہے۔ سالوں کی کمائی ہوئی عزت کوئی بھی لمحوں میں چوراہے پر بیچ سکتا ہے پھر ہمارے لوگوں کو فوری طور پر رائے دینے کی بھی بہت جلدی ہوتی ہے۔ خبر سچی ہے یا جھوٹی بنا تحقیق مغلظات کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اب تو صرف یہی دعا ہے کہ اللہ شیطان اور سوشل میڈیا کے شر سے محفوظ رکھے۔

کھیل کھیل میں

باکسر عامر خان نے بختاور بھٹو کو باکسنگ سکھانا شروع کردی ہے۔ انہوں نے مریم نواز کو بھی مشورہ

دیا کہ وہ بھی اُن سے ٹریننگ لے سکتی ہیں۔ تو جناب جا رہے ہیں آپ عامر خان خواتین کو اب ایسے ہی کھیل کھیلنے چاہئیں کیونکہ وہ زمانے تو گئے جب بچیوں کو سینا پرونا' کھانا پکانا' بڑوں کا ادب کرنا اور صبر کرنا سکھایا جاتا تھا۔ ویسے یہ تو حکمران طبقے کی خواتین ہیں انہیں باکسنگ کی کیا ضرورت ان کی رعایا تو خود اپنا سر دیوار پر جلد یا بدیر مار ہی لے گی... اور یوں قصہ تمام ہوگا۔

ہشیار باش

فٹبال کے شائقین کے لیے بڑی خبر ہے جلد پاکستان میں Leisure League منعقد ہونے جا رہی ہے۔ جس میں فٹبال کی دنیا کے بڑے بڑے نام شرکت کر رہے ہیں۔ وہ فٹبالرز جو اب بھی بڑی انٹرنیشنل ٹیموں سے وابستہ ہیں۔ اُن کا پاکستان آنا اور یہاں بچوں کو فٹبال سکھانا ثابت کرتا ہے کہ

پاکستان میں کرکٹ اور ہاکی کے بعد فٹبال بھی بہت مقبول ہے ویسے بھی پاکستان ایک پرامن ملک ہے اور ہمارے بچے بھی کسی سے کم نہیں۔

سیاست دان کے لکشمن نے اُن کی ہندوستانیت نیت پر سوال اٹھا دیا اور کہا کہ وہ لوکل میچز کے لیے کوالیفائی نہیں کرتیں کیونکہ وہ پاکستان کی بہو ہیں۔ اپنے انٹرویو کے دوران وہ برکھا دت کو جواب دیتے ہوئے بار بار آبدیدہ ہوئیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ میں نے کتنے اعزازات بھارت کے لیے جیتے اور آج مجھے یہ سننا پڑ رہا ہے۔ صرف ایک پاکستانی سے شادی کرنے پر مجھے میرے ہی وطن سے دست بردار ہونے کو کہا جا رہا ہے۔ ثانیہ جی ہمارے قائداعظم ہندو ذہنیت سے اچھی طرح واقف تھے اسی لیے تو مسلمانوں کے لیے پاکستان بنایا...... جہاں کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے آرام اور سکون سے رہتے ہیں ہاں

بھارت سے یہ امن و آشتی ہضم نہیں ہوتی اس لیے چوروں کی طرح پیٹ پر وار کرتا رہتا ہے لیکن پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا ہم تو آپ کو بھی کہتے ہیں چلی آیئے پاکستان...... یہاں کوئی آپ کو بھی ہندوستانی نہیں کہے گا۔

☆☆......☆☆

رمضان نشریات

امید تھی کہ اس بار پیمرا رمضان ٹرانسمیشن پر کچھ قدغن ضرور لگائے گا۔ سال میں ایک بار کم از کم ماہ رمضان میں نشریات کو اس بابرکت ماہ کے احترام کے مطابق نشر کیا جائے گا۔ دین کی باتیں وہ لوگ

کریں گے جو دینی معاملات پر عبور رکھتے ہوں گے۔ اور انداز عین اسلامی شعار کے مطابق ہوگا...... ہم اس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ سوائے دنیاوی فائدے کے ہمیں کچھ اور نظر نہیں آتا۔ جس ماہ میں جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور روزے دار اور اللہ کے درمیان حائل پردے ہٹا دیے جاتے ہیں کیا اس عظیم اور بابرکت ماہ کو یوں ٹی وی دیکھتے گزارنا چاہیے؟ یہ سوال اپنے آپ سے ضرور کیجیے گا۔

حیوانیت کی انتہا

ٹینس کی مشہور بھارتی کھلاڑی ثانیہ مرزا کی آنکھوں سے اس وقت آنسو نکل آئے جب بھارتی
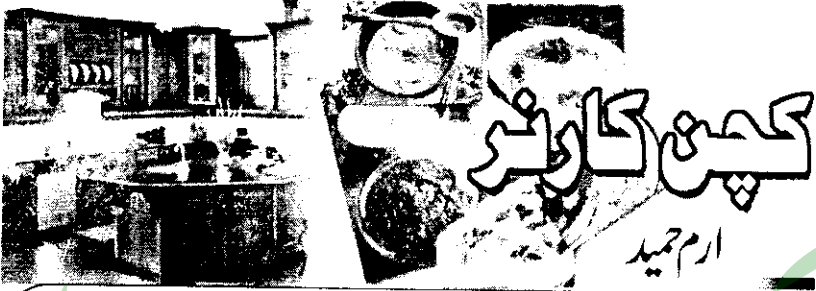
دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

رمضان کا خاص مشروب

اجزا:۔

کھجور	دس عدد
دودھ	ڈھائی پیالی
چینی	حسب ضرورت
بادام	4عدد
پستے	6عدد

ترکیب:

کھجوروں کو اچھی طرح دھو کر پانی میں بھگو دیں اور فریج میں رکھ دیں۔ یا ڈھانپ کر باہر ہی پنکھے کے نیچے رکھ دیں۔ ایک گھنٹے بعد کھجوروں کا پانی پھینک کر ان کو بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کر لیں......

پھر دودھ اور اگر خواہش ہو تو چینی بھی ملا کر اچھی طرح بلینڈ کر لیں۔

اب شربت تیار ہے اس کو جگ میں نکال کر برف کے ساتھ پیش کریں۔ گارنشنگ کے لیے پستے اور بادام ابال کر باریک کاٹ لیں اور شربت میں ملا دیں۔ یہ ایک مکمل غذا ہے اور روزے دار پہلے روزے سے آخری روزے تک چاق و چوبند رہے گا۔

چٹ پٹے پکوڑے

پکوڑے افطار پر نہ ہوں تو میز خالی خالی لگتی ہے آیئے آج آپ کو نہایت لذیذ اور سہل ترکیب بتاتے ہیں۔

اجزا:۔

بیسن	حسب ضرورت
نمک	حسب ضرورت
لچھے دار پیاز	"
آلو	"
بینگن	"

ہری چٹنی کے لیے:

اجزا:۔

ہرا دھنیا
ہری مرچ
زیرا
املی کا گودا
کٹی لال مرچ

ترکیب:

بیسن کو اچھی طرح سے گھول کر اس میں حسب ضرورت نمک ملا لیں......اور ایک طرف رکھ دیں۔

اب چٹنی تیار کریں ہرا دھنیا، ہری مرچ، ثابت زیرا

اور املی کا گودا ان سب کو اچھی طرح سے بلینڈ کرلیں...... تھوڑی سی کٹی لال مرچ بھی شامل کرلیں...... اور اس چٹنی کو بیسن میں ملا دیں۔ اب کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ پیاز کے لچھے' یا آلو یا بینگن میں ڈبو ڈبو کر کڑاہی میں ڈالتے جائیں۔ ہلکے لال ہونے پر اخبار پر نکال کر پھیلا لیں تاکہ تیل اخبار میں جذب ہو جائے۔ اب ان تیار پکوڑوں کو املی یا پودینے کی چٹنی کے ساتھ نوش فرمائیں۔

فروٹ چاٹ

اجزا:۔

چینی	دو چائے کے چمچے
ابلے سفید چنے	دو مٹھی
سیب	3 عدد
کیلے	4 عدد
آم	دو عدد درمیانے سائز کے
چیکو	3 عدد
نمک	ایک چٹکی
چاٹ مصالحہ	آدھا چمچہ

ترکیب:

سیب' آم اور چیکو چوکور چوکور کاٹ لیں...... باؤل میں سب سے پہلے ابلے ہوئے سفید چنے ڈالیں' پھر کٹا ہوا فروٹ اور آخر میں کیلے...... آدھا لیموں نچوڑ لیں اس سے پھل دیر تک سیاہ نہیں پڑتے اور کھانے میں اچھا مزہ دیتے ہیں...... اب چاٹ مصالحہ اور چینی ملا کر فروٹ چاٹ کو تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈا ہونے فریج میں رکھ دیں۔ افطار کے وقت نکال کر اس میں ایک پیالی اورنج جوس شامل کر کے سرو کریں۔

مینگو آئس کریم

اجزا:۔

آم	دو عدد
کریم	ڈیڑھ کپ
کنڈینسڈ ملک	ڈیڑھ کپ
زعفران	آدھا چائے کا چمچہ
نیم گرم دودھ	دو چائے کا چمچہ
آئس کیوبز	حسب ضرورت

ترکیب:

مینگو آئس کریم بنانے کے لیے پہلے آم کو کیوبز میں کاٹ لیں' پھر ان کیوبز کو بلینڈر میں ڈال کر اس کی پیوری بنالیں' ایک کپ میں نیم گرم دودھ اور زعفران ڈال کر مکس کریں اور 5 منٹ کے لیے اسے رکھ دیں۔ اس کے بعد کسی بڑے پیالے میں آئس کیوبز ڈالیں' اس پیالے کے درمیان میں ایک اور پیالہ رکھیں' اس میں کریم ڈال کر اسے بیٹ کریں' پھر اس میں مینگو پیوری' کنڈینسڈ ملک اور زعفران والا دودھ ڈالیں اور تمام چیزوں کو اچھی طرح مکس کریں۔ تیار مکسچر کو کسی ایسی ڈش میں ڈالیں' جسے فریزر میں آسانی سے رکھا جاسکتا ہو' ڈش مین ڈال کر اس کا ڈھکن ڈھک دیں' پھر اس ڈش کو ایک گھنٹے کے لیے فریزر میں رکھ دیں۔ ایک گھنٹے کے بعد اسے فریزر سے نکال کر کسی چمچ کی مدد سے دوبارہ مکس کریں' اس کے اوپر کٹے ہوئے آم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالیں' پھر اس پیالے کو کسی پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر مزید چار گھنٹے کے لیے فریزر میں جمانے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد اسے فریزر سے نکال کر سرو کریں۔

مٹن ویجی ٹیبل کڑاہی

اجزا:۔

بکرے کا گوشت	آدھا کلو
نمک	حسب ضرورت

ٹماٹر — چار عدد
بیسن — آدھی پیالی
ملی جلی سبزیاں — دو پیالی
ثابت رائی — آدھا چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ — ایک کھانے کا چمچہ
سفید زیرہ — ایک چائے کا چمچہ
ہلدی — آدھا چائے کا چمچہ
کڑی پتے — چند پتے
املی کا پیسٹ — تین سے چار کھانے کے چمچے

ترکیب:

ٹماٹر کو بلینڈر کر کے رکھ لیں، گوشت دھو کر اس میں نمک اور ادرک لہسن ڈال کر ہلکی آنچ پر اتنی دیر رکھ دیں کہ گوشت گل جائے۔ تھوڑا سا پانی بھی ملایا جاسکتا ہے۔ پین میں آئل کو گرم رکھیں اور اس میں رائی، زیرہ، کڑی پتے ڈال دیں کڑکڑ کرالیں۔ آنچ ہلکی کر کے بیسن ڈال کر بھونیں۔ پھر اس میں بلینڈ کیے ہوئے ٹماٹر ڈالیں۔ ساتھ میں نمک، لال مرچ اور ہلدی ڈال کر بھونیں۔ چار پانچ منٹ کے بعد اس میں ابلا ہوا گوشت اور کٹی ہوئی سبزیاں ڈال کر ملائیں اور دو سے تین پیالی پانی ڈال دیں۔ درمیانی آنچ پر اتنی دیر پکائیں کہ سبزیاں گل جائیں۔ آخر میں املی کا پیسٹ ڈال کر ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ روٹی اور ابلے ہوئے چاول کے ساتھ پیش کریں۔

تل والی مرغی

اجزا:

چکن — آدھا کلو
سفید تل — ایک کھانے کا چمچ
نمک — حسب ضرورت
ادرک لہسن — ایک کھانے کا چمچہ
لہسن کے جوئے — تین سے چار عدد
پیاز — چار سے چھ عدد
پسی لال مرچ — ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ — ایک کھانے کا چمچہ
سویا ساس — تین کھانے کے چمچ
ٹماٹر — دو عدد
بڑی ہری مرچیں — تین عدد
باریک ہری مرچیں — تین سے چار عدد
لیموں کا رس — ایک کھانے کا چمچہ
کوکنگ آئل — حسب ضرورت

ترکیب:

باریک ہری مرچوں میں بھنا ہوا زیرہ اور لیموں کا رس ملا کر پیس لیں۔ اس میں نمک، ادرک لہسن، لال مرچیں اور سویا ساس ڈال کر ملالیں۔ چکن کو صاف دھو کر تیار کیے گئے مصالحے سے میرینیٹ کرلیں اور فریج میں رکھ دیں۔ تین سے چار پیاز کو باریک چوپ کرلیں اور ایک چوتھائی پیالی کوکنگ آئل میں نرم ہونے تک فرائی کریں۔

اس میں چکن ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور ڈھک کر درمیانی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ جب چکن گلنے پر آجائے تو اس میں موٹی کٹی ہوئی پیاز، ٹماٹر اور لمبائی میں کٹی ہوئی بڑی ہری مرچیں ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ سبزیاں ہلکی سی نرم ہوجائیں تو تل کو ایک کھانے کے چمچ کوکنگ آئل میں فرائی کر کے چکن میں ڈال دیں اور ملا کر چولہے سے اتارلیں۔ لہسن کے جوؤں کو سنہرا فرائی کر کے ڈالیں اور گرم گرم چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔